الواحُ الصّنادِیدُ

حِصّہ اوّل

حضرت امام شاہ ولی اللہ اور اُن کے جوار میں مدفون ممتاز ہستیوں

کی

تابناک زندگی، تاریخ ساز کارنامے اور الواحِ تُربت

عطاءُ الرحمٰن قاسمی

(استاذِ فقہ و حدیث، جامعہ رحیمیہ نئی دہلی)

مولانا آزاد اکیڈمی

تعارف مصنفِ کتاب

نام: عطاء الرحمٰن قاسمی بن شیخ نجیب اللہ مرحوم

تاریخ ولادت بمطابق تعلیمی اسناد: ۵ر شوال المکرم ۱۳۸۲ھ مطابق ۱۹ر فروری ۱۹۶۴ء۔

وطن: موضع کٹہری، ساٹھی، ضلع مغربی چمپارن، (بہار)

ابتدائی تعلیم: قرآن مجید، اردو، ابتدائی فارسی وطن میں اور پھر پرائمری اسکول اور مڈل اسکول ساٹھی۔

ثانوی تعلیم: صرف، نحو، منطق، ابتدائی عربی ادب، فقہ اور اصولِ فقہ مدرسہ ریاض العلوم ساٹھی، چمپارن (بہار)

اعلیٰ تعلیم: سند فضیلت ۱۳۹۶ھ تا ۱۴۰۱ھ دار العلوم دیوبند

تکمیل فتویٰ نویسی ۱۴۰۲ھ دار الافتاء دار العلوم دیوبند

ایم۔اے اردو ۱۹۸۹ء آگرہ یونیورسٹی، آگرہ، یوپی

ریسرچ اسکالرشپ منجانب وزارت تعلیم و ثقافت، حکومتِ ہند

تدریس: جامعہ رحیمیہ مرکز شاہ ولی اللہ محدث دہلوی، مہندیان، میر درد روڈ، نئی دہلی ۲۔ ۱۴۰۳ھ سے تاحال۔

عوامی درس قرآن مجید: روزانہ بعد نمازِ فجر اونچی مسجد گلی سُرخ پوشان چوڑیوالان باہتمام چوڑیوالان ویلفیئر سوسائٹی، دہلی۔

تصانیف: دنیائے اسلام کی چند عظیم شخصیتیں (اس پر دلی اردو اکاڈمی کا ادبی انعام) الواح الصنادید حصہ اوّل، الواح الصنادید حصہ دوم، تاریخ چمپارن (زیر طبع) شاہ ولی اللہ کا اقتصادی نظریہ (زیر طبع)

علمی وسماجی اداروں و تنظیموں سے وابستگی: جنرل سکریٹری مولانا آزاد اکیڈمی ۱۹۳ گلی گڑھیا بازار مٹیا محل۔ جامع مسجد دہلی ۶

جنرل سکریٹری آل انڈیا تنظیم مفتیانِ ملت دیوبند۔

ممبر آل انڈیا مسلم مجلس مشاورت

الواح الصنادید

حصہ اوّل

حضرت امام شاہ ولی اللہ اور اُن کے جوار میں مدفون ممتاز ہستیوں

کی

تابناک زندگی تاریخ ساز کارنامے اور الواحِ تربت

عطاء الرحمٰن قاسمی

(استاذ فقہ و حدیث، جامعہ رحیمیہ نئی دہلی)

مولانا آزاد اکیڈمی

نام کتاب	الواح الصنادید (حصّہ اوّل)
مصنف	مولانا مفتی عطاء الرحمن قاسمی چمپارنی
سنہ طباعت	۱۹۹۲ء — ۱۴۱۲ھ
صفحات	۴۰۰
قیمت	سو روپے ۱۰۰/=
تعداد	ایک ہزار
کتابت	اختر زماں
سرِ ورق	خلیق احمد ٹونکی
مطبوعہ	نازیہ پرنٹنگ پریس، رودگراں، لال کنواں، دہلی ۶
ناشر	مولانا آزاد اکیڈمی، نئی دہلی

ملنے کا ذیلی پتہ

مفتی عطاء الرحمن قاسمی جنرل سکریٹری مولانا آزاد اکیڈمی، ۴۳-ابو الفضل انکلیو
اوکھلا، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

انتساب

شیخِ طریقت، امیرِ شریعت حضرت مولانا منت اللہ رحمانی مرحوم
کے نام جو..................

- آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ کے بانی۔
- اِمارت شرعیہ بہار و اڑیسہ کی موجودہ تعمیر و ترقی کے روح رواں۔
- خانقاہ رحمانی مونگیر کے سجّادہ نشیں۔

اور

- دارالعلوم دیوبند کے رکن شوریٰ تھے۔

فہرست عناوین

پیش لفظ

از

ایمی ری لٹ پروفیسر خواجہ احمد فاروقی، دہلی یونیورسٹی

اٹھارہویں صدی کے وسط سے ہندوستان میں زبردست انقلاب رونما ہو رہا تھا۔ جنگ پلاسی ۱۷۵۷ء کے بعد انگریز جن کے جلو میں انگلستان کا صنعتی انقلاب تھا۔ رفتہ رفتہ اپنے قدم مضبوطی کے ساتھ جما رہے تھے۔ ۱۸۰۳ء میں لارڈ لیک کی فوجیں فاتحانہ پرچم کے ساتھ دلّی تک پہنچ گئیں اور شاہ عالم بالکل انگریزوں کے زیر اثر آگیا اور اس کی حکومت از دہلی تا پالم رہ گئی۔ پنجاب اور سرحد کے وہ علاقے جو ہندوستان کی جغرافیائی سیاست میں اور فوجی اعتبار سے سب سے زیادہ اہم تھے وہ رفتہ رفتہ مغلوں کے ہاتھوں سے نکل گئے۔

اٹھارہویں صدی میں حضرت شاہ ولی اللہؒ (۱۷۰۲-۱۷۶۱ء) نے ایک بہتر معاشرہ تیار کرنے کے لئے اپنی اہتم بالشان تحریک شروع کی۔ یہ تحریک مذہبی بھی تھی، سیاسی بھی، اقتصادی بھی اور ادبی بھی۔ شاہ صاحبؒ نے قرآن شریف کا جواب تک صرف جزدانوں میں بند تھا، فارسی میں ترجمہ کیا۔ قرآن کی یہ دعوتِ عام ایسا انقلابی اقدام تھا کہ اس سے حکومت کے ایوان

میں زلزلہ آگیا اور اسی کے اکسانے پر جاہل عوام اور بزخود غلط مولوی ننگی تلواریں لے کر شاہ صاحب پر لوٹ پڑے۔ ان کو اس سلسلہ میں وہی تکلیفیں اٹھانا پڑیں جو جان وکلف اور اس کے ساتھیوں کو انجیل کا ترجمہ کرنے پر اٹھانا پڑی تھیں۔ سیرالمتاخرین میں لکھا ہے کہ نجف خان نے شاہ ولی اللہ کے پہنچے اتروا دیئے تھے تاکہ وہ کوئی مضمون یا کتاب نہ لکھ سکیں۔ اسی نے ان کے دونوں بیٹوں شاہ عبدالعزیز اور شاہ رفیع الدین کو اپنی قلمرو سے نکلوا دیا تھا۔ لیکن ان سختیوں سے یہ تحریک دب نہ سکی بلکہ رفتہ رفتہ ہگلی سے پشاور تک اور پٹنہ سے کرنول تک پھیل گئی۔

حضرت شاہ ولی اللہ کے انتقال کے بعد شاہ عبدالعزیز (۱۸۲۳-۱۷۴۶) نے اس تحریک کو زبان وقلم کی مدد سے آگے بڑھایا لیکن ان کی روزافزوں مقبولیت اور اصلاحانہ سرگرمیوں کو دیکھ کر دشمنوں نے ان پر عرصہ حیات تنگ کر دیا۔ اوارہ گرد لوگوں نے آوازے کسے۔ مکان ضبط کر لیا گیا۔ دہلی سے نکال دیا گیا۔ دو دفعہ زہر دینے کی کوشش کی گئی۔ یہ بھی روایت ہے کہ ان کے بدن پر چھپکلی کا ابٹن مل دیا گیا تھا جس سے برص ہو گیا لیکن وہ آخر وقت تک اپنے انقلابی خیالات کی اشاعت سے باز نہیں آئے۔

۱۸۰۳ء میں انگریزوں نے دہلی پر تسلط جما لیا تھا۔ وہ دہلی جس کے متعلق شاہ عبدالعزیز نے لکھا تھا کہ "دوسرے شہر اور بلاد کنیزیں اور لونڈیاں ہیں اور دہلی ملکہ اور رانی۔ یہ موتی ہے اور باقی سب کے سب سیپیاں" دہلی مٹنے پر بھی ہندوستان کا قلب وجگر اور عظیم الشان تہذیب کی نشانی تھی۔ اس کے علماء کی راست روی۔ یہ برداشت نہیں کر سکتی تھی کہ دہلی پر انگریزوں کا تسلط ہو۔ چنانچہ ۱۸۰۳ء میں شاہ عبدالعزیز نے یہ فتویٰ دیا کہ پورا برطانوی ہند دارالحرب ہے اور انگریزوں سے لڑنا ہمارا فرض عین ہے۔ یہ فتویٰ جہاد

انھوں نے نہ مرہٹوں کے خلاف دیا اور نہ سکھوں کے۔ انگریزوں کے خلاف دیا اور انھوں نے ۱۸۵۰ء سے ۱۸۶۳ء تک بیس دفعہ ۶۰ ہزار لشکر کی مدد سے مجاہدین کا مقابلہ کیا لیکن یہ تحریک کچلی نہیں جا سکی بالکل آخر زمانے میں اس تحریک کی نمایندگی حضرت مولانا ابوالکلام آزاد نے کی جن کا انتقال ۱۹۵۸ء میں ہوا اور جن کے کمالات کا ابھی تک احاطہ نہیں ہو سکا ہے۔ بقول علامہ اقبال ؎

چوں رخت خویش بربستم ازیں خاک
ہمہ گفتند "باما آشنا بود"
ولیکن کس ندانست ایں مسافر
چہ گفت و باکہ گفت و از کجا بود

جس روز مولانا آزاد کا انتقال ہوا ہے میں ان کے در دولت پر موجود تھا۔ وزیر اعظم پنڈت نہرو بھی تشریف فرما تھے اور گفتگو یہ ہو رہی کہ مولانا آزاد کو کہاں دفن کیا جائے۔ میں نے عرض کیا مولانا جید عالم اور عظیم المرتبت مفسر قرآن تھے۔ ان کو حضرت شاہ ولی اللہ اور شاہ عبدالعزیز محدثین کے قبرستان مہندیان میں دفن کرنا چاہیئے۔ پنڈت جی نے کہا وہ ہندوستان کے بڑے ممتاز لیڈر تھے ان کو جامع مسجد شاہ جہانی کے قریب جو مرجع خلائق ہے دفن کرنا چاہیے۔ بالآخر پنڈت جی ہی کی رائے پر عمل کیا گیا۔

مولانا عطاء الرحمن صاحب میرے پاس آئے اور اس کتاب الواح الصنادید پر پیش لفظ لکھنے کی فرمائش کی تو میں نے عذر کیا اور کہا آپ میرے متعلق غلط فہمی میں گرفتار ہیں۔ صرف نااہلی میں میرا پایہ بلند اور ارجمند ہے۔ میں ان بزرگوں کی پاؤں کی دھول بھی نہیں وہ نہیں مانتے پھر میں نے ان کے سامنے یہ شرط رکھی کہ مولانا آزاد کے معاملہ میں مجھے کامیابی نہیں ہوئی لیکن اپنے

معاملہ کا مجھے اختیار ہے وعدہ کیجئے کہ اگر دہلی میں میرا وقت آجائے تو آپ مجھے مہندیان میں دفن کریں گے۔ اس رائے کو انھوں نے مان لیا اور یہ میرے لئے بڑا اعزاز واکرام ہے۔

مہندیوں کا قبرستان ویرانہ نہیں ہے یہاں صدیوں کی دولت گڑی ہوئی ہے اور ایسے ایسے اہل کمال وہاں جمع ہیں کہ آسمان کو بھی اس زمین پر رشک آتا ہوگا۔ مولانا عطاء الرحمان قاسمی نے چیونٹی کے منھ سے دانے جمع کرکے خرمن تیار کیا ہے اور ان تمام بزرگوں پر سوانحی نوٹ لکھے ہیں جو اس قبرستان میں آسودہ ہیں۔ اس تصنیف کی اہمیت یہ ہے کہ اس سے شاہ ولی اللہ اور ان کے خاندان ہی سے واقفیت نہیں ہوتی بلکہ اس دور کی فکری تاریخ بھی ہمارے سامنے آجاتی ہے جس میں سب سے اہم کردار حضرت شاہ ولی اللہ، ان کے مریدین اور ان کے مدرسہ رحیمیہ کا ہے۔

مولانا عطاء الرحمن قاسمی استاذ فقہ وحدیث جامعہ رحیمیہ دہلی سے ذرا دیر کو مولانا نیاز الدین مالک یک ڈپو انجمن ترقی اردو کی دکان پر ملاقات ہوئی اور ایسا محسوس ہوا کہ میری روح ان کی قدیم شناسا ہے اور مجھے ان کی صحبت میں حقِ دیرینہ حاصل ہے۔ واقعئی دل کا معاملہ کبھی کبھی ایک نیم نگاہِ محبت سے بھی ہو جاتا ہے۔ ان کی کتاب "دنیائے اسلام کی چند عظیم شخصیتیں" پڑھی تو اور زیادہ قربت محسوس ہوئی اس لئے کہ حدیثِ دیگراں ہی سے سرِ دلبراں تک پہنچا جاسکتا ہے۔

خدا سے دعا ہے کہ اس تصنیف کو مقبولیت حاصل ہو اور اس کے مصنّف کو اجر عطا ہو۔

خواجہ احمد فاروقی

مقدمہ

از

مولانا سید محمد ولی رحمانی صاحب استاذ حدیث جامعہ رحمانی۔ خانقاہ مونگیر

محبت اور نفرت نے برابر خطرناک مسائل کھڑے کئے ہیں۔

محبت ہے، تو خرابیاں بھی اچھائیوں کے زمرہ میں سمیٹ لیجاتی ہیں اور خامیوں کی خوبصورت سی تاویل کر لیجاتی ہے ـــــ اور اگر نفرت کا پردہ پڑ گیا تو خیر بھی باندازۂ شر سامنا کرتا نظر آتا ہے اور خوشگوار حقیقتیں بھی ناگوار لگنے لگتی ہیں ـــ!

آج مجھے بھی محبت کے انھیں خطرناک اثرات کو بھگتنا پڑ رہا ہے ـــــ یہ تحریر جسے آپ پڑھ رہے ہیں، بڑی مخلصانہ فرمائش کا نتیجہ ہے اور محبت آمیز مطالبوں کی رسید، لکھانے والے نے یہ نہیں سوچا کہ میں نے کچھ لکھا تو میری کج مج بیانی کا ایک اور ثبوت فراہم ہوجائیگا۔ ان کی نظرِ محبت اور نگہہ التفات نے میری ژولیدہ نثری کو اندازِ بیان کی ندرت کا درجہ دیدیا۔

مولانا عطاء الرحمن قاسمی نے فرمائش کردی کہ ان کی تازہ کتاب "الواح الصنادید" کتابت کے مرحلے سے گزر رہی ہے، میں پڑھ لوں اور مقدمہ لکھ دوں، مقدمہ بازی نہ میرا پیشہ ہے نہ میرا مزاج ـــــ اس کتاب پر کسی اہم شخصیت سے کچھ لکھوانا چاہیئے تھا یا اس پر کچھ لکھنے کے سب سے زیادہ حقدار جناب علی محمد شیر میوات ہو سکتے ہیں، جن کے دم سے صنادید اسلام (جو درگاہ ولی اللہ میں مدفون ہیں) کی

تربت کے ساتھ لوح تربت بھی محفوظ ہے، جنھوں نے قبرستانِ مہندیان (درگاہ شاہ ولی اللہ) کی حفاظت کے لئے درخت کی چھالوں سے لے کر پولیس کی لاٹھیاں تک کھائیں اور اصلی جعلی ۳۶ ۴ مقدمات سے نبٹے !! حق تو یہ ہے کہ یہ مرد مجاہد اگر اس کتاب پر کچھ لکھتا تو اس کا آہنگ ہی کچھ اور ہوتا، ان کے سادہ جملوں میں جو تاثیر ہوتی، فطری حسن کا جو نکھار ہوتا، درد کی ٹیھک اور ٹیس کی لکیر ہوتی، اس کا جواب کہاں سے لایا جا سکتا ہے! جس شخص کے جذبہ کی حدت، اخلاص کی حرارت عمل کی تمازت اور بے چارگی کی تڑپ اور کرب کو مخالفت کی ہواؤں نے تیز کیا ہو جس نے امیدوں سے کٹ کٹا کر، آرزوؤں سے منہ موڑ کر لانبی جنگ لڑی ہو، گھپ اندھیروں میں چراغ عقیدت لیکر قدم بڑھائے ہوں ـــــــ پھر رک رک کر، ٹھہر ٹھہر کر منزل نے جس کے قدم چومے ہوں۔ اس کی باتوں میں کتنا دم ہوگا؟

مگر مولانا عطاء الرحمٰن کی زبانِ محبت نے فرمائش کر دی کہ مقدمہ لکھدوں۔ چند لمحے انکار اور اصرار میں گزرے، میں نے آمادگی ظاہر کر دی۔ یقین تھا، مولانا کا یہ جذبہ جلد سرد پڑ جائے گا۔ مگر میرا یہ اندازہ غلط نکلا۔ مولانا کا اصرار بڑھا، تقاضہ میں سنجیدگی آتی گئی اور جب مجھے ناراضگی کے خطرات محسوس ہونے لگے تو میں نے عافیت اسی میں محسوس کی کہ "الواح الصنادید" پر کچھ لکھدوں۔

ہندوستان میں سلسلۂ حدیث کا مرجع اور علماء اسلام کا جلی عنوان حضرت امام شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ جہاں محو خواب ہیں وہ خطہ "قبرستان مہندیان" کہلاتا ہے۔ مجھے یاد نہیں پہلے پہل کب اس شہر خموشاں سے میرا گزر ہوا تھا، شاید ۱۹۵۹ء میں۔ مگر اتنا نقش ضرور ہے کہ پہلی مرتبہ جب میں نے حضرت شاہ صاحب کے مزار پر حاضری دی تھی جھاڑ جھنکھاڑ بہت تھے، حضرت شاہ صاحب اور بہت سے دوسرے بزرگوں کی قبریں تو ویسی ہی تھیں جیسی آج ہیں۔ مگر اس وقت "برمزار ما غریباں نہ چراغے نہ گلے"

والا معاملہ تھا، گندگی، بے توجہی اور ویرانہ کا احساس ہوتا تھا۔ درگاہ ولی اللہی کو اب بھی چراغ اور گل سے واسطہ نہیں ہے، نہ اس کی زیبائش کے لئے چادر کا اہتمام ہوتا ہے، نہ قوال طبلہ کی تھاپ اور ہارمونیم کے ساز پر آواز لگاتا نظر آتا ہے، مگر یہ سب نہ ہوتے ہوئے بھی اب یہ خطہ خاموش وادی گل پوش محسوس ہوتا ہے۔ جہاں صفائی ستھرائی ہے، پھول پھول کے پودے ہیں، سلیقہ اور ترتیب ہے، قرآن پاک کی تلاوت ہے، حدیث کا درس ہے اور قبرستان میں بھی زندگی کا ماحول ہے!

آپ قبرستان مہندیان جائیے تو گیٹ میں داخل ہوتے ہی مکی مسجد (چتائی مسجد) پر نظر پڑیگی جس کے سامنے دوسرے بہت سے اولیاء کرامؒ اور علماء عصر کے علاوہ حضرت شیخ عبدالعزیز شکر بار کا مزار ہے۔ مکی مسجد سے آگے چلیئے تو شاہ ولی اللہ ہال کی زیر تعمیر عمارت ملے گی۔ اس کے بعد "جامعہ رحیمیہ" پر نظر پڑے گی، ایسا لگے گا جیسے جامعہ رحیمیہ کی صاف ستھری عمارت مسکرا کے آپ کا استقبال کرنے کو تیار ہے۔ ذرا اندر جائیے تو "باب الولی" ہے جس پر جلی حرفوں میں یہ شعر لکھا ہے ؎

ادب اے زائرِ حق آشیانہ　　ولی اللہ کا ہے آستانہ

جامعہ رحیمیہ کا دفتر اہتمام، اس کے پیچھے کتب خانہ، سامنے وضو خانہ بیچ میں "باب الولی" —— اور اس کے بعد اس قبرستان کی زندہ اور جاندار شخصیت جناب علی محمد شیر میوات صاحب کا دفتر ہے۔ جسے لوگ "متولی صاحب کا کمرہ" کہتے ہیں، مقابل میں مہمان خانہ ہے، پھر مدرسین اور طلبہ کے کمرے، آگے کچھ قبریں، اساتذہ کی آرام گاہیں —— ذرا آگے بڑھئے کچھ قبروں کو چھوڑ کر، درگاہ مسجد ہے، مسجد کے پہلو میں اوپر "الواح الصنادید" کے مصنف مولانا عطاء الرحمن قاسمی کی درسگاہ اور فرودگاہ ہے اور مسجد کے بعد تاریخ اسلام کی وہ عظیم شخصیت اپنے بعض اعزہ اور نامور علماء کے ساتھ آسودۂ خواب ہے جن کی وجہ سے اس خطہ زمین کو ہندوستان کا "جنت البقیع" کہا جائے تو شاید غلط نہ ہو —— نہ جانے کیسے

کیسے لوگ پچھلی صدیوں میں یہاں لٹائے گئے ہیں اور اس زمین نے علم و فکر، قلب و نظر کے کتنے آسمانوں کو اپنے اندر سمو رکھا ہے!

کچھ پکی یا ادھ پکی قبروں کو چھوڑ کر یہاں برابر کچی قبریں ہی رہی ہیں، یہ جو اونچی نیچی زمین نظر آتی ہے، کل کی قبروں کے مٹے مٹے نقوش ہیں۔ یہاں چلتے چلتے دامنِ دل کھینچتا ہے اور قدم ٹھہر ٹھہر سے جاتے ہیں۔ دماغ میں یہ سوال گونجتا ہے، نہ جانے کون یہاں آرام کر رہا ہے؟ ـــــ بہت ساری قبریں مٹ گئیں، ناموں کے مزار ہوں یا گمناموں کی آرام گاہ ـــــ اب وہ سب صفت گمنامی میں ہیں۔ کوئی دل کی بستی بسا کر اس خاموش آبادی میں قدم رکھے تو خدا جانے اسے کیا کیا مشاہدہ ہو ـــــ کچھ لوگ اتنے مطمئن ہوں گے جیسے پڑھ رہے ہوں:

موت اک زندگی کا وقفہ ہے　　　یعنی آگے چلیں گے دم لیکر

اور کچھ لوگ اس درجہ بے نیاز کہ انھیں کسی طرف سے فاتحہ، کسی سے ایصال ثواب کی ضرورت نہیں ہو ـــــ آواز آ رہی ہو گی:

طمعِ فاتحہ از خلق نداریم نیاز　　　عشق من از پس من فاتحہ خوانم باقیست

عشق الٰہی اور حب نبوی ہی ان کا سرمایہ ہے اور رحمت و مغفرت کا پُر اعتماد سہارا ـــــ وہ قبریں بے نام سہی، قبر والے گمنام سہی، دین کے لئے ان کی طلب اور تڑپ، عشق و محبت کا سوز و گداز، شفاعت نبوی کا آسرا، جنت کے شوق اور جہنم کے خوف سے بے نیاز دیدار الٰہی کی آرزو ہی ان کے لئے سرمایۂ حیات اور توشۂ آخرت ہے اور لگتا ہے اسی دیدار کے لئے انھوں نے جان دیدی:

متاعِ وصل جاناں بس گراں است　　　گر این سودا بجاں بودے چہ بودے

جنھیں مٹی نے اپنے اندر ڈھانپ لیا، وہ تو علم الٰہی کی امانت ہیں ـــــ پھر بھی

یہ ایمان کا فیضان اور اسلام کا کرم ہے کہ قبلہ رو ہو کر اطاعت و عبودیت کا فرض ادا کرنے والی ملت ان صالحین کو برابر سلام[1] بھیجتی ہے اور زندے ہوں یا مُردے[2] سبھوں کو اپنی دعاء میں یاد رکھتی ہے۔

یہ حلقہ جو اب درگاہ ولی اللہ یا قبرستان مہندیان کہلاتا ہے۔ کب سے قبرستان ہے؟ اس کی تاریخ سفینوں میں نہیں، سینوں میں رہی ہے۔ کوئی نہیں جانتا کہ اس آبادی میں پہلے پہل کس کی قبر بنی اور یہ خطہ کب قبرستان بن گیا۔ اب کوئی نہیں بتا سکتا کہ خاک میں کون کون سی نامی گرامی ہستیاں پنہاں ہو چکی ہیں۔ بزرگوں میں جو سب سے پرانا نام آتا ہے وہ حضرت شیخ عبدالعزیز شکر بار[3] رحمۃ اللہ علیہ کا ہے۔ ان کی قبر مکی مسجد کے سامنے ہے جو آزادی سے پہلے جناتی مسجد کے نام سے جانی جاتی تھی۔ انھیں کے آس پاس کہیں حضرت شیخ عبدالغنی بیا بانی اور حضرت شاہ رکن الدین رحمۃ اللہ علیہ کی قبریں بھی تھیں۔ اس مسجد سے تقریباً کوئی دو سو قدم آگے دکھن جانب درگاہ مسجد ہے جسے حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب نے تعمیر کرایا تھا۔ اسے حضرت شاہ صاحب کی گھریلو مسجد کہنا چاہیئے، یہ مسجد سہ دری مگر بہت چھوٹی سی تھی۔ ایک صف میں دس گیارہ افراد نماز پڑھ سکتے تھے اور اندر صرف ایک صف ہوتی تھی، سامنے صحن تھا۔ —— متولی صاحب جناب علی محمد شیر میواتی نے جہاں دوسری عمارتیں بنوائیں اس مسجد کو بھی بنوایا۔ درگاہ مسجد پہلے کے مقابلے کافی

---

[1] "السلام علینا و علی عباد اللہ الصالحین" تحیات کا حصہ ہے، جسے ہر نمازی قاعدہ میں پڑھتا ہے۔

[2] "الاحیاء منھم والاموات" کی طرف اشارہ ہے۔

[3] بعض حضرات کو اشتباہ ہو گیا کہ حضرت شکر بار کا مزار مہرولی میں ہے، یہ بات ذہنوں میں کہاں سے در آئی، نہیں کہا جا سکتا، تفصیل اسی کتاب میں پڑھ لیجئے۔

کشادہ ہوگئی ہے۔ اب جہاں مسجد کے ہال کی پوربی دیوار ہے وہاں پہلے مسجد کا صحن ختم ہوتا تھا ــــ مسجد پر یہ کتبہ، سفید پتھر پر سیاہ حرفوں سے مزین، آویزاں ہے:

خدا سے مانگ جو کچھ مانگتا ہے اے اکبر　　یہی وہ در ہے جہاں آبرو نہیں جاتی

توسیع و تعمیر مسجد درگاہ حجۃ الاسلام حضرت امام شاہ ولی اللہ محدث دہلوی

یکم رمضان المبارک ۱۳۹۹ھ مطابق ۲۶ جولائی ۱۹۷۹ء جمعرات

علی محمد شیر میوات متولی درگاہ قبرستان

یہ مسجد جامعہ رحیمیہ کے اساتذہ اور طلبہ سے آباد ہے اور ابھی درسگاہ کے مصرف میں بھی استعمال کی جاتی ہے۔ اسی کے برابر حضرت امام شاہ ولی اللہؒ اور ان کے نامور فرزندوں کے مزارات ہیں، یہ پورا حلقہ کئی ایکڑ زمین پر مشتمل ہے۔ شیر میوات صاحب نے چہار دیواری دیکر اس کی نئی حدوں کو متعین کر دیا ہے اور اب یہی حلقہ قبرستان مہندیان کہلاتا ہے یا درگاہ شاہ ولی اللہ

مہندیان سے ذہن اس طرف جاتا ہے کہ کبھی یہاں مہندیوں کی باڑھیں رہی ہوں گی جن کی پتّوں سے دہشت حنائی کی رنگینی قائم رہتی ہوگی۔ لیکن اس مہندیان کا تعلق سل پر گھسنے والی مہندی سے نہیں ہے۔ ــــ ماضی میں مالداروں نے کبھی اپنی ضرورتوں کی تکمیل کے جذبہ کے تحت اور کبھی دین سے وابستگی کے اظہار کے لئے بہت ساری حرکتیں کی ہیں۔ ان میں ایک تعزیہ بھی ہے۔ یہ تعزیئے عام طور پر حضرت سیدنا حسین شہید رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب ہیں۔ شہادت کے بعد حضرت حسین رضؓ کے سر مبارک کو نیزہ کی اَنی پر گھمایا گیا تھا اور شہید کے سر کی توہین شقاوت قلبوں نے کی تھی جس میں تسکین نفس کا جذبہ تھا اور اظہار فتح کا جنون بھی!

لشکر یزید کی اس بدبختانہ روایت کو حضرت حسین شہید کے نام لیوا بڑے مخلصانہ انداز میں ہر سال تازہ کرتے ہیں۔ وہ نہیں غور کرتے کہ حسین شہید کی روایت اسلام کی خاطر

سر کٹانے کی ہے سر بچانے کی نہیں ـــــ وہ نہیں سمجھتے کہ سر کی علامت (تعزیہ) کے پیچھے بھالے، بلم، تلوار، گڑاسے کے ساتھ انسانوں کا جمگھٹ لشکر یزید کے جوش جنوں کی یاد تازہ کر سکتا ہے۔ حضرت حسین مظلوم کی بے سروسامانی اور شہ مشرقین کی بیچارگی کو ہمارے اندر باقی نہیں رکھ سکتا ـــــ وہ نہیں جانتے کہ اس "حرکت" میں مسلمانوں کے ہاتھوں شہید ہونے والے سید الشہدار کا کہیں سے کوئی پرتو نہیں ہے۔ تعزیہ اور اس کے جلوس میں حضرت حسین شہید کی عظمت کی جھلک، حق کے لئے قربانی کا جذبہ عزم کی تاریخی مثال، بے چارگی کا انداز اور بھری دنیا میں تنہائی کے احساس کا کہیں دور تک پتہ نہیں چلتا۔!!

روایتی مذہب نے علم وفکر کے تمام سوتوں کو بند کر دیا ہے ـــــ رواج و مزاج نے درایت وحقیقت کو پس پشت ڈال دیا ہے!

ستم یہ ہے کہ بڑے تعزیئے تو حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے نام نامی کی طرف منسوب ہوتے رہے۔ یاروں نے تعزیہ سازی کو "دین کا کام" سمجھ لیا۔ اور مالداروں نے عقیدت کے اظہار کے لئے چھوٹے چھوٹے تعزیئے بزرگوں کے نام پر بھی نکالنا شروع کر دیئے۔ اس چھوٹے تعزیہ کو دہلی میں "مہندی" کہا جاتا تھا ـــــ

کوئی نواب صاحب تھے انھوں نے حضرت شیخ عبد القادر جیلانی کے نام پر بھی "مہندی" بنوانے کی طرح ڈالی۔ چاند کی گیارہ تاریخ کو ہر ماہ مہندی بنائی جاتی، اس کی زیارت کرائی جاتی، منتیں مانگی جاتیں، اس کے گرد چڑھاوے سجائے جاتے اور پھر اس "مہندی" (چھوٹے تعزیہ) کو دہلی گیٹ کے آس پاس محلّوں میں گھمایا جاتا، مہندی کے پیچھے نواب صاحب عقیدت کے چہرے اور ارادت کے قدموں ساتھ چلتے اور "مسلم حکومت" کی "رعایا" ان کے ساتھ ہوتی۔ یہ بھی عبرت کی بات ہے کہ تاریخ ساز ملّت جب تاریخ کا صفحہ بننے لگتی ہے تو اس کی توانائی

ایسی ہی "حرکتوں" میں صرف ہوتی ہے!

نواب صاحب نے جب اس خود ساختہ دینی کام کو مزید استحکام بخشنا چاہا تو جہاں مہندی بنائی جاتی تھی وہاں ایک عمارت بنا ڈالی، لق و دق، پانچ برجوں والی۔ سامنے باغ تھا۔ یہ عمارت "مہندیان" کہلائی۔ آجکل پنت ہاسپٹل، جے پی ہسپتال اور مولانا آزاد میڈیکل کالج کا جہاں مردہ خانہ (MORTURY) ہے۔ اس سے کچھ ہی پورب یہ عمارت تھی۔ وقت گزرتا رہا، نواب صاحب چل بسے عمارت کے جلال نے بوسیدگی کی شکل اپنالی اور دیکھتے دیکھتے ٹکڑوں ٹکڑوں میں بٹ گئی۔ عام لوگ اس میں آباد ہو گئے وہ لوگ جن کے آبا و اجداد "خواص" میں شمار کئے جاتے تھے اس میں اقامت پذیر ہو گئے عمارت کا مصرف بدل گیا مگر نام باقی رہ گیا۔ محلہ مہندیان اسی عمارت اور اردگرد کے مکانوں پر مشتمل تھا "باغ مہندیان" عمارت کا سامنے والا حصہ تھا۔ اسی سرزمین پر حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے مسجد بنوائی، مدرسہ آباد کیا اور اپنی خانقاہ قائم کر کے اصلاح باطن کا کارنامہ انجام دیا۔

اب نہ مہندیان کی پر وقار عمارت ہے۔ نہ پاس کے مکانات، نہ شیخ کی مسجد و خانقاہ ہے نہ مدرسہ کا وجود ــــــ عدم کا ہلکا سا پردہ وجود کی ٹھوس عمارتوں پر بھاری پڑ چکا ہے۔ اور اب یہاں مولانا آزاد میڈیکل کالج کی عمارتیں کھڑی ہیں مگر مہندیان کا نام زندہ ہے! اور یہ نام درگاہ شاہ ولی اللہ کے ساتھ ایسا چپکا ہے کہ زندہ جاوید ہو گیا۔ ورنہ جہاں حضرت شاہ صاحبؒ کا مزار ہے وہ محلہ کشک نرور NARWAR یا شیخ نرور کا چھتہ کہلاتا تھا۔

صحیح ہے، اگر بے بنیاد چیز بھی بزرگوں سے جڑ جاتی ہے تو اس میں توانائی اور زندگی آجاتی ہے۔ مہندی کی رسم حضرت شیخ جیلانیؒ سے وابستہ کی گئی تو چل پڑی اور آکاس بیلی رسم کو بھی جڑ مل گئی اور یہ نام جب حضرت شاہ صاحب سے جڑ گیا تو اس کی زندگی بہت لانبی ہو گئی۔

حضرت شاہ ولی اللہ اور ان کے والد بزرگوار حضرت شاہ عبد الرحیم (رحمہا اللہ تعالیٰ) کی اصل جگہ یہی چھتہ شیخ نرور ہے۔ اسی محلہ میں وہ آباد تھے۔ زمانہ کے رواج کے مطابق مکان کے قریب ہی ان بزرگوں کی آرام گاہ بنی ——— چھتہ شیخ نرور یا محلہ کشک نرور اصل میں چھتہ شیخ انور کا بگاڑ ہے۔ بڑے مکان والوں کے نام پر محلہ کا نام کوئی نئی چیز نہیں ہے۔ چھتہ (یا چھت) اور کٹرہ کے ساتھ محلوں کے نام دہلی اور بہت سے شہروں میں موجود ہیں۔ جامع شاہجہانی کے دکھن سمت میں چھتہ شیخ منگلواب بھی موجود ہے کٹرہ شیخ چاند، کٹرہ شیخ ہدو، چھتہ ابو تراب جیسے نام ابھی زندہ ہیں۔ ——— جب پائنچہ بول چال کی زبان میں "بگیا" بن سکتا ہے۔ میر غیاث چک کی جگہ مرغیا چک زبان زد ہو سکتا ہے، امیر البحر کی جگہ "ایڈمیرل" لے سکتا ہے تو چھتہ شیخ انور کو چھتہ شیخ نرور بنتے کتنی دیر لگے گی۔

دہلی کچھ اس طرح بار بار مٹی اور بنی ہے کہ محلوں کے نام تو بدلے ہی، محلوں کا جائے وقوع بھی ادل بدل سا گیا ہے۔ محلہ مہندیان کا جائے وقوع بھی اسی طرح بدلا اور جب وقت بہت آگے بڑھ گیا تو ذہنوں میں یہ بات آئی کہ چھتہ شیخ نرور اور محلہ مہندیان ایک ہی جگہ کے دو نام ہیں یا محلہ مہندیان کا ایک حصہ، چھتہ شیخ نرور بھی ہے مگر مٹے مٹے نقوش کی ادھوری کہانیاں بتاتی ہیں کہ پہلے دونوں الگ محلّے تھے۔

آج بھی ٹہل گھوم کر جائزہ لیجئے تو اندازہ ہوتا ہے کہ جس طرح دہلی گیٹ کے آگے خونی دروازہ (لال دروازہ) ہوتے ہوئے اتر دکھن شاہراہ گئی ہے۔ یہ بہت پرانی سڑک ہے، جسے اب "بہادر شاہ ظفر مارگ" کہتے ہیں۔ اسی طرح چھتہ شیخ نرور آنے کے لئے اتر دکھن شاہراہ نہ سہی، کشادہ گلی ضرور رہی ہوگی۔ جو ترکمان گیٹ کے سامنے والی شاہراہ (موجودہ آصف علی روڈ) سے مل جاتی ہوگی۔ مکی مسجد سے کچھ اتر کھڑے ہو جائیے اور وہیں سے مزار حضرت شاہ ولی اللہؒ کو دیکھئے تو داہنی جانب مکی مسجد ہے اور اسی خط مستقیم پر مسجد شاہ عبد العزیز (درگاہ مسجد) ہے، جسے اب نشیر میوات نے پورب جانب

بڑھا کر صحن مسجد بنا دیا ہے۔ یہ دونوں مسجدیں کسی زمانہ میں درگاہ شاہ ولی اللہ تک جانیوالی گلی کی دائیں جانب رہی ہوں گی، جو چھتہ شیخ نزدر کا راستہ رہا ہوگا اور راستہ کے دونوں طرف مکانات رہے ہوں گے۔ رفتہ رفتہ مکانات گرتے گئے، مکان کے مکینوں نے زمین کے نیچے جگہ بنالی، محلہ ویران ہوگیا اور قبرستان آباد ہوگیا ۔۔۔ یہ جگہ چھتہ شیخ نزدر ہے۔ اس محلہ کے پورب اور شاہراہ لاہور (موجودہ بہادر شاہ ظفر مارگ) کے پچھم کا درمیانی حصہ محلہ تھندیان اور باغ تھندیان کا ہے۔ یہ بات یوں بھی سمجھ میں آتی ہے کہ نواب صاحب کی ڈیوڑھی، تھندیان کی لق ودق عمارت اور ان کے باغات شاہراہ سے قریب تر ہوں اور عام لوگوں کی رہائش شاہراہ سے دور گلیوں میں ہو۔ تھندیان نواب صاحب کی یادگار تھی اور چھتہ شیخ نزدر کے مکین "عام لوگ" تھے !

زمانہ نے کروٹ بدلی، محلات زمین بوس ہوگئے۔ چھتہ شیخ نزدر کا نام بھی تاریخ کے صفحات میں گم ہوگیا اور تھندیان نے پورے محلہ کو اپنے دائرہ میں لے لیا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ تھندیان کے مکینوں کی قبریں مکی مسجد سے لے کر درگاہ ولی اللہ کے آس پاس بنی ہوں اور اسی مناسبت سے تھندیان کا دائرہ پھیل کر درگاہ شاہ ولی اللہ یا چھتہ شیخ نزدر تک پہونچ گیا ۔۔۔ آج کا تھندیان بہرحال اس جگہ نہیں ہے جہاں کبھی عمارت تھندیان تھی۔ اور جہاں اس نام پر محلہ آباد تھا۔ محلہ تھندیان کی حد آج کا مردہ خانہ ہے، اس کے بعد چھتہ شیخ نزدر ۔۔۔ اس چھتہ شیخ نزدر کا دکھنی حصہ بھی کٹ کر اب دوسرے مصرف میں ہے اور بقیہ "چھتہ" اب درگاہ شاہ ولی اللہ یا "تھندیان کے نام سے جانا جاتا ہے۔ چار دیواری کے ذریعہ جس کی حد بندی کر دی گئی ہے !

آزادیٔ وطن کے بعد جب دہلی ایک بار پھر بسنے لگی تو اس کا جغرافیہ بھی بدلنے لگا نئی نئی سڑکیں نکالی گئیں۔ تعمیر کا سلسلہ پھیلتا چلا گیا تعمیر اور ترقی کے دور میں وسعتیں سمٹ سی جاتی ہیں اور حوصلے حدود کو توڑتے نظر آتے ہیں۔ دہلی بھی بڑھتی چلی گئی، اس پھیلاؤ

کے بہت سے پہلو بڑے خوشگوار ہیں۔ لیکن ایک ناگوار حقیقت یہ ہے کہ اوقاف کی زمینوں پر بھی یہاں وہاں قبضہ ہوتا گیا اور اب ان پر فلک بوس عمارتیں کھڑی ہوئی ہیں شاید قبرستان مہندیان کی جگہ بھی کوئی عمارت نظر آتی اور جو حشر مسجد و خانقاہ حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ کا ہوا وہی معاملہ اس درگاہ کے ساتھ بھی ہوتا ــــ مگر قضا نے قدر کی روشنائی سے کیا لکھا لکھایا ہے۔ کوئی نہیں جانتا، قضا و قدر کے فیصلے خاموشی کے ساتھ سامنے آجاتے ہیں۔ جب کوئی نئی بات پیش آتی ہے، ہم واقعات کے عقلی تسلسل تلاش کرتے ہیں، لوگ کہتے ہیں، اتفاقات کی کڑیاں مل گئیں۔ وہ نہیں جانتے، تکوینیات کی لڑیاں اسی طرح تھیں، وہ کوئی اتفاق نہیں، قدرت کے فیصلہ کا اظہار ہوتا ہے۔ قدرت کے فیصلے واقعاتی ترتیب اور عقلی تسلسل کے پابند نہیں ہوتے وہ تو بس سامنے آجاتے ہیں !

حضرت شاہ ولی اللہ کا کام اور نام تو زندہ رہے گا، ان کے گرامی مرتبت فرزندوں اور اولاد کی خدمات فراموش نہیں کیجا سکتیں، مگر ان کے مزارات بھی بچ جائیں گے۔ ایک وقت تھا جب اس کا تصور بھی مشکل تھا۔ مگر جو صورتِ حال سامنے آئی کہنا پڑتا ہے: "اجل کی زندگی پر دسترس کیا ؟" ــــــــ قبرستان مہندیان کو باقی رہنا تھا، یہی مشیت ایزدی تھی ــــ وہ موجود ہے ــــ خدا تعالیٰ نے جناب علی محمد شیر میوات سے یہ کام لے لیا۔ کبھی ان سے خالی وقتوں میں ان تفصیلات کو سنیئے تو انداز ہوگا کہ اس جی دار شخص نے کتنے تلخ و ترش حالات سے گذر کر اس یادگار کو باقی رکھا ہے۔ نہ جانے کتنی قسطوں میں انھوں نے وہ چھوٹے بڑے واقعات مجھے سُنائے ہوں گے جن سے گذر کر آج یہ یادگار، نہ صرف یادگار کی شکل میں محفوظ ہے بلکہ پُرانی یادوں کو نئی زندگی مل رہی ہے۔

شیر میوات ۱۹۳۹ء میں پہلی مرتبہ یہاں آئے تھے۔ پھر ان کے قدموں نے اس راہ کو پہچان لیا اور اب اس تاریخی جگہ کی ہمہ جہت ترقی ہی ان کی زندگی کا

رشن ہے۔ ۱۹۴۷ء میں انھیں حضرت سحبان الہند مولانا احمد سعیدؒ نے درگاہ کا متولی بنایا، قانونی کارروائی کی تکمیل ہوئی ــــ اس کے بعد ان کے ساتھ غیر قانونی اور غیر اخلاقی حرکتوں کی ابتدا ہوگئی۔ لوگوں نے قدم اکھاڑنا چاہا، وہ جمے رہے، بھگانا چاہا، وہ ڈٹ گئے۔ اذیتیں پہونچائی گئیں، صبر وشکر کے ساتھ جھیلتے رہے، واقعات کے تند تھپیڑوں نے کبھی ان میں نہ لرزش پیدا کی اور نہ لغزش! انھوں نے بتایا کہ ایک وقت آیا جب پولیس نے انھیں بہت زیادہ پریشان کیا، ان پر سچے جھوٹے مقدمات چلائے گئے، وہ سب کچھ جھیلتے رہے، تنگدستی کا یہ حال ہوگیا کہ بھوک مٹانے کے لئے درخت کی چھالیں کھانا پڑیں۔ وہ کہتے ہیں: نہ جانے پولیس کے کتنے ڈنڈے میری پیٹھ پر پڑے ــــ اور جب وہ واقعات بیان کرتے کرتے کہتے ہیں: "مولوی صاحب ۳۶/۳۴ چھوٹے بڑے مقدمات سے نبٹا ہوں" تو ان کے لہجہ کی سختی بتاتی ہے کہ دو چار درجن مقدمات لڑنے کے لئے اب بھی تیار ہیں ــــ اگر شیر میوات کا یہ دم خم نہ ہوتا تو آج قبرستان مہندیان کا وجود صرف تاریخ کے صفحات میں ہوتا زمین پر کوئی دوسری عمارت ہوتی!

کبھی کبھی کہنے والا خود نہیں جانتا کہ اس کی باتوں کے اثرات کتنے گہرے پڑ رہے ہیں، اور وہ الفاظ سننے والوں کے دلوں پر کیسی تخم ریزی کر رہے ہیں۔ قبرستان مہندیان میں جامعہ رحیمیہ کی نشاۃ ثانیہ دراصل ایک گفتگو کا اثر ہے ــــ ۱۹۵۵ء کی بات ہے، مفسر قرآن حضرت مولانا محمد یوسفؒ حوض والی مسجد (چوڑی والان) میں درس قرآن دے رہے تھے، انھوں نے کسی مناسبت سے قبرستان مہندیان کا ذکر کیا۔ مدرسہ رحیمیہ کی یاد دلائی اور تحریک کی کہ مدرسہ کو زندہ کرنا چاہیئے۔ یہ مختصر سی گفتگو شیر میوات صاحب کے دل میں گھپ گئی، انھوں نے کئی حضرات کو مدرسہ کے قیام پر آمادہ کیا، مگر بات بنی نہیں ــــ اس گفتگو کے چھبیس ۲۶ برسوں کے بعد مولانا

محمد یوسف صاحب کی آرزو پوری ہوئی اور جناب علی محمد شیر میوات جامعہ رحیمیہ قائم کرنے میں کامیاب ہو گئے ۔۔۔۔۔۔۔

۱۱ر مئی ۱۹۸۱ء کو حضرت حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند نے پہلا سبق پڑھا کر اس تاریخی اور تاریخ ساز ادارہ میں پھر سے بسم اللہ کرائی۔ تدریسی کام شروع ہو گیا، مدرسین اور طلبہ مل گئے اور نئے دور میں پہلے مہتمم مفتی محمد ضیاء الحق صاحب دہلوی بنائے گئے[1]۔ جولائی ۱۹۸۲ء میں وہ پاکستان منتقل ہو گئے۔ اہتمام کی ذمہ داری کچھ عرصہ تک شیر میوات صاحب انجام دیتے رہے۔ ۱۹۸۳ء میں مشہور عالم اور خطیب مولانا اخلاق حسین صاحب قاسمی منصب اہتمام پر فائز ہوئے[2]۔

---

[1] مفتی صاحب بڑی جاندار شخصیت کے مالک رہے ہیں۔ اچھے عالم اور بہت اچھے خطیب اپنے مخصوص لہجہ میں دہلی کے محاوروں کو لپیٹ کر اس طرح بولتے کہ سبحان اللہ ۔۔۔۔ کسی زمانہ میں ان کے ہفت روزہ "جمعیۃ ٹائمز" کے ذریعہ دہلوی اردو پڑھنے کو ملتی تھی۔ تقریباً پورا ہفت روزہ انھیں کے قلم سے ہوتا۔ شان خط بھی خوبصورت تھا۔ کبھی کبھی بعض حصہ کی کتابت بھی فرمادیتے تھے۔ شان خط ایسا، جیسے خط لکھ رہے ہوں۔ تحریر ایسی، جیسے تقریر کا کوئی حصہ رواں دواں چلے پہ چبھتے ہوئے، طنز بھی پھبتیاں بھی، آمد ہی آمد ۔۔۔۔ مفتی صاحب کے دم سے کسی زمانہ میں دہلی میں ایک ہلچل رہتی تھی۔ اب پاکستان میں ہیں خدا اسلامت باکرامت رکھے۔

[2] مولانا اخلاق حسین صاحب قاسمی مخصوص وضع کے بزرگ ہیں۔ قرآن مجید سے گہرا شغف، تفسیروں پر مضبوط گرفت، احادیث اور علوم اسلامیہ پر اچھی نظر، زبان اور محاوروں کی باریکیوں سے خوب واقف، کئی کتابوں کے مصنف اور موثر خطیب۔ علماء سے خالی ہوتی ہوئی دہلی میں مولانا کی ذات بہت غنیمت ہے کسی بھی عالم کیلئے دو مرحلے سخت ہوتے ہیں۔ ایک مقدمہ بازی دوسرے مدرسہ کا اہتمام مولانا اس دوسرے مرحلہ میں مبتلا ہو گئے تھے مگر جلد ہی اس سے چھٹکارا مل گیا۔ دہلی میٹروپولیٹن کے ممبر اور پردیس جنتا پارٹی کے نائب صدر بھی رہ چکے ہیں۔ اب خطابت اور تصنیف و تالیف میں منہمک ہیں۔ اطال اللہ عمرہ

اور اب ۱۹۸۸ء سے محترم مولانا فقیہہ الدین صاحب جامعہ رحیمیہ کے مہتمم ہیں۔[1]

جامعہ رحیمیہ ان دنوں مکی مسجد سے لے کر مسجد شاہ عبدالعزیز (یہ سب اب درگاہ شاہ ولی اللہ یا قبرستان مہندیان کے احاطہ میں ہے۔) تک پھیلا ہوا ہے۔ مکی مسجد میں درجہ حفظ و تجوید ہے اور مسجد شاہ عبدالعزیز اور اس کے ارد گرد درجات عربی کی تعلیم ہوتی ہے، دینیات عربی کی ابتدائی تعلیم سے لیکر دورہ حدیث تک کی تعلیم کئی برسوں سے ہو رہی ہے۔ ——— بحمداللہ یہ ادارہ گرانقدر علمی اور دینی خدمات انجام دے رہا ہے ——— جامعہ رحیمیہ کی نئی زندگی اور تیز رفتار ترقی شیر میوات جناب علی محمد صاحب کے اخلاص اور عمل پیہم کا نتیجہ ہے۔ خدا کرے جامعہ رحیمیہ، مدرسہ رحیمیہ کی طرح شجرِ سایہ دار بن جائے اور علم و عمل کا گہوارہ اور صدق و صفا کی بستی ثابت ہو۔

شیر میوات صاحب کے زرخیز ذہن اور بلند سے بلند تر کی جستجو نے اس وادی علم و آگہی میں شاہ ولی اللہ اکیڈمی کا خاکہ بنالیا ہے اور یہ کتاب جو آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ اس اکیڈمی کی پیش کش ہے ——— یہ ادارہ جس سرزمین سے وابستہ ہے اس کا حق تھا کہ ایسی کتاب لکھی جائے جس میں اس قبرستان میں مدفون اہم ہستیوں اور مدرسہ رحیمیہ کا تذکرہ ہو۔ "الواح الصنادید" انھیں بزرگوں کا ذکر خیر اور مدرسہ رحیمیہ

---

[1] مولانا فقیہہ الدین صاحب بڑی باوضع شخصیت کے بزرگ ہیں، سادگی، بے نفسی ایمانداری اور کئی مخلصوں کا خلوص اکیلے ان میں جمع ہے، جس کام سے لگے، لگ گئے، نہ فکر فردا نہ غم امروز ——— ہر حال میں راضی برضا، "بہار ہو کہ خزاں لا الہ الا اللہ" کی چلتی پھرتی تصویر، تلخ و ترش سن کر بھی زیر لب مسکراتے رہتے ہیں۔ مولانا ایڈیٹر اور لیڈر دونوں رہ چکے ہیں اور اب بھی بوقت ضرورت اور بقدر ضرورت دونوں کو زندہ کر لیتے ہیں۔ ان کی زندگی کے بہت سے صفحات میرے سامنے کھلے پڑے ہیں۔ یقین کے ساتھ کہتا ہوں کہ ایسے لوگ اب خال خال ملتے ہیں۔

کا تعارف ہے۔ اسے صرف خراج عقیدت نہیں سمجھنا چاہیئے، یہ کتاب تاریخ کے منتشر اوراق کو اکٹھا کرتے اور مدفون صفحات کو سامنے لانے کی کامیاب کوشش ہے، جس کا سہرا مولانا عطاء الرحمٰن قاسمی کے سر بندھا ہے۔

مولانا عطاء الرحمٰن قاسمی پڑھے لکھے عالم دین ہیں۔ جامعہ رحیمیہ میں اونچے درجات کو پڑھاتے ہیں۔ ان کی مدت تدریس ابھی صرف سات سال ہے مگر اس عرصہ میں انھوں نے قابلِ لحاظ ترقی کی ہے۔ پڑھنے پڑھانے کیساتھ انھوں نے لکھنے لکھانے کا سلسلہ بھی جاری رکھا ہے۔ پہلی مرتبہ میں نے ان کی کتاب "دنیائے اسلام کی چند عظیم شخصیتیں" پڑھی تو چونک پڑا۔ کتاب کے بین السطور میں اس شخص سے میری ملاقات نہیں ہوئی، جو مولانا عطاء الرحمٰن کے نام سے جانے جاتے ہیں۔ ان کے سراپا میں یک گونہ بےخودی کی سی کیفیت، کچھ کھوئے کھوئے، بھولے بھولے جیسے، اپنے آپ سے بے نیاز رہنے والا انداز میں نے پایا ہے۔ مگر اپنی پہلی کتاب میں وہ چاق وچوبند نظر آئے، ان کا تحریری آہنگ پسند آیا، اور اسلوب نگارش نے بتایا کہ خدا نے لکھنے کا جوہر دیا ہے۔ جسے وہ سلیقہ سے استعمال کر سکتے ہیں۔ اس کتاب میں نئے قلم کا کھدرا پن بھی بہت کم نظر آیا، جو خاکے انھوں نے کھینچے ہیں، مناسب ہیں، مکمل اس لئے نہیں کہتا کہ محبت یا عقیدت میں انھوں نے کچھ گفتنی کو بھی ناگفتنی بنا دیا ہے ———
ان کی یہ پہلی کاوش، پہلی کوشش کی وجہ سے نہیں، بجائے خود لائق تحسین ہے۔ انھوں نے مجھ سے دریافت کیا تھا "کتاب پر آپ کا کیا تبصرہ ہے"۔ میں نے جواب دیا: "اس کا نام صحیح نہیں ہے۔ ورنہ کتاب مجھے پسند ہے" انھوں نے پوچھا "کیوں؟ نام میں کیا غلطی ہے؟" میں نے کہا: "کسی پڑھنے والے سے پوچھ لیجئے" ——— کئی سال گزر گئے، جب یہ ذکر چھڑا تھا، اب شاید انھوں نے میری رائے سے اتفاق کر لیا ہوگا۔

مولانا عطاء الرحمٰن نے جب اپنی دوسری کتاب پر مقدمہ لکھنے کی فرمائش کی، میں نے عرض کیا کسی مشہور شخصیت، کسی اہل قلم سے لکھوائیے کہنے لگے "میں نے فیصلہ کرلیا ہے کہ مقدمہ آپ ہی سے لکھوانا ہے۔ میں نے کتاب کا نام پوچھا۔ جواب ملا "الواح الصنادید ——— میں نے کہا "مولانا! پھر تو ہر کتاب کے ساتھ لغت بھی فراہم کرنا ہوگی " آپ نے پہلی کتاب کا نام غلط رکھا اور دوسرے کا بہت گاڑھا جہاں زبان کا یہ حشر ہو کہ "وزیر داخلہ" کی جگہ گھریلو معاملوں کے وزیر" اردو خبروں میں سننے کو ملے۔ وہاں "الواح الصنادید" کون سمجھے گا۔ مگر مولانا عطاء الرحمٰن نام بدلنے پر تیار نہیں ہوئے!

"الواح الصنادید" نام کی حد تک بوجھل ضرور ہے۔ مگر یہ کتاب آسان، شگفتہ اور سلجھی ہوئی زبان میں لکھی گئی ہے، جس میں "لوح تربت" کے سہارے بہت ساری شخصیتوں کا تذکرہ محفوظ ہوگیا ہے۔ جس میں دانش گاہِ علم و یقین مدرسہ رحیمیہ کی تاریخ بھی ہے اور حضرت شاہ ولی اللہ اور قبرستان مہندیان میں آسودہ خواب شخصیتوں کا تذکرہ بھی! جس میں انگریزوں کی چیرہ دستیوں اور اسلامی مراکز کی گورکنی کی تصویر بھی ہے اور اسلامی تاریخ کے کئی مدفون حصوں اور گم شدہ کڑیوں کی تلاش اور تحقیق بھی ——— مولانا عطاء الرحمٰن نے دفینہ کو سفینہ میں سجا دیا ہے اگر ان کی کوشش کو سراہا نہ جائے تو زیادتی ہوگی۔

خدا انھیں علم و تحقیق، تصنیف و تالیف کے میدان میں برابر تازہ دم با حوصلہ اور کارگزار رکھے اور ان کی خدمات کو شرف قبولیت سے نوازتا رہے۔ (آمین)

عمارۃ الدکتور خلیل عبد الرحمٰن المحترم
شارع ابی ذر، جوار المسجد النبوی شریف
المدینۃ المنورہ

تعارف

از

مولانا فقیہہ الدین صاحب، مہتمم جامعہ رحیمیہ نئی دہلی

سرسید احمد خان نے آثار الصنادید لکھ کر دورِ مغلیہ کے آثار کو تاریخ میں محفوظ کر دیا اگر سرسید احمد خان یہ کتاب نہ لکھتے تو ہندوستان میں اسلامی دورِ حکومت کا نام ونشان نہ ملتا اور ہندوستانی مورخ اس بات کا صاف منکر ہو جاتا کہ ہندوستان کے لئے مسلم حکومتوں نے کچھ کیا آج یہ کتاب ایک تاریخی حقیقت بن گئی ہے کہ ہندوستان کو مسلمانوں نے سب کچھ دیا ہے اور یہ کتاب آثار الصنادید اس کی سند ہے۔

ٹھیک اسی طرح آج کے مورخ مولانا مفتی عطاء الرحمن قاسمی استاذ جامعہ رحیمیہ نے ''الواح الصنادید'' مرتب کر کے ہندوستان کے ان مرحوم اکابر، علماء، مشائخ، اولیاء اور اصفیاء کو زندۂ جاوید بنانے کی کوشش کی ہے جو قبرستان مہندیان میں مدفون راحت ہیں اگرچہ اس عنوان پر پروفیسر اسلم، پنجاب یونیورسٹی نے بھی اس سے قبل قلم اٹھایا ہے اور انھوں نے نہایت مختصر طور پر پاکستان کے قبرستان میں مدفون اکابر کے قبروں کی الواح پر روشنی ڈالی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ انھوں نے اس عنوان کو سرسید احمد خاں کی ''آثار الصنادید'' سے مستعار لیا ہے۔ پروفیسر اسلم

ہند و پاک کے مشہور اہل قلم ہیں ان کا ہندوستان سے بھی قدیمی تعلق ہے۔ خاص طور پر ان کی نسبت ہندوستان کے مشہور عالم اور اسلامی مورخ مولانا سعید احمد اکبر آبادیؒ کی صاحبزادی کے شوہر ہونے کی وجہ سے مضبوط تر ہے اور ہندوستان کے مورخ اور اہل قلم پروفیسر صاحب کو عزت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ ان کے مضامین اکثر رسالہ "برہان" دہلی میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ پروفیسر اسلم نے اس عنوان پر بہت مختصر لکھا ہے۔ لیکن مولانا مفتی عطاء الرحمن قاسمی نے "الواح الصنادید" میں عام مقابر اور مزارات کے ساتھ ساتھ اور خانوادۂ علم و علماء کے سرگروہ حجۃ الاسلام حضرت امام شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے سلسلوں کے مشائخ کبار پر تفصیلی روشنی ڈالی ہے جس سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ اس خطہ قدس میں کیسے کیسے مشائخ دین و صلحاء امت آسودہ راحت ہیں۔

اس کتاب سے یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ اس خطہ مبارک میں سلسلۂ چشتیہ کے عظیم ترین بزرگ شخصیت حضرت شاہ عبد العزیز شکر بار رحمۃ اللہ علیہ بھی آسودۂ راحت ہیں۔ ان کی بزرگی اور عظمت کا اندازہ آپ کو اس سے لگ سکتا ہے کہ ہندوستان میں سلسلۂ نقشبندیہ کے نقیب اول امام المجددین حضرت خواجہ باقی باللہ قدس سرہٗ اپنی قیام گاہ کوٹلہ فیروز شاہ سے آکر ان کے مزار اقدس پر حاضری دیتے تھے اور کچھ مورخ تو لکھتے ہیں کہ خواجہ صاحب ان کے مزار کی جاروب کشی بھی کرتے تھے۔

اس کتاب سے یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ سید الطائفہ حضرت شاہ عبد الرحیم والد ماجد حضرت امام شاہ ولی اللہ نے یہاں پر مدرسہ رحیمیہ کے نام سے ایک مدرسہ قائم کیا تھا۔ یہ مدرسہ کیا تھا علوم حدیث و قرآن، فلسفہ اسلامی اور فقہ کی اپنے وقت میں ایک یونیورسٹی تھی۔ اسی مدرسہ میں حضرت شاہ عبد الرحیم صاحب

درس تفسیر و حدیث و تصوف اور تبلیغ اسلام کے عظیم مشن کو چلاتے رہے۔ شاہ عبدالرحیم صاحب نہ صرف علوم قرآن و حدیث کے ماہر تھے بلکہ علم تصوف میں بھی اپنے وقت کے شیخ اکبر تھے۔ شاہ عبدالرحیم صاحب کو نسبت نقشبندیہ حضرت خواجہ باقی باللہ کے صاحبزادہ خورد سے حاصل تھی اور یہ حضرت خواجہ خورد کے شاگرد بھی تھے علوم و فنون میں پوری مہارت حضرت خواجہ خورد سے حاصل کی تھی۔

اس کتاب سے یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ شاہ عبدالرحیم صاحب کے بعد اسی مدرسہ رحیمیہ میں حجۃ الاسلام حضرت شاہ ولی اللہ نے پوری زندگی درس و تدریس میں گزاری۔ آپ کے بعد آپ کے صاحبزادگان والاشان حضرت شاہ عبدالعزیز، شاہ رفیع الدین، شاہ عبدالقادر اور شاہ عبدالغنی نے یہیں اپنی تعلیم مکمل کرکے درس و تدریس میں مشغول رہے۔

اب تو مختصر طور پر میں عرض کرتا ہوں کہ مخدوم العلماء استاذ الاساتذہ حضرت مولانا مملوک علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ بھی یہیں مدفون رحمت ہیں۔ آپ کی شخصیت ہندوستان کے لئے باعث عزت و عظمت ہے کہ آپ کے تلامذہ ارشد میں حضرت قاسم العلوم والخیرات مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ جنھوں نے دارالعلوم دیوبند قائم کیا اور سرسید احمد خاں جنھوں نے مسلم یونیورسٹی قائم کرکے ہندوستانی مسلمانوں کی عظیم خدمت انجام دی، شامل ہیں۔

مجھے اپنے اس خواب کے ذکر سے بڑی روحانی مسرت ہو رہی ہے کہ میں کل رات استاذ الکل حضرت مولانا مملوک علی نانوتوی قدس سرہ کے مزار اقدس کے قریب کھڑا ہوا ہوں۔ دیکھتا کیا ہوں کہ استاذ الکل حضرت مولانا مملوک علی نانوتوی کی قبر سے مسلسل پانی کے پھوارے پھوٹ رہے ہیں۔

معاً میرے ذہن میں اس کی تعبیر آئی کہ اس "ماء جاری" سے مراد حضرت

مولانا مملوک علی نانوتوی کا علمی و روحانی فیض ہے، جو بلا انقطاع آج تک جاری و ساری ہے۔

آخر میں کہنا چاہوں گا کہ یہ چشمہ فیض آج بھی جاری ہے اور جامعہ رحیمیہ کے نام سے ایک عظیم الشان مدرسہ قائم ہے اور اپنے اسلاف کرام کے نقوش کو زندہ و پائندہ رکھے ہوئے ہے۔ اس جامعہ کی نشاۃ ثانیہ کے بانی جناب علی محمد شیر میوات دن رات اس کی ترقی اور کامیابی کے لئے اپنے کو وقف کئے ہوئے ہیں۔

میں مولانا عطاء الرحمان صاحب کو اس ضخیم ترتیب پر دلی مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

العبد العاجز فقید الدین کان اللہ لہ

استاذ و مہتمم جامعہ رحیمیہ حضرت امام
شاہ ولی اللہ قدس سرہ

دیباچہ

۱۱۱۲ھ میں بعہد عالمگیری شیخ الاسلام حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی[۲] کے والد ماجد حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب محدث متوفی ۱۱۳۱ھ نے چھتہ شیخ نمرور (مہندیان) میں جہاں آپ کا خاندان آباد تھا۔ ایک اسلامی مرکز مدرسہ رحیمیہ کے نام سے قائم کیا۔ اس زمانہ میں مدرسہ رحیمیہ علوم وفنون کا منبع اور رشد و ہدایت کا عظیم مرکز شمار ہوتا تھا۔ مرکز رحیمی میں نہ صرف ہندوستان بلکہ افغانستان، ایران، حجاز اور سمرقند و بخارا تک کے ہزارہا طالبانِ علم نبوت جوق در جوق آتے اور جوہرِ علم سے آراستہ و پیراستہ ہو کر نکلتے تھے۔

حضرت شاہ عبدالرحیم محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ ظاہری و باطنی علوم کے جامع اور سلسلہ چشتیہ و سلسلہ نقشبندیہ کے امام تسلیم کئے جاتے تھے۔ کیونکہ مدرسہ رحیمیہ میں علومِ ظاہری کی تکمیل کے ساتھ ساتھ باطنی علوم و معارف سے بھی دلوں کو معمور و منور کیا جاتا تھا۔ اور مدرسہ رحیمیہ کا فاضل اگر ایک جانب یگانہ روزگار عالم ہوتا تو دوسری جانب کامل درجہ کا شیخ ہوتا تھا۔ جیسا کہ مولوی بشیرالدین احمد صاحب دہلوی "واقعات دارالحکومت" میں لکھتے ہیں :۔

" شیخ وجیہہ الدین کی شہادت کے بعد ان کے صاحبزادے شاہ عبدالرحیم

صاحب نے درس و تدریس کا سلسلہ جاری رکھا اور مدرسہ رحیمیہ قائم
کیا۔ تمام دن قرآن مجید اور حدیث پاک کا درس دیتے تھے اور
رات کو طالبان خدا کی توجہ دہی اور مراتب سلوک طے کرانے میں مشغول
رہتے اور ظاہری اور باطنی دونوں علموں کی تعلیم دیتے۔"

واقعات دار الحکومت ص۵۸۵

حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب محدث دہلوی رح کے وصال کے بعد حضرت شاہ
ولی اللہ صاحب محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کو سب نے متفقہ طور پر آپ کے والد
مرحوم کی مسند درس سپرد فرمائی جس کو آپ نے بڑی خوش اسلوبی اور اولوالعزمی
کے ساتھ بارہ سال تک نہ صرف نبھایا بلکہ اس کو شاہراہ ترقی پر گامزن بھی کیا۔ پھر آپ
کو ازدیادِ علم کا جذبہ حرمین شریفین لے گیا۔ جہاں آپ نے مشائخ حرمین شریفین سے
خوب خوب استفادہ کیا۔ اور دو سال بعد پھر ہندوستان واپس آکر اپنے والد
ماجد کی یادگار مدرسہ رحیمیہ میں قرآن و حدیث کا درس دینا شروع فرمایا۔ آپ کی تبحر علمی
اور جامعیت کی شہرت کی بنا پر چند ہی دنوں میں پھر ملک و بیرون ملک سے تشنگان
علوم قرآن وحدیث گروہ در گروہ مدرسہ رحیمیہ آکر جمع ہونے لگے اور یہاں پھر
قال اللہ قال الرسول کی صدائیں گونجنے لگیں۔

نصاب تعلیم

بارہویں صدی ہجری کے جلیل القدر عالم دین اور فلسفی استاذ العلماء ملا
نظام الدین فرنگی محلی نے جو شاہ عبدالرحیم صاحب دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے ہم عصر
اور ہم مشرب تھے۔ اپنے عہد کے دینی مدارس کے لئے ایک دینی نصاب مرتب
فرمایا تھا، جو درس نظامی کے نام نامی سے جانا پہچانا جاتا ہے جو ہندوستان
پاکستان، بنگلہ دیش، افغانستان اور نیپال وغیرہ کے قدیم دینی مدارس میں آج بھی

رائج ہے۔ انقلابات زمانہ اور حوادث روزگار کے باوجود کوئی ماہر تعلیم آج تک اس نصاب میں کوئی خاص اور مفید ترمیم نہ کر سکا۔

حضرت شاہ عبدالرحیم محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ بھی معاصرت کے باوجود اس نصاب سے متاثر تھے۔ لہٰذا اس نصاب کی اکثر کتابیں حضرت شاہ صاحب اپنے مدرسہ رحیمیہ میں پڑھاتے تھے۔۔۔۔ اور اسی نصاب کو حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث اور دوسرے فضلائے رحیمیہ نے پڑھا اور شاہ عبدالرحیمؒ صاحب نے پڑھایا۔

مدرسہ رحیمیہ کی نصابی کتابیں حسب ذیل ہیں، جو فی الحقیقت درس نظامی ہی کا نچوڑ ہے۔

کافیہ، شرح جامی، شرح وقایہ، ہدایہ، حسامی، توضیح و تلویح، شرح شمسیہ، شرح مطالع شرح عقائد نسفی، مختصر المعانی، مطول، قاضی بیضاوی، تفسیر مدارک، عوارف المعارف رسائل نقشبندیہ، شرح رباعیات ملا جامی، لوائح، مقدمہ لمعات، مقدمہ نقد النصوص موجز القانون، شرح ہدایۃ الحکمت، مشکوۃ شریف، صحیح البخاری، شمائل ترمذی۔

درس حدیث

ہندوستان میں درس حدیث کے مبلغ اور علمبردار حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ تھے۔ ان کے بعد شیخ الاسلام حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ اور ان کے خانوادے نے علوم قرآن و حدیث کی طرف معاصر علماء اور مشائخ کو متوجہ کیا اور اپنے مدرسہ رحیمیہ کے نصاب میں حدیث کی کتابوں کا اضافہ فرمایا ورنہ اس عہد کے علماء و فضلاء نحو، صرف، منطق، فلسفہ اور فقہ کی بحثوں و موشگافیوں میں الجھے ہوئے تھے اور قرآن و حدیث کو طاق نسیان میں رکھے ہوتے تھے۔

ولی اللہی نصاب

حضرت امام شاہ ولی اللہؒ نے اگرچہ اس قدیم نصاب کو مدرسہ رحیمیہ میں پڑھا تھا۔ لیکن آپ نے حرمین شریفین سے واپسی کے بعد اس قدیم نصاب میں بعض احادیث کی اہم کتابوں کا اضافہ فرمایا اور اس جدید نصاب کو مدرسہ رحیمیہ میں جاری کیا۔ شاہ صاحب کی اضافہ کردہ کتابیں حسب ذیل ہیں۔

المؤطا مع المسوی، حصن حصین، شمائل الترمذی، صحیح الامام البخاری، جامع الترمذی سنن ابو داود، مقدمہ صحیح مسلم، سنن ابن ماجہ، سنن النسائی۔

یہ حقیقت ہے کہ رحیمی اور ولی اللہی نصاب ملانے کے بعد ہی ہندوستان پاکستان، بنگلہ دیش، افغانستان اور ایران وعراق کے قدیم دینی مدارس کا نصاب مکمل ہوتا ہے۔ آج قدیم دینی مدارس میں جو نصاب رائج ہے وہ دراصل رحیمی اور ولی اللہی نصاب کا مجموعہ ہے۔ اگرچہ اس مشترکہ نصاب میں سے بعض کتابیں حذف کر دی گئی ہیں اور کچھ کا اضافہ ہوا ہے مگر بنیادی اور کلیدی کتابیں سبھی باقی ہیں۔

مولانا امداد صابری صاحب لکھتے ہیں کہ

"ہندوستان میں صحاح ستہ کے درس و تدریس کا رواج اس وقت سے ہوا ہے جبکہ شاہ صاحب اور ان کے نامور اخلاف نے اس کو اپنی محنتوں سے رواج دیا اور اپنی عمر کا بیشتر حصہ اس کی اشاعت پر صرف کر دیا۔"

دہلی کے قدیم مدارس و مدرس صـ۱۱۹ـ

فضلائے مدرسہ رحیمیہ

مدرسہ رحیمیہ میں ہندوستان کے جن مشاہیر علماء اور کبار مشائخ نے تعلیم حاصل

کی ہے ان میں سے چند اہم ہستیاں یہ ہیں۔ حضرت شاہ ولی اللہؒ متوفی ۱۱۷۶ھ
قاضی ثناء اللہ صاحب پانی پتیؒ متوفی ۱۲۲۵ھ، شاہ عبدالعزیزؒ متوفی ۱۲۳۹ھ، شاہ
عبدالقادرؒ متوفی ۱۲۳۰ھ، شاہ رفیع الدین محدث دہلویؒ متوفی ۱۲۳۳ھ، شاہ عبدالغنی
شاہ محمد عاشق پھلتی متوفی ۱۱۸۷ھ، شاہ نور اللہ صاحب بدھانوی، شاہ اہل اللہ ۱۱۸۷ھ
خواجہ محمد امین کشمیری متوفی ۱۱۸۷ھ، شیخ ابوسعید بریلوی متوفی ۱۱۹۳ھ
شاہ جمال الدین متوفی ۱۲۲۱ھ، شاہ محمد نعمان بن سید محمد سعید نصیر آبادی متوفی ۱۱۹۳ھ
اخون محمد سعید افغانی متوفی ۱۱۸۸ھ علامہ محمد معین سندھی متوفی ۱۲۲۳ھ اور میر قمر الدین
منت دہلوی متوفی ۱۲۰۸ھ جیسی عالمی شخصیتیں قابل ذکر ہیں۔

شاہ صاحب کی انقلابی تحریک

مدرسہ رحیمیہ ابتدا ہی سے انقلابی تحریک کا مرکز رہا ہے۔ یہاں کے فضلاء اور علماء نے سامراجی قوتوں کا جم کر مقابلہ کیا اور انگریزوں کے لئے سم قاتل ثابت ہوئے۔ شاہ عبدالرحیم صاحب کے بعد شاہ ولی اللہ نے رجوع الی القرآن کی دعوت دی اور انقلابی رجحان رکھنے والے فضلائے مدرسہ رحیمیہ کی ذہنی و فکری رہنمائی کی اور ان کے اندر صالح انقلاب برپا کرنے کا جذبہ پیدا کیا۔

مولانا امداد صابری لکھتے ہیں:

"یہ مدرسہ صرف درسگاہ نہیں تھا بلکہ برصغیر کی ایک انقلابی تحریک کا مرکزی ادارہ تھا۔ جس نے پورے ہندوستان میں انگریزی سامراجیت کی جڑیں کمزور کرنے اور ان کا خاتمہ کرنے کے لئے عملی اقدامات کیے تھے۔ اور ایک جال پھیلایا تھا، اسے ایک خانقاہ کی بھی حیثیت حاصل تھی، جہاں لوگوں کے کردار و کیریکٹر بنائے جاتے تھے۔ وہاں انسان ڈھالے جاتے تھے اور مجاہدین کی تربیت کی جاتی تھی اس کو

ایک اکادمی بھی کہنا بیجا نہ ہوگا۔ کیونکہ اس کے سربراہوں اور سلاطین کے قلم اور ذہن تحقیق وتدقیق کے میدان میں بھی گرم رفتار ہے۔ اس کی سیاسی خدمات کا باب بھی دوسرے ابواب سے کم اہم نہیں ہے۔

دہلی کے قدیم مدارس ومدرس ص۱۱۲۔۱۱۱

مدرسہ رحیمیہ کی امتیازی خصوصیت

مدرسہ رحیمیہ کی یہ امتیازی خصوصیت رہی ہے کہ کوئی بھی فنی کتاب اسی استاذ کے سپرد کی جاتی تھی جو استاذ اس فن میں خصوصی مہارت اور حذاقت رکھتا ہو اور اس خصوصیت کو شاہ صاحب نے بڑے اہتمام اور شدت کے ساتھ ہمیشہ قائم رکھا اور درحقیقت یہی طریقہ مفید بھی ہے کیونکہ اگر ایک استاذ مختلف فنون کی کتابیں پڑھاتا ہے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس استاذ کو کسی بھی فن میں عبور وکمال حاصل نہیں ہو پاتا ہے جس کا اثر طلباء پر پڑنا لازمی امر ہے اور موجودہ دور کے تعلیمی انحطاط وزوال کے اسباب میں سب سے اہم سبب یہ بھی ہے جس کو کسی بھی حال میں نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

چنانچہ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی لکھتے ہیں:۔

حضرت والد ماجد از ہر فن شخصے تیار کردہ اند۔ طالب ہر فن بارے می سپردند۔ وخود مشغول معارف نویسی وگوئی می بودند بعد مراقبہ ہرچہ بکشف می رسید می نگاشتند۔	والد ماجد نے ہر فن کے لئے ایک شاگرد کو تیار کیا تھا۔ اور ہر فن کے طالب علم کو اس کے متخصص کے سپرد فرماتے تھے اور خود فکر و نظر اور تحریر میں مشغول رہتے تھے۔ ان کو قلم بند فرماتے تھے۔

مدرسہ شاہ عبدالعزیز

مدرسہ رحیمیہ مہندیان کی اس تعلیمی شہرت کو سُنکر ہند و بیرون ہند کے شائقین حدیث وقرآن کثیر تعداد میں بے تابانہ آنے لگے یہاں تک کہ مدرسہ رحیمیہ اپنے عہد میں ہندوستان کا جامع ازہر بن گیا اور طلبہ کی کثرت اور ہجوم کی بنا پر مدرسہ رحیمیہ میں گنجائش نہیں رہی تو محمد شاہ بادشاہ رنگیلے مرحوم نے ۱۱۶۱ھ میں ایک عالی شان حویلی کلاں محل دریا گنج میں دی۔ مدرسہ رحیمیہ کے ارباب حل وعقد نے محمد شاہ بادشاہ کی مخلصانہ پیش کش کو منظور فرمالیا البتہ بعض مصالح کی بنا پر فوری طور پر مدرسہ منتقل نہ ہو سکا اور کچھ دنوں کے بعد شاہ عبدالعزیز محدث صاحب نے مدرسہ رحیمیہ "مہندیان" سے کلاں محل میں منتقل کردیا اور وہاں یہ اسلامی مرکز مدرسہ شاہ عبدالعزیز کے نام سے مشہور ہوگیا۔ محمد شاہ بادشاہ رنگیلا کی عطا کردہ حویلی بہت ہی بڑی تھی۔ حویلی کے ایک حصہ میں مدرسہ شاہ عبدالعزیز تھا۔ دوسرے حصہ میں خاندان ولی اللہی کی رہائش تھی۔ مدرسہ عبدالعزیز میں اساتذہ وطلبہ کے لئے علیحدہ علیحدہ اقامت گاہیں اور درس گاہیں تھیں۔

حضرت شاہ عبدالعزیز محدث حضرت امام شاہ ولی اللہؒ کے بعد مسند صدارت پر رونق افروز ہوئے اور حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب مدرسہ عبدالعزیز کے مہتمم اوّل اور اس کے روح رواں تھے۔ انھوں نے مدرسہ شاہ عبدالعزیز میں چونسٹھ سال تک نہایت ہی کامیابی اور علمی دیانتداری کے ساتھ قرآن وحدیث کا عالمانہ وعارفانہ درس دیا اور خاندان ولی اللہی کا نام روشن کیا اور حضرت شاہ ولی اللہ کی تحریک رجوع الی القرآن والحدیث کی تکمیل فرمائی۔ اس وقت آپ کے تدریسی عملہ میں شاہ محمد عاشق پھلتیؒ، شاہ نوراللہ بڈھانویؒ، خواجہ محمد امین کشمیریؒ اور بابا فضل اللہؒ جیسے ولی اللہی فکر کے علماء ومشائخ شامل تھے۔ یہ تمام اکابر ملت تحریک ولی اللہی کے مخلص مددگاروں اور معاونوں میں تھے۔ انھوں نے غیر منقسم ہندوستان میں مشن ولی اللہی کو عام کرنے

کی سعی فرمائی اور اس مہم میں کامیاب و کامراں بھی ہوئے۔ آج ہند و پاک میں
میں صحیح اسلامی عقائد اور دینی رجحانات جہاں بھی پائے جاتے ہیں۔ وہ ان ہی
مخلص و بے لوث بزرگوں کی مساعی جمیلہ کے ثمرات ہیں۔

فارغین مدرسہ شاہ عبدالعزیز

شاہ عبدالعزیز کے عہد میں مدرسہ شاہ عبدالعزیز میں بڑے بڑے علماء دین
اور مشائخ حدیث پیدا ہوئے اور نہ صرف ہندوستان بلکہ پورے عالم اسلام میں علوم
اسلامیہ کی اشاعت و ترویج میں سرگرم عمل رہے۔ درس و افتاء اور اصلاح و ارشاد
کی مسندوں پر متمکن ہوئے۔ قرآن و حدیث کی گرانقدر خدمات انجام دیتے رہے جس
میں سے چند اہم شخصیات کے اسمائے گرامی یہ ہیں۔ مولانا محمد اسماعیل شہیدؒ، شاہ مخصوص اللہؒ
شاہ محمد موسیٰؒ، شاہ محمد اسحاق دہلویؒ، مولانا شاہ محمد یعقوب دہلویؒ، مفتی الٰہی بخش
کاندھلویؒ، مولانا سید اولاد حسن قنوجی، مرزا حسن علی شافعی لکھنویؒ، مولانا حسین احمد
محدث ملیح آبادیؒ مولانا حیدر علی ٹونکی، مولانا خرم علی بلہوری، مفتی صدرالدین آزردہ
دہلوی، مولانا مفتی علی کبیر مچھلی شہری، مولانا رشید الدین دہلوی، مولانا سید قطب الہدیٰ
حسنی رائے بریلوی اور مولانا سید احمد بریلویؒ یہ سب ہی حضرات اپنے وقت کے اساتذہ
اور محدثین کاملین میں شمار کئے جاتے تھے جن کے بڑے بڑے حلقہائے درس تھے۔

شاہ رفیع الدین کا دور اہتمام

شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی جب موذی امراض کے شکار ہو گئے اور ضعف
بصارت کی وجہ سے مدرسہ شاہ عبدالعزیز کی انتظامی ذمہ داریوں کی انجام دہی سے
بڑی حد تک معذور ہو گئے تو آپکے برادر نسبی امام المفسرین شاہ رفیع الدین صاحب
نے نئے عزم و حوصلہ کے ساتھ اس مدرسہ کی آبیاری کی اور مدرسہ کو مزید ترقی کی راہ

پر گامزن کیا۔ لہذا، شاہ رفیع الدین صاحب کا دور اہتمام بھی مدرسہ شاہ عبدالعزیز کا جلی اور روشن باب شمار کیا جانے لگا۔ مدرسہ عبدالعزیز سے بڑے بڑے قوی الاستعداد اور ذی علم فضلاء و مشائخ نکلے اور ان سب نے بھی اعلاء کلمۃ اللہ ہی کو اپنا مشن بنا کر اس راہ پر گامزن ہوگئے۔ شاہ رفیع الدین صاحب کے دور اہتمام میں حضرت شاہ عبدالقادر محدث دہلوی نے بھی مدرسہ شاہ عبدالعزیز میں درس دینا شروع فرمایا اگرچہ آپ نے اپنی پوری زندگی اکبرآبادی مسجد میں گزار دی جیسا کہ عنقریب اس کا تفصیلی ذکر آئیگا۔ مولانا امداد صابری صاحب لکھتے ہیں :

"شاہ رفیع الدین ـــ کے بعد شاہ عبدالقادر صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا نام نامی مدرسہ کے مدرسین کی فہرست میں نظر آتا ہے یوں تو آپ نے تمام عمر مسجد اکبرآبادی میں درس و تدریس میں گزاری لیکن آپ نے مدرسہ شاہ عبدالعزیز میں بھی درس دیا۔

دہلی کے قدیم مدارس و مدرس صفحہ ۱۴۰

حضرت شاہ عبدالقادرؒ میدان تدریس کے بھی شہسوار تھے۔ موصوف مسجد اکبرآبادی میں معتکف ہونے سے قبل مدرسہ شاہ عبدالعزیز میں درس دیا کرتے تھے اور طلبہ کو مستفیض فرمایا کرتے تھے۔ آپ نے درس حدیث کے ساتھ ترجمہ قرآن مجید کا بھی سلسلہ شروع فرمایا۔ آج ملک میں جو قرآنی ذوق نظر آتا ہے وہ دراصل شاہ صاحب کا کارنامہ ہے۔

ہندوستان کی تاریخ میں خاندان ولی اللہی کی یہ صرف خصوصیت اور امتیازی شان رہی ہے جب تک اللہ کو اس خاندان میں علمی سلسلہ باقی رکھنا تھا۔ اس خاندان میں بڑے بڑے صاحب فضل و کمال افراد پیدا فرماتے رہے۔ جب اللہ تعالیٰ نے اس خاندان سے علم و فضل کو ختم کرنا چاہا تو نرینہ اولاد کا سلسلہ ہی منقطع فرمایا تاکہ نالائق اخلاف لائق و فائق اسلاف کی بدنامی اور رسوائی کا سبب نہ بن جائیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس طرح بھی ولی اللہی خاندان کو داغدار ہونے سے بچایا۔

مولوی بشیر الدین احمد "واقعات دار الحکومت" میں لکھتے ہیں۔

"شاہ ولی اللہ کے بعد ان کے چاروں صاحبزادوں نے دینی مشغلہ (درس و تدریس کا) جاری رکھا اور اس مدرسہ نے تعلیم دینیات میں وہ نام پایا کہ ہندوستان میں شہرہ ہو گیا جب شاہ صاحب کے صاحبزادوں میں کوئی نہ رہا تو مولانا محمد اسحاق مہاجر مکی نے مدرسہ کی خدمت اپنے ذمہ لی۔

شاہ محمد اسحاق کا دورِ اہتمام

حضرت شاہ محمد اسحاق محدث دہلوی، حضرت شاہ عبد العزیز کے نواسے اور تلمیذ عزیز تھے۔ جب شاہ ولی اللہ صاحب کے تمام عالی مقام صاحبزادگان واصل الی اللہ ہو گئے اور اس میں کوئی نہیں رہا جو میراث ولی اللہی کی حفاظت کرتا تو آپ نے مدرسہ شاہ عبد العزیز کی ذمہ داری قبول فرمالی اور آپ مدرسہ شاہ عبد العزیز کے باقاعدہ منتظم اور مہتمم ہو گئے جس پر آپ بیس سال تک فائز رہے۔ طلبہ کو حدیث و قرآن کے علوم و معارف سے مستفیض فرما کر علم حدیث کی گرانقدر خدمات انجام دیں۔ آپ کے علمی فیوض و برکات سے تقریباً تمام عالم اسلام مستفیض ہوا۔ آپ کے عہد زریں میں عباقر علماء اور کبار محدثین پیدا ہوئے۔ خود شاہ محمد اسحاق محدث دہلوی اور ان کے تلامذہ اور تربیت یافتہ حضرات علمی و تدریسی خدمات کے ساتھ تحریک آزادی وطن کے میدان میں بھی نمایاں و ممتاز نظر آتے ہیں۔ ان ولی اللہی مجاہدین نے انگریزوں کو ملک بدر کرنے کی جو انقلابی تحریک چلائی تھی۔ اسی تحریک کو بدنام کرنے کے لئے بعد میں غدر کے نام سے مشہور کر دیا گیا حالانکہ وہ تحریک جہاد آزادی تھی۔ جیسا کہ "تذکرہ علماء ہند" مطبوعہ کراچی میں تحریر ہے کہ

"یہ بات خاص طور پر قابل ذکر ہے کہ جنگ آزادی ۱۸۵۷ء میں حضرت

شاہ محمد اسحاق صاحب دہلوی کے اکثر شاگردوں نے بحیثیت علماء کے اس تحریک میں حصہ لیا جن میں مفتی عنایت احمد کاکوروی صدر امین بریلی مولانا عبدالجلیل کوئلی (علیگڈھ) مفتی صدرالدین آزردہ، شاہ ابوسعید مجددی (والد ماجد شاہ عبدالغنی مجددی) اور ان کے شاگردوں کے شاگرد یعنی علماء دیوبند مثلاً مولانا محمد قاسم نانوتوی، مولانا رشید احمد گنگوہی، مولانا محمد مظہر نانوتوی مولانا محمد منیر نانوتوی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

تذکرہ علماء ہند مطبوعہ کراچی ص ۴۰۹

بحوالہ تاریخ دارالعلوم دیوبند

۱۲۵۶ھ میں حضرت شاہ محمد اسحاق محدث دہلوی میدان جہاد سے واپسی اور ملکی حالات کے خراب ہو جانے کی وجہ سے ہندوستان سے، ہجرت فرما کر مکہ مکرمہ میں مقیم ہوگئے اور وہیں چند ماہ بعد انتقال فرمایا۔ اور مکہ مکرمہ ہی میں دفن ہوئے۔

شاہ مخصوص اللہ کا دور اہتمام

حضرت شاہ رفیع الدین رحمۃ اللہ علیہ کے عالی مقام صاحبزادوں میں سے شاہ مخصوص اللہ اور شاہ محمد موسیٰ نے بھی کچھ دنوں کیلئے مدرسہ شاہ عبدالعزیز کا انتظام و انصرام قبول فرمایا اور جب ان حضرات نے بھی داعیٔ اجل کو لبیک کہا تو مولوی شاہ محمد موسیٰ کے صرف ایک صاحبزادے میاں عبدالسلام باقی رہ گئے جو اس وقت بہت ہی صغر سن تھے اور ایک صاحبزادی رہ گئیں تھیں اور خاندان میں کوئی ایسا فرد نہ رہا جو میاں عبدالسلام کو پڑھاتا لکھاتا اور ان کی تربیت کرتا جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ وہ علوم دینیہ سے بے بہرہ ہوگئے۔ اس طرح ولی اللہی خاندان سے علم کا چراغ ہمیشہ ہمیش کے لئے بجھ گیا۔ البتہ شاہ ولی اللہ کے فکری و روحانی فرزندوں نے ولی اللہی علم و فکر کا چراغ روشن رکھا اور یہ علم و فن شاہ صاحب کے نسبی خاندان کے بجائے روحانی خاندان میں جاری و

ساری رہا اور ان کے اخلاف رشید پورے اکناف عالم میں ضو فشاں رہے ۔ اور انشاء اللہ رہتی دنیا تک ضو فشانی کرتے رہیں گے۔

مدرسہ شاہ عبدالعزیز کی تباہی

مدرسہ شاہ عبدالعزیز کے گرامی قدر فضلاء اور ممتاز مشائخ نے ۱۸۵۷ء کی تحریک میں نہ صرف یہ کہ زبردست حصہ لیا بلکہ درحقیقت یہ مدرسہ جہاد آزادی کے مرکز کی حیثیت رکھتا تھا۔ اسی بنا پر انگریزوں نے سب سے پہلے تحریک آزادی کے اسی مرکز مدرسہ شاہ عبدالعزیز کو اپنے ظالمانہ حملہ کا نشانہ بنایا اور اس مدرسہ شاہ عبدالعزیز کو تاخت و تاراج کر دیا اور اس طرح شاہ عبدالرحیم، شاہ ولی اللہ اور شاہ عبدالعزیز کی یادگار یہ مدرسہ ۱۸۵۷ء کے انقلاب کی نذر ہو گیا۔ مولوی بشیر الدین احمد لکھتے ہیں:

"یہ مدرسہ کسی زمانہ میں نہایت عالیشان اور خوبصورت تھا۔ اور بڑا دارالعلوم سمجھا جاتا تھا۔ غدر تک وہ اپنی اصلی حالت پر قائم رہا۔ غدر میں مکانات لوٹ لئے گئے۔ کڑی تختے تک لوگ اٹھالے گئے۔"

مولوی صاحب مزید لکھتے ہیں:

"اب متفرق لوگوں کے مکانات اس جگہ بن گئے ہیں، مگر یہ محلہ شاہ عبدالعزیز صاحب کے مدرسہ کے نام سے آج تک پکارا جاتا ہے۔"

علاقہ دریا گنج کے محلہ کلاں محل میں مسلم مجلس مشاورت کے دفتر سے تقریباً دو سو قدم اتر جانب آج بھی ایک گلی پر "گلی مدرسہ شاہ عبدالعزیز" کا بورڈ لگا ہوا ہے مگر اس گلی میں اب کوئی مدرسہ نہیں ہے۔ بلکہ مختلف لوگوں کے مکانات ہیں۔ کاش! کوئی اللہ کا بندہ اس مدرسہ شاہ عبدالعزیز کی نشاۃ ثانیہ کے لئے کمر ہمت باندھ کر اس گلی مدرسہ شاہ عبدالعزیز کے کسی ایک حصہ میں شاہ عبدالعزیز کے نام

پر کوئی دینی ادارہ قائم کر دیتا تاکہ صدیوں کی پیاسی زمین ولی اللہی علوم و معارف سے سیراب ہو جاتی۔ حکیم سید عبدالحئی والد ماجد مولانا علی میاں صاحب ۱۳۱۲ھ کو دہلی آئے تھے۔ اس وقت دہلی کے مشاہیر علماء سے آپ نے ملاقات کی اور دہلی کے قدیم دینی مدارس خاص طور پر مدرسہ شاہ عبدالعزیز دیکھنے گئے۔ حکیم صاحب اپنے سفر نامے میں لکھتے ہیں۔

"میاں سید نذیر حسین صاحب کے درس سے آنے کے بعد میں نے ارادہ کیا کہ حضرت مولانا و مولی الکل مقتدائے ارباب تمیز شاہ عبدالعزیز صاحب روّح اللہ روحہ کے مدرسہ کی زیارت کروں جس میں ہمارے بزرگوں نے یکے بعد دیگرے استفادہ کیا ہے اور جس کی خاکروبی کو فخر و سعادت سمجھا ہے۔

حضرت شاہ محمد واضح قدس سرہٗ حضرت شاہ ولی اللہ کے وقت میں تشریف لائے ان کے بعد شاہ ابو سعید صاحب مولوی محمد نعمان صاحب حضرت سید محمد معین صاحب یکے بعد دیگرے آئے۔ اس کے بعد شاہ عبدالعزیز صاحب کے وقت میں مولانا شاہ سید قطب الہدیٰ تشریف لائے ان کے بعد مولانا سید محمد اسحاق صاحب ان کے بعد مولانا سید احمد قدس اللہ اسرارہم آئے اور فائدہ حاصل کیا جس کو تمام عالم جانتا ہے۔"

دہلی اور اس کے اطراف ص۵۹

مدرسہ شاہ عبدالعزیز کا فیض

دارالعلوم دیوبند ہو یا مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔ دارالعلوم ندوۃ العلماء ہو یا جامعہ ملیہ اسلامیہ ان سب اداروں کے ـــــــــ موسسین و بانیین درحقیقت فیض ولی اللہی کے جرعہ نوش اور ان کی روحانی و علمی اولاد تھے اور ان کا مقصد حیات

ہی فیوض ولی اللہی کو عام کرنا اور اس کی روشنی میں اصلاح ظاہر و باطن کرنا تھا اور الحمد للہ کے بعض اداروں میں آج بھی اسی نہج پر اور اسی نصاب کے مطابق تعلیم دی جا رہی ہے اور اگرچہ اس دور انحطاط میں وہ کمال و تبحر علمی تو باقی نہیں ہے اور نہ رہ سکتا ہے مگر پھر بھی اس دور قحط الرجال میں یہی خاندان ولی اللہی کے روحانی و فکری وارث علماء و مشائخ ان ملی اداروں میں مصروف درس و تدریس ہیں اور ان ہی کے دم سے یہ دینی مراکز آباد ہیں۔

دیوبند اسکول اور علیگڈھ اسکول

دیوبند اسکول کے بانی حجۃ اللہ فی الارض مولانا محمد قاسم نانوتویؒ اور علی گڈھ اسکول کے موسس جواد الدولہ سرسید احمد خان تھے۔ یہ دونوں فکر ولی اللہی اور تحریک ولی اللہی کے علمبردار اور مبلغ تھے۔

دیوبند اور علی گڈھ اب یہ دونوں قصبہ یا شہر نہیں رہے بلکہ ایک ہی گھر سے نکلی ہوئی دو مختلف تحریکوں کا مرکز بننے کا ان کو شرف حاصل ہے۔ دنیائے اسلام کے عظیم مفکر مولانا عبید اللہ سندھی رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ:

"مدرسہ دیوبند کے بانی محمد قاسم صاحب اور علی گڈھ کالج کے موسس سرسید احمد خان دونوں فکر ولی اللہی سے متاثر اور منتسب تھے۔ دونوں کا سلسلہ تلمذ مولانا مملوک علی نانوتوی صاحبؒ سے تھا جو ایک واسطہ سے شاہ عبد العزیز صاحب کے شاگرد تھے۔

مولانا سندھیؒ مزید فرماتے ہیں:

"فکر ولی اللہی مشتمل تھا دو اجزاء پر ایک جزء تھا عقلیت اور دوسرا جزء سلف صالح کا تتبع ۱۸۵۷ء کی ناکامی اور مسلمانوں کے سیاسی اقتدار کے خاتمے پر جب مسلمانوں میں نئی زندگی کے آثار پیدا ہوئے اور

انھیں عملی شکل دینے کی کوششیں ہوئیں تو سرسید فکر ولی اللہی کے اس جز کو جس میں عقلیت مرجح اور مقدم تھی علی گڈھ لے گئے اور وہ جز جس میں سلف صالح کے تتبع پر زور تھا۔ مولانا محمد قاسم صاحب نے مدرسہ دیوبند کو اس کا محافظ بنایا"

مدرسہ دیوبند اور مطالبہ پاکستان

اکبرآبادی مسجد

ہندوستان کی سرزمین پر مسجد اکبر آبادی کو وہی حیثیت حاصل تھی جو آج اندلس کی سرزمین پر مسجد قرطبہ کو حاصل ہے۔ یہ اکبر آبادی مسجد کبھی خوبصورتی، دلکشی دلآویزی اور دلربائی میں اپنی نظیر آپ تھی۔ آج وہی پرشکوہ و پرجلال مسجد پیوند زمین ہو کر رہ گئی ہے اللہ کی پناہ!! اس تاریخی مسجد کو شاہجہاں کی رفیقہ حیات اعزازالنساءُ بیگم، عرف اکبر آبادی بیگم نے ۱۰۶۰ھ میں بمطابق ۱۶۵۰ء میں تعمیر کرائی تھی جس کے متعلق سرسید احمد خان مرحوم لکھتے ہیں:

"یہ مسجد دلکش، دلربا، فرحت بخش اور روح افزا، سر سے پاؤں تک سنگ سرخ کی تھی اور اس کے گرد مکانات اور طالب علموں کے رہنے کے لئے حجرے بنے ہوئے تھے۔ ضلع غربی سے ملحق کرسی دے کر مسجد بنائی ہے۔ اس مسجد کے تین برج اور سات در ہیں۔ مسجد کی عمارت ۶۳ گز لمبی اور سترہ گز چوڑی ہے۔ نری سنگ سرخ کی ہے، پیش طاق نرا سنگ مرمر کا نہایت پرچین کار ہے، اس کے آگے ایک چبوترہ سنگ سرخ کا ہے۔ کٹہرے دار ۶۳ گز لمبا اور ۷۵ گز چوڑا اور ساڑھے تین گز اونچا اس کے آگے سنگ سرخ کا ایک حوض ہے۔ مسجد کا صحن ایک سو چون گز لمبا اور ایک سو چار گز چوڑا ہے اور اس کے گرد طالبعلموں

کے رہنے کے لئے حجرے بنے ہوتے ہیں۔ مسجد کے دروازہ کتبہ سنگ موسیٰ کی پچی کاری سے کھدا ہوا ہے۔

"آثار الصنادید" مطبوعہ ۱۹۶۵ء دلی

موضح قرآن

مسجد اکبرآبادی وہی تاریخی مسجد ہے جس میں شاہ عبدالقادر محدث دہلویؒ سالہا سال مقیم رہے اور اسی دوران آپ نے موضح قرآن جیسی شہرہ آفاق تفسیر تحریر فرمائی اور قرآن کریم کے علمی نکات و لطائف کا دریا بہایا۔ حضرت شاہ عبدالقادر کی درسگاہ اور فرودگاہ کی وجہ سے اس مسجد کی عظمت وحرمت مزید بڑھ گئی ہے اور علمائے ہند کی عقیدت گاہ بن گئی ہے۔ شاہ عبدالقادر محدث دہلوی نے اکبرآبادی مسجد میں نہ صرف تصنیف وتالیف کا سلسلہ قائم رکھا بلکہ درس وتدریس کا مشغلہ بھی جاری رکھا آپ اکثر اوقات تصنیف وتالیف میں مشغول رہتے۔ اور اس سے فراغت کے موقع پر تشنگان علومِ نبوت کو علوم قرآن وحدیث سے سیراب فرماتے۔ طلبہ کا قیام بھی اکبرآبادی مسجد کے رہائشی حجروں میں (جو مسجد کے کنارے کنارے بنے ہوئے تھے)، رہتا تھا۔ اور شاہ عبدالقادر صاحب جیسے بحر علم وعرفان سے مستفیض ہوتے رہتے تھے۔

مولانا امداد صابری صاحب لکھتے ہیں۔

"اس مسجد میں جہاں عبادت الٰہی ہوتی تھی وہاں درس وتدریس کا سلسلہ جاری رہتا چنانچہ اس مسجد پر کتبہ لگا ہوا تھا۔ اس میں "طلبہ علم رسانند" بھی تحریر تھا۔ اس کے ایک کمرہ میں شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کے چھوٹے بھائی شاہ عبدالقادر نے پوری زندگی گزار دی اس میں وہ درس بھی دیتے تھے۔

دہلی کے قدیم مدارس اور مدرس ص۱۳۶

مجاہدین کا مرکز

مسجد اکبر آبادی مجاہدین آزادی کا مرکز بھی رہی ہے۔ مولانا سید احمد بریلوی[ؒ] اور مولانا محمد اسماعیل شہید[ؒ] کی تحریک کا آغاز اسی اکبر آبادی مسجد سے ہوا تھا۔ حضرت سید احمد شہید بریلوی جب دہلی آئے تو اسی تاریخی مسجد میں مقیم ہوئے اور شاہ عبدالقادر محدث دہلوی سے علمی و روحانی استفادہ کرتے رہے۔ اسی مسجد میں مولانا شاہ محمد اسماعیل[ؒ] جیسے مجاہد جلیل نے علوم و فنون کی کتابیں پڑھیں اور جہاد فی سبیل اللہ کا سبق لیا۔ اور اعلاء کلمۃ اللہ کیلئے اپنا آخری قطرہ خون بہا دینے کا فیصلہ کیا بالآخر مولانا سید احمد شہید[ؒ] اور مولانا محمد اسماعیل شہید[ؒ] نے بالاکوٹ صوبہ سرحد کی پہاڑیوں میں اپنوں اور دشمنوں کے ہاتھوں جام شہادت نوش فرمایا۔

اکبر آبادی مسجد کا محل وقوع

مسجد اکبر آبادی کے جائے وقوع کے متعلق مولوی بشیر الدین احمد دہلوی کا تحقیقی فیصلہ آخری فیصلہ ہے کہ یہ مسجد ایڈورڈ پارک موجودہ نیتاجی سبھاش چندر بوس پارک میں واقع تھی، جہاں ابھی تک زیر زمین مسجد کے آثار موجود ہیں، چند گز زمین کھودنے کے بعد آثار نظر آنے لگتے ہیں۔

مولوی بشیر الدین احمد دہلوی صاحب لکھتے ہیں۔

"محل وقوع اس کا موجودہ ایڈورڈ پارک ہے۔ جس وقت اس کے لئے زمین ہموار کی جانے لگی تو مسجد کا چبوترہ اور بنیادیں جوں کی توں مثل گنج نہاں کے زمین میں مدفون تھی۔ ویسے ہی ڈھک دی گئی۔ اور ہمیشہ ہمیش کے لئے خانۂ خدا اور بے نظیر عمارت نظروں سے پوشیدہ ہوگئی۔"

دلّی کے مشہور بزرگ مفتی حفیظ الرحمان واصف صاحب کی تحقیق نقل کی جاتی ہے جنھوں نے بڑی تحقیق و تفتیش کے بعد یہ بات واضح کی ہے کہ مسجد اکبر آبادی ایڈورڈ پارک موجودہ سبھاش چندر بوس پارک ہی میں تھی۔

مفتی صاحب واصف مرحوم تحریر فرماتے ہیں۔

"ایام طفولیت میں راقم الحروف نے سنا تھا کہ ٹھنڈی سڑک کے کنارے پر ایڈورڈ پارک میں وہ مسجد تھی جس میں حضرت شاہ عبدالقادرؒ نے علوم اسلامیہ کا درس دیا تھا۔ سقوط دہلی کے بعد انگریزوں نے اس شہر یعنی شاہ جہاں آباد پر ایسا غصہ اتارا کہ قلعہ کے اطراف کی آبادی اور محلات دور دور تک ملیا میٹ کر دیئے گئے۔ یہ مسجد بھی ڈھادی گئی۔ امام جامع مسجد شمس العلماء مولانا سید احمدؒ نے چیف کمشنر سے درخواست کی کہ کم از کم اس جگہ کا احاطہ کر دیا جائے تاکہ جانوروں کی آمد و رفت سے بے حرمتی نہ ہو چنانچہ احاطہ کر دیا گیا۔

اردو مصدر نامہ ص ۱۵

اکبر آبادی مسجد کی بربادی

۱۸۵۷ء میں لال قلعہ کے اطراف و اکناف کے رہنے والوں نے جنگ آزادی میں سرفروشانہ حصہ لیا۔ اکبر آبادی مسجد مجاہدین کا مرکز تھی ہی چنانچہ جب دہلی کی جنگ آزادی ۱۸۵۷ء میں ناکام ہو گئی اور انگریزوں نے دارالسلطنت پر قبضہ کر لیا تو انھوں نے ان مقامات کو جو بغاوت کے مراکز تھے تباہ و برباد کر دیا جس میں اکبر آبادی مسجد بھی شامل ہے۔ اکبر آبادی مسجد کے نزدیک کشمیری کٹرہ تھا جس میں زیادہ تر کشمیری لوگ مقیم تھے۔ گویا اکبر آبادی مسجد کا عرفی نام مسجد کشمیری کٹرہ ہو گیا تھا۔ مرزا غالب بھی مسجد کشمیری کٹرہ (اکبر آبادی مسجد) کی تباہی پر آہ و فغاں کرتے نظر آتے ہیں۔

خط میں لکھتے ہیں:

"مسجد کشمیری کٹرہ (مسجد اکبرآبادی) زمین کا پیوند ہو گئی اسٹرک کی وسعت دوچند ہو گئی۔ اللہ اللہ گنبد مسجدوں کے ڈھائے جاتے ہیں"

مکاتیب غالب

جوش کی پیشین گوئی

مشہور شاعر جوش ملیح آبادی آزادی وطن سے قبل لال قلعہ سے رکشا سے گزر رہے تھے۔ ایڈورڈ کا مجسمہ دیکھکر کہا تھا کہ ہمیں آزادی ملتے ہی تم کو اس طرح مسمار کر دیں گے اور ڈھادیں گے جیسا کہ تم لوگوں نے اکبرآبادی مسجد کو زمین بوس کر دیا ہے۔ جوش ملیح آبادی صاحب کی پیشینگوئی پوری ہوئی۔ آزادی ملتے ہی ایڈورڈ کا مجسمہ نکال پھینکا گیا اور اس جگہ مشہور قومی رہنما نیتاجی سبھاش چندر بوس کا مجسمہ نصب کر دیا گیا۔ اسی مجسمہ سے کچھ ہی دور دکھنی پورب جانب میں مسجد اکبرآبادی واقع تھی۔

اکبرآبادی مسجد کے آثار

مولانا محمد علی جوہر جب خلافت ہاؤس کوچہ چیلان میں مقیم تھے اور روز نامہ "ہمدرد" نکالتے تھے تو بلا ناغہ صبح کی نماز نیتاجی سبھاش چندر بوس پارک میں مسجد اکبرآبادی کے آثار پر پڑھتے تھے اور اس تاریخی مسجد کی تباہی و بربادی پر آہ و فغاں کرتے تھے اور مسجد کے آثار کی نشاندہی فرماتے تھے۔

تاریخ مہندیان

قبرستان مہندیان جہاں شیخ الاسلام حضرت امام شاہ ولی اللہ اور ان کے علمی خانوادے کے علاوہ علماء فضلاء اولیاء، صلحاء محدثین و مفسرین اور سیاسی زعماء آرام

فرما ہیں۔ یہ بقعۂ نور دلی کا دل نہیں بلکہ ہندوستان کا جنت البقیع کہلاتا ہے۔ بقول خواجہ حالیؔ مرحوم ؎

چپے چپے پہ ہیں یاں گوہر یکتا تہہ خاک
دفن ہوگا نہ کہیں اتنا خزانہ ہرگز

یہ ایک تاریخی صداقت ہے کہ ۱۸۵۷ء میں مکتب ولی اللہی کے جن علماء و مشائخ نے تحریک آزادی میں سرفروشانہ حصّہ لیا اور تحریک استخلاص وطن کی قیادت کی تھی انگریزوں نے ان علماء و مشائخ کے مراکز (جس میں مدرسہ رحیمیہ مدرسہ شاہ عبدالعزیز مدرسہ شاہ عبدالقادر مسجد اکبرآبادی شامل ہیں) کو نشانۂ ظلم وستم بنا کر تباہ و برباد کر دیا تھا اسی طرح ۱۹۴۷ء میں بھی جب ہندوستان آزاد ہو گیا تو ان مدفون مجاہدین آزادی پر نت نئے مظالم ڈھائے گئے کہ الاماں والحفیظ!

یہ واقعہ یہاں لائقِ ذکر ہے کہ گذشتہ سال ہندوستان کے مشہور ادیب اور ماہر غالبیات مالک رام صاحب مہندیاں تشریف لائے، موصوف کو مرزا مغل بیگ کی قبر کی تلاش تھی۔ مرزا مغل بیگ غالبؔ کی بہن کے دیور تھے۔

مالک رام صاحب نے راقم الحروف سے فرمایا چلیئے، ذرا مرزا مغل بیگ کی قبر کو تلاش کریں، مجھے ان کی قبر پر لگے ہوئے کتبہ سے کچھ نقل کرنا ہے۔ مالک رام صاحب نے راقم الحروف سے یہ بھی فرمایا کہ ان کی قبر حکیم مومن خاں مومنؔ کی قبر کے قریب ہی پائیں دیوار واقع ہے۔ راقم الحروف اور مالک رام صاحب مرزا کی قبر کی تلاش وجستجو میں تقریباً ایک گھنٹہ سے زائد ہی ادھر ادھر مارے مارے پھرتے رہے۔ لیکن مرزا مغل بیگ کی قبر نہ مل سکی۔

مالک رام صاحب نے مجھ سے فرمایا کہ ۱۹۴۷ء سے پہلے مرزا مغل بیگ کی قبر پر کتبہ لگا ہوا تھا۔ میں نے ۱۹۴۷ء سے پہلے دیکھا تھا۔ غالباً ۴۷ء میں مرزا کی قبر کو نقصان پہنچا دیا گیا۔ پھر مالک رام صاحب نے بڑی حسرت سے قرآن کریم کی

آیت " تلک الایام نداولها بین الناس " پڑھی۔

پھر ہم لوگ شہر خموشاں سے مایوس واپس آ گئے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ یہ حادثہ صرف مرزا کی قبر کے ساتھ ہی پیش نہیں آیا ہے بلکہ مہندیان میں بعض وزیروں اور کرنلوں کی بھی قبریں تھیں جو ۱۹۴۷ء میں مٹا دی گئیں اور ان ہی مٹی ہوئی قبروں میں سلطنت مغلیہ کے ایک وزیر کی بھی قبر تھی جس کو زہر دیکر ہلاک کر دیا گیا تھا۔ جوش ملیح آبادی نے گویا اسی موقع کیلئے کہا ہے ؎

جا گورِ عزیباں پہ نظر ڈال بہ عبرت
کھل جائے گی تجھ پر تری دنیا کی حقیقت
عبرت کے لئے ڈھونڈ کسی شاہ کی تربت
اور پوچھ کدھر ہے وہ تری شانِ حکومت
کل تجھ میں بھرا تھا جو غرور آج کہاں ہے؟
اے کاسۂ سر بول ترا تاج کہاں ہے؟

۱۹۴۷ء میں خاندان ولی اللہی کے مقدس مزارات کی بے حرمتی کی کہانی مفتی محمد ضیاء الحق صاحب دہلوی کی زبانی سنیئے :

تقسیم ملک کے اثر سے یہ درگاہ بھی محفوظ نہ رہ سکی۔ اور کچھ نہ سہی تو مزارات کی سنگ مرمر کی الواح اور احاطے کے جنگلے ہی توڑ کر لے گئے اور پھر ۷۱-۱۹۷۰ء میں حکومت کے بلڈوزر چلے۔ قبریں مسمار ہوئیں اور مردوں کی ہڈیاں تک نکال پھینکی گئیں۔ منصوبہ یہ تھا کہ اس وقف زمین کو اِروِن ہسپتال اور مولانا آزاد میڈیکل کالج کے حوالہ کر دیا جائے اور وہاں ڈاکٹروں کی رہائش کے لئے فلیٹس وغیرہ تعمیر کر دیئے جائیں۔ شیر میوات صاحب کے شدید احتجاج کے باوجود غصب کر کے فلیٹس بھی بنا دیئے اور کچھ وقف زمین دھوبیوں کو دے دی۔ باقی زمین

جو فی الحال بچی ہوئی ہے وہ بھی بہت کافی ہے۔ اور اس کے بچانے میں جناب علی محمد صاحب متولی درگاہ کو بہت قربانیاں، جانی اور مالی دینی پڑیں اور یہ ایک حقیقت ہے کہ صرف ان کی قربانیوں کی وجہ سے ہی یہ خطہ محفوظ رہا۔

اس تاریخی امر کا تسلیم نہ کرنا حق وصداقت کا خون کرنا ہے کہ قبرستان مہندیان کو اپنوں اور بیگانوں سے بچا کر پر رونق اور گل وگلزار بنانا۔ صرف عصر حاضر کے مرد مجاہد علی محمد شیر میوات متولی درگاہ شاہ ولی اللہ کا تن تنہا کارنامہ ہے یہ ایک ایسا تاریخی کارنامہ ہے کہ اگر شیر میوات صاحب اور کوئی کارنامہ انجام نہ دیتے تو بھی یہ روشن وتابناک کارنامہ ان کو تاریخ کے صفحات پر زندہ وتابندہ رکھنے کے لئے کافی تھا۔ حالانکہ شیر میوات صاحب کے ایسے بے شمار کارنامے ہیں جن پر مستقل لکھنے کی ضرورت ہے اور مستقبل کا مورخ ان پر بہت کچھ لکھ سکتا ہے۔

جامعہ رحیمیہ

علی محمد شیر میوات صاحب کی دیرینہ تمنا تھی کہ یہ ویران وسنسان جگہ پھر آباد ہو اور دوبارہ یہاں سے علم کے سوتے جاری ہوں اور آسودۂ لحد خاندان ولی اللہی کے علوم وفنون ان ہی کے جوار قدس میں جاری کئے جائیں۔ بالآخر ۶ رجب المرجب ۱۴۰۱ھ — ۱۱ مئی ۱۹۸۱ء کو حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند کے دست مبارک سے اس عظیم درگاہ ولی اللہی کا دوبارہ احیاء اور افتتاح عمل میں آیا۔ اور حضرت مہتمم صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اسکا نام جامعہ رحیمیہ تجویز فرمایا اور جامعہ رحیمیہ کی نہ صرف یہ کہ سرپرستی قبول فرمائی بلکہ جامعہ کے لئے ایک پُر مغز اپیل بھی تحریر فرمائی۔ یہ اپیل من وعن نقل ہے۔

نحمدہ ونصلی !

مزار ولی اللٰہی کے عین دامن میں واقع مدرسہ رحیمیہ دہلی جو ولی اللٰہی مکتب فکر کے مرکز اور حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے علوم کے امین کی حیثیت سے ابھر رہا ہے۔ الحمدللہ ـــــ علی محمد صاحب شیر میوات کی مخلصانہ کوششوں اور شب و روز کی جد وجہد سے روز افزوں ترقی پر ہے۔ گذشتہ چند سال میں اس مدرسہ کی علمی خدمات اور ہمہ جہت ترقیات قابل تحسین ہیں۔ حق تعالیٰ اس دینی مرکز کو مسلمانوں کے حق میں زیادہ سے زیادہ فیض رساں اور مفید بنائے۔ آمین

اہل خیر حضرات نیز عامۃ المسلمین سے میری پرزور درخواست ہے کہ وہ اپنی مالی اعانت سے اس مدرسہ کی تعمیر و ترقی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیں اور یہاں زیر تعلیم طلبہ کے لئے دل کھول کر امداد فرمائیں۔ فجزاکم اللہ خیرالجزاء۔

مخلص

دستخط (قاری) محمد طیب مہتمم دارالعلوم دیوبند

مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی مرحوم کا بھی جامعہ رحیمیہ سے کافی گہرا تعلق تھا۔ مرحوم شیر میوات صاحب کی مساعی جمیلہ سے بے حد متأثر تھے۔ حضرت مفتی صاحب آخر میں جب وہ صاحب فراش ہو گئے تھے تو بھی جامعہ رحیمیہ کے بارے میں راقم الحروف وغیرہ سے برابر استفسار فرماتے رہتے تھے حضرت مفتی عتیق الرحمٰن صاحب عثمانی مرحوم نے بھی ایک نہایت ہی اہم اپیل تحریر فرمائی ہے۔ اپیل ہدیۂ قارئین ہے۔

"مدرسہ رحیمیہ" دہلی ہندوستان کے ان چند اداروں میں سے رہا ہے، جس کے ذریعہ اسلام اور علوم اسلامیہ کی گرانقدر اشاعت ہوئی ہے۔ اسی درسگاہ کے ذریعہ حضرت الامام شاہ ولی اللہ دہلوی رح حضرت شاہ عبدالعزیزؒ اور دوسرے اکابر علماء نے علوم کو پوری دنیا میں پھیلایا ہے اور مدرسہ رحیمیہ دہلی سے بڑے بڑے علماء و اکابر نے کسبِ فیض کیا ہے۔ یہ زمانہ کا انقلاب تھا کہ وہ ادارہ ختم ہوگیا اور عرصہ تک اس کے احیاء اور تجدید کی کوئی کوشش نہ ہوسکی۔

آزادی وطن کے بعد مہندیان نئی دہلی کا وہ خطہ جہاں اکابر مدفون ہیں ان کے تحفظ کا مسئلہ ہی بڑا نازک تھا۔ خدا تعالیٰ نے میرے مخلص جناب علی محمد صاحب شیر میوات کو ہمت اور حوصلہ سے نوازا اور قبرستان مہندیان کے تحفظ کی گراں قدر خدمت ان سے لے لی۔ انھوں نے خلوص اور بڑی جدوجہد اور جذبہ کے ساتھ اس خطہ کو دست برد سے محفوظ رکھا جہاں مسلمانان ہند کی بڑی بڑی ہستیاں محوِ خواب ہیں پھر تدریجاً اس خطہ کو اپنی حکمت عملی سے بڑی آباد اور بارونق جگہ بنادیا۔

چند سال قبل انھوں نے جامعہ رحیمیہ قائم کرکے مدرسہ رحیمیہ کو زندہ کیا: الحمد للہ اب اس مدرسے نے خاصی ترقی کرلی ہے۔ مدرسہ کے کئی کمرے بن گئے ہیں۔ مسجد کی تعمیر ہوگئی ہے اور ایک بار پھر ویرانے میں بہار آرہی ہے۔ یہ جگہ ایسی ہے جہاں پہونچ کر قلب و نظر کو مسرت ہوتی ہے اور روحانی سکون ملتا ہے۔ نئی دہلی میں بزرگوں کی جگہ کو محفوظ رکھنا، اسے آباد کرنا اور دینی تعلیم کا مرکز بنادینا جناب علی محمد شیر میوات کا کارنامہ ہے۔ اللہ تعالیٰ انھیں اور ان کے رفقاء

کو جزائے خیر دے (آمین)

"جامعہ رحیمیہ" مہندیان ترقی کی راہ و مرحلہ سے گزر رہا ہے۔ اور اسے تعاون کی ضرورت ہے، اس لئے میری اپیل ہے کہ اس نیک اور اہم کام میں بھرپور تعاون دیا جائے اور خصوصی مالی معاونت کے ذریعہ اس کے تعمیری منصوبوں کو پورا کیا جائے۔

(دستخط مفتی) عتیق الرحمان صاحب عثمانی

۷ رجب ۱۴۰۲ھ

حضرت امیر شریعت مولانا منت اللہ صاحب رحمانی جنرل سکریٹری آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کا بھی جامعہ رحیمیہ اور شیر میوات صاحب سے بڑا مضبوط رشتہ ہے۔ حضرت امیر شریعت مدظلہ، نے شیر میوات صاحب کی جد وجہد اور جامعہ رحیمیہ کی ترقی سے خوش ہوتے ہیں۔ موصوف نے بھی ایک گرانقدر اپیل تحریر فرمائی ہے جو ہدیہ قارئین ہے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم
نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم۔

امابعد! آج حسنِ اتفاق سے جامعہ رحیمیہ نئی دہلی حاضری کا موقع ملا۔ یہ ادارہ ابھی نیا نیا قائم ہوا ہے۔ یہ جگہ بہت اہم اور تاریخی ہے۔ یہاں علماءِ ہند کے سرخیل حضرۃ الامام شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ سے لے کر حضرت مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمن رحمۃ اللہ علیہ تک آسودۂ خواب ہیں اور عرصہ تک یہ سرزمین علم و عمل کا مرکز اور علوم اسلامیہ کی اشاعت کا منبع رہی ہے۔ خوشی کی بات ہے کہ عرصہ کی ویرانی کے بعد پھر بہار آرہی ہے۔ اور خوش قسمتی کی بات یہ ہے کہ یہ سب علی محمد صاحب شیر میوات کی انتھک جد وجہد اور قربانیوں کا ثمرہ

ہے جو خود بڑے عزم اور حوصلہ کے آدمی ہیں۔ ادارہ کی عمر کم ضرور ہے مگر دیکھنے سے اندازہ ہوا کہ کچھ دنوں میں قامت وقیمت دونوں میں اس نے قابل لحاظ پیش رفت کی ہے۔ ادارہ کی عمارت کی تعمیر کا کام لانبا پروگرام ہے اور یہ کام جاری ہے۔ تکمیل کے بعد یہ مرکز (دہلی) میں بہترین تعلیمی ادارہ ثابت ہوگا۔ انشاء اللہ۔

دستخط (مولانا) منت اللہ رحمانی
امیر شریعت بہار و اڑیسہ (مونگیر)

ادوار اہتمام

موجودہ جامعہ رحیمیہ کے اصل بانی اور مؤسس جناب علی محمد شیر میوات صاحب ہی ہیں اور شیر میوات صاحب ہی جامعہ رحیمیہ کے روح رواں ہیں۔ لیکن انھوں نے اہتمام کی ذمہ داریوں سے ہمیشہ اپنا دامن بچایا ہے اور اہتمام کی ذمہ داریوں کے لئے ہندوستان کی مشہور و ممتاز شخصیتوں کا انتخاب فرماتے رہے ہیں۔ جامعہ رحیمیہ کے اہتمام کو تین ادوار میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ دور اول کے مہتمم حضرت مولانا مفتی محمد ضیاء الحق صاحب دہلوی تھے۔ مفتی صاحب بڑی باغ و بہار طبیعت کے انسان ہیں۔ موصوف قضیہ دارالعلوم دیوبند سے بہت متاثر تھے اور اکابر کی جمعیۃ العلماء ہند سے ہمیشہ متعلق رہے۔ مفتی صاحب ۱۱ رمئی ۱۹۸۱ء سے جولائی ۱۹۸۲ء تک منصب اہتمام پر فائز رہے، موصوف آجکل پاکستان میں مقیم ہیں۔

دوسرے دور کے مہتمم ہندوستان کے مشہور عالم دین اور مفسر قرآن حضرت مولانا اخلاق حسین قاسمی صاحب تھے۔ موصوف ۶ر شوال ۱۴۰۳ھ مطابق ۱۷ر جولائی ۱۹۸۳ء سے شوال ۱۴۰۸ھ مطابق مئی ۱۹۸۸ء تک اہتمام ذمہ داریوں کو سنبھالتے رہے۔ موصوف اب علمی و تحقیقی کاموں میں مصروف ہیں جو آپ کا اصل

میدان ہے۔ مولانا محترم کی تازہ تصنیف "مولانا آزاد کی قرآنی بصیرت" حال ہی میں منظر عام پر آئی ہے۔ یہ تصنیف علمی حلقوں میں بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھی جارہی ہے۔ موصوف میدان خطابت کے بھی شہسوار ہیں۔

تیسرے دور کے مہتمم حضرت مولانا فقیہہ الدین صاحب ہیں۔ حضرت مولانا فقیہہ الدین صاحب نے یکم صفر المظفر ۱۴۰۹ھ مطابق ۱۴ ستمبر ۱۹۸۸ء سے اہتمام سنبھالا ہے حضرت مولانا فقیہہ الدین صاحب ایک مخلص اور ایماندار عالم دین ہیں۔ موصوف کا سیاست سے بھی تعلق ہے۔ آپ مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کے مخلص رفیق کار بھی رہ چکے ہیں۔ آپ ایک طرف مسند اہتمام پر متمکن ہیں تو دوسری طرف مسند درس کو بھی زینت بخشتے ہوئے ہیں۔

مختصر حالات جامعہ

دلی کے مدارس میں جامعہ رحیمیہ کو یہ خصوصیت حاصل ہے کہ یہاں ابتدائی تعلیم سے لے کر دورۂ حدیث تک کی مکمل تعلیم ہوتی ہے اور طلبہ کی تعداد بھی اور مدارس کے مقابلے میں زیادہ رہتی ہے۔

لہٰذا، الحمد للہ امسال بھی ۱۸ طلبا رشریک دورۂ حدیث ہیں۔ ہر سال مختلف صوبوں کے تقریباً دو سو سے زائد طلبہ داخلہ حاصل کر کے قرآن کریم اور علوم اسلامیہ کی تعلیم میں مشغول رہتے ہیں۔ جامعہ رحیمیہ میں سولہ ولی اللہی فکر اساتذہ کرام نہایت جانفشانی اور علمی دیانتداری کے ساتھ درس و تدریس میں منہمک و مشغول رہتے ہیں۔

جامعہ رحیمیہ کی طرف سے طلبہ کو کھانا، ناشتہ اور علاج و قیام کی پوری سہولتیں دیجاتی ہیں اور معقول وظائف بھی دیئے جاتے ہیں۔ اور اس پر پوری کفایت شعاری کے باوجود نوے ہزار روپیہ ماہانہ خرچ ہوتا ہے جو خدا کے فضل و کرم اور بزرگوں کی دعاؤں اور اہل خیر حضرات کے مخلصانہ تعاون سے پورا ہوتا ہے۔ اور شیر میوات

صاحب کی جیب خاص سے بھی بڑی بھاری رقم صرف ہوتی ہے۔

شاہ ولی اللہ اکیڈمی

شاہ ولی اللہ اکیڈمی ـــــــــــــــ حضرت شاہ ولی اللہ اور ان کے خاندانی علوم و معارف کی اشاعت کے لئے قائم کی گئی ہے اور خدا کے فضل و کرم سے اکیڈمی کی طرف سے چند سالہ مختصر مدت میں چند اہم کتابیں شائع کی گئیں اور زیر نظر کتاب "الواح الصنادید" بھی شاہ ولی اللہ اکیڈمی کی طرف سے ہی شائع کیجارہی ہے۔ اس کتاب میں حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی اور ان کے جوار میں مدفون ممتاز شخصیتوں کا تعارف کرایا گیا ہے۔

احقر دارالعلوم دیوبند سے فراغت تعلیم کے بعد ۱۹۸۲ء سے ہی جامعہ رحیمیہ نئی دہلی کی تدریسی خدمات انجام دینے میں مصروف ہے اور اس کے ساتھ ہی لکھنے لکھانے کا سلسلہ بھی جاری رہتا ہے۔

تاریخ تو یاد نہیں لیکن حضرت مولانا حکیم محمد زماں حسینی صاحب رکن مجلس شوریٰ دارالعلوم دیوبند فاتحہ خوانی کیلئے مہندیان تشریف لائے۔ حضرت حکیم صاحب نے مجھ سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ "مولوی صاحب آپ قبرستان مہندیان کے مشاہیر پر ایک کتاب ترتیب دیدیں تو بڑا اہم اور تحقیقی کام ہوگا۔ حضرت حکیم صاحب کی بات میرے ذہن میں بیٹھ گئی۔

میں نے کئی بار حکیم صاحب کے حکم کی تعمیل کا ارادہ کیا لیکن اپنی بے بضاعتی اور دوسری مصروفیات کی وجہ سے اس اہم کام کی ہمت نہ کرسکا مگر چونکہ حضرت مولانا فقیہہ الدین صاحب کے ذہن میں حکیم صاحب کی بات جمی ہوئی تھی۔ مولانا نے مجھ سے فرمایا کہ آپ جلد از جلد یہ کام کردیں اور یہ کتاب شاہ ولی اللہ اکیڈمی سے شائع ہوجائے گی۔ مولانا فقیہہ الدین صاحب کے بار بار اصرار سے مجبور ہو کر قلم اٹھانا پڑا۔

الحمد للہ ایک سال کی محنت شاقہ کے بعد یہ کتاب تکمیل کو پہنچی — جو ہدیہ ناظرین ہے جس کا نام "الواح الصنادید" رکھا گیا ہے

مجھے اس حقیقت کے اعتراف میں کوئی تامل نہیں ہے کہ کتاب کا نام پاکستان کے مشہور مورخ پروفیسر محمد اسلم صاحب صدر شعبۂ تاریخ پنجاب یونیورسٹی سے مستعار لیا گیا ہے۔ اور یہ نام مولانا فقیہہ الدین صاحب کا تجویز کردہ ہے۔

پروفیسر محمد اسلم صاحب ہندوستان میں ہوتے تو اس کتاب پر ان ہی سے مقدمہ لکھوایا جاتا چونکہ پروفیسر محمد اسلم صاحب بھی ہندو پاک کے مزارات اور مقابر پر الواح الصنادید کے ہی نام سے برابر لکھتے رہتے ہیں۔

میرا حسین فریضہ ہے کہ میں جناب علی محمد شیر میوات متولی درگاہ شاہ ولی اللہ اور حضرت مولانا فقیہہ الدین کا شکریہ ادا کروں۔

مجھے یقین ہے اگر محترم شیر میوات صاحب کی غیر معمولی امداد اور مولانا فقیہہ الدین صاحب کی بے چینی شامل نہ ہوتی تو یہ کتاب اس قدر جلد منظر پر نہ آپاتی۔ اللہ تعالیٰ ان دونوں بزرگوں کو جزائے خیر عطا فرمائے اور ان کا سایۂ عاطفت ہمارے سروں پر تادیر قائم رکھے۔

حضرت مولانا سید محمد ولی صاحب رحمانی استاذ حدیث جامعہ رحمانی خانقاہ مونگیر کا شکریہ ادا نہ کرنا بڑی ناانصافی کی بات ہوگی کہ موصوف نے اپنی بے پناہ مصروفیات کے باوجود میری درخواست پر کتاب کے لئے ایک مبسوط مقدمہ تحریر فرما کر میری حوصلہ افزائی فرمائی۔ حضرت مولانا محمد اسماعیل صاحب بن عبدالحق صاحب مدنی استاذ جامعہ رحیمیہ اور مولانا محمد کلیم خان صاحب فیض آبادی استاذ جامعہ رحیمیہ کا بھی تہہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انھوں نے بعض مقامات پر مجھے نہایت ہی قیمتی مشورے دیئے اور مولانا محمد اسماعیل صاحب نے تو مسودہ دیکھنے اور کتابت کی تصحیح میں خاص طور پر بہت زیادہ مدد فرمائی جس کی بنا پر موصوف خصوصی شکریہ کے مستحق

ہیں۔ آخر میں قارئین کرام سے مودبانہ درخواست کرتا ہوں کہ اگر کتاب میں کسی قسم کی کوئی لغزش اور ادبی کمزوری نظر آئے تو از راہِ کرم مجھے مطلع فرمائیں تاکہ دوسرے ایڈیشن میں اس کی اصلاح کر دی جائے۔ واللہ المستعان

عطاء الرحمن قاسمی
استاذ جامعہ رحیمیہ
مہندیان میر درد روڈ نئی دہلی ۲

شیخ عبدالعزیز شکربار

حضرت شیخ عبدالعزیز شکر بار اپنے عہد کے جلیل القدر مشائخ چشت میں تھے۔ آپ کے آباؤ اجداد اُچہ ضلع ملتان کے رہنے والے تھے۔

شیخ طاہر رحمۃ اللہ علیہ ــــ شیخ عبدالعزیز شکر بار کے جد امجد تھے۔ شیخ طاہرؒ تحصیل علم کے شوق میں بہار اور ملک کے مختلف مشاہیر علماء و مشائخ سے فیض یاب ہوتے ہوئے جونپور پہنچ گئے۔ اس وقت جونپور علم و عرفان کا مرکز اور بڑے علماء و صلحاء کا مسکن تھا۔ آپ نے یہیں بود و باش اختیار کرلی۔ اور یہاں کے علماء سے اکتساب فیض کرنے لگے اور ایک وقت وہ آیا کہ آپ کا شمار بھی جونپور کے اجلۂ علماء میں ہونے لگا۔ جونپور کے دوران قیام ہی میں اللہ تعالیٰ نے آپ کو ایک فرزند ارجمند عطا فرمایا جس کا نام آپ نے حسن تجویز فرمایا جو اپنے باپ کی تربیت میں پروان چڑھ کر حسن ثانی بنے اور اپنے دور کے ممتاز عالم دین اور مشہور روحانی شیخ بن گئے۔

سلطان سکندر لودھیؒ آپ کے علم اور تقویٰ سے بہت متاثر تھا لہذا وہ آپ کا معتقد ہوگیا اور سکندر لودھیؒ کے بھائی بھی آپ سے بے پناہ عقیدت رکھتے تھے۔ مشہور ہے کہ سلطان سکندر لودھیؒ کے بھائیوں میں سے ایک شخص جس کے اندر حکمرانی کا شوق پیدا ہوگیا تھا اور وہ آپ کا مرید بھی تھا۔ ایک دن حضرت شیخ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اور عرض پرداز ہوا کہ حضرت

شیخ دعا فرما دیں تاکہ مجھے دہلی کی سلطنت حاصل ہو جائے۔ حضرت شیخ حسن نے صاحبزادہ محترم کو اس پاگل پن سے منع کیا اور فرمایا کہ اگر اللہ تعالیٰ اپنی حکمت سے تم میں سے کسی ایک کی ترقی چاہتا ہے تو تو اس سے تعارض مت کر اور خدا جس کو ترقی فرما دے تو بھی اسی کا اطاعت شعار ہو جا۔ شیخ کی نصیحت نے اس پر اثر کیا۔ اور طلب جاہ سے تائب ہو گیا۔ اور جب یہ خبر سلطان سکندر لودھی کو ہوئی تو ان کی بزرگی کا اور معتقد ہو گیا اور دہلی میں آپ کے وجود کو باعث خیر و برکت سمجھا اور آپ سے دہلی تشریف آوری کی درخواست کی۔

لہذا آپ مع اہل خانہ سکندر لودھی کی استدعا پر دہلی تشریف لائے۔ شیخ حسن طاہرؒ کو اللہ تعالیٰ نے دو صاحبزادے مرحمت فرمائے تھے۔ شیخ خیالی اور شیخ عبدالعزیز شکربارؒ۔ یہ دونوں اپنے دور کے ولی و عارف باللہ تھے۔ شیخ خیالی نے مدینہ منورہ میں سالہا سال عبادت کی اور پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے کشفی اشارہ پر ہندوستان واپس آ گئے۔

ولادت باسعادت

شیخ عبدالعزیز شکربار کی پیدائش ۹۰۷ھ میں جونپور میں ہوئی تھی آپ ابھی ڈیڑھ سال کے ہی تھے کہ والد بزرگوار آپ کو اپنے ہمراہ دہلی لے آئے۔ اور اپنی خصوصی توجہات سے آپ کی تربیت فرمائی اور علوم ظاہری کی تحصیل و تکمیل کے لئے حاجی عبدالوہاب بخاری رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے صاحبزادہ میر سید محمدؒ کے سپرد فرمایا۔ ان دونوں استاذوں نے جن کا شمار ملک کے متبحر علماء میں ہوتا تھا۔ اپنے فیوض علمی سے اس ہونہار شاگرد کو خوب سیراب کیا اور اس سعادت مند شاگرد نے بھی اپنے کامل اساتذہ سے بھرپور استفادہ کیا اور تمام علوم

ظاہری میں مہارت تامہ حاصل کر لی۔ اس کے بعد علوم باطنی کی طرف متوجہ ہوئے اور علم طریقت کی تحصیل و تکمیل اپنے والد کے خلیفہ میاں قاضی خان ظفر آبادی رحمۃ اللہ علیہ سے کر کے شیخ کامل کا مقام حاصل کیا۔ شیخ عبدالعزیز شکر بارؒ کا شمار میاں قاضی ظفر آبادیؒ کے مخصوص مریدین اور مجازین میں ہوتا تھا۔

گلزار اردو صفحہ ۳۱۱ پر لکھا ہے کہ:

"شیخ عبدالعزیزؒ خلیفہ میاں قاضی خان کے ہیں۔ متاخرین مشائخ چشتیہ میں مشہور رہیں۔ علوم شریعت و طریقت کے عالم تھے۔ بچپن ہی سے ریاضتہائے شاقہ میں رہے یہاں تک کہ مرتبہ مشیخت کو پہنچے۔ ابتدائے عمر سے آخر عمر تک جو اوراد اپنے ذمہ لازم کر لئے تھے کبھی ان کو فوت نہ ہونے دیا۔ مشائخ کے اتباع اور حفظ قواعد و آداب میں یگانۂ عصر، تواضع، حلم، رضا، تسلیم، شفقت اور اعانتِ فقراء میں بے مثل تھے، غرضیکہ اپنے زمانہ میں مشائخ چشت کی یادگار تھے۔ دہلی میں ان کی وجہ سے ارشاد و مشیخت کا سلسلہ قائم رہا۔"

شیخ عبدالعزیز شکر بار بزرگوں کی نظر میں

شیخ عبدالعزیز شکر بار مشائخ چشتیہ میں عظیم المرتبت بزرگ تھے شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ "اخبار الاخیار" میں لکھتے ہیں کہ:

"شیخ اپنے زمانے میں مشائخ چشت کی یادگار تھے۔ اور اخلاقِ حسنہ مثلاً تواضع، حلم، صبر و رضا، خلقِ خدا پر شفقت اور عنایت فقراء میں اپنی نظیر نہ رکھتے تھے۔"

شیخ الاسلام حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ لکھتے ہیں کہ:

"شیخ عبدالعزیز محتاجوں کی حاجت روائی میں بڑی کوشش کرتے تھے۔ جب وہ شیخ قاضی خان کے پاس پہنچے تو اپنا مال و متاع، گھوڑا

گاڑی جو کچھ اپنے پاس تھا، سارے کا سارا راہِ خدا میں تقسیم کر دیا۔"
(رود کوثر ص۷)

شیخ اکرام لکھتے ہیں :

" اکبر کے ابتدائی زمانے میں شیخ عبدالعزیز شکر بار چشتی کو بڑا قبول عام حاصل ہوا۔ بیرم خان ان کا معتقد تھا۔ اور دوسرے امرائے اکبری بھی ان کی خدمت میں حاضر ہو کر اخذِ فیض کرتے تھے۔ عوام میں آپ بحرالمواج اور شکر بارؒ کے عرف سے مشہور تھے۔
(رود کوثر ص۱۷)

شاہ عبدالرحیمؒ سے خاندانی رشتہ

شیخ عبدالعزیز شکر بار سے شاہ ولی اللہ کا خاندانی رشتہ تھا۔ آپ حضرت شاہ عبدالرحیم دہلویؒ کے نانا تھے۔ شاہ ولی اللہ صاحب انفاس العارفین میں لکھتے ہیں کہ :

" ایشاں جد اعلیٰ والد بزرگوار انداز جہت والدہ ایشاں"

یعنی یہ شاہ عبدالرحیم کے نانا تھے۔

مولانا مناظر احسن گیلانی مرحوم نے لکھا ہے کہ :

" شاہ عبدالرحیمؒ صاحب کے مرشد خلیفہ ابو القاسمؒ جو آگرہ میں رہتے تھے اور شاہ صاحب بھی ان دنوں آگرہ ہی میں تھے خلیفہ صاحب نے شاہ صاحب کو حکم دیا کہ شاہ عظمت اللہ نامی بزرگ کے پاس جا کر حاضری دو جو سلسلۂ طریقہ چشتیہ کے ایک کہنہ سال، معمر ترین بزرگ اس زمانہ میں آگرہ میں تھے۔ مرشد کے بار بار اصرار کے بعد آخر ایک دن شاہ عبدالرحیمؒ عظمت اللہ شاہ صاحب کے پاس حاضر ہوئے۔ وہ بیمار تھے۔ پلنگ پر

لیٹے لیٹے باتیں کرتے رہے، بسلسلہ گفتگو میں شاہ عبدالرحیم صاحب نے اپنا خاندانی رشتہ "شیخ عبدالعزیز شکر بار" سے ظاہر کیا۔ معاً عظمت اللہ شاہ صاحب یہ سنتے ہی پلنگ سے زمین پر آگئے اور شاہ عبدالرحیم صاحب کو گلے سے لگایا، پھر شاہ صاحب سے ایک سوال کیا، شاہ صاحب نے اس کا جواب دیا، شاہ صاحب کا جواب سننے کے بعد عظمت اللہ شاہ صاحب نے یہ قصہ سنانا شروع کیا کہ۔۔۔۔

میرے دادا صاحب کو شیخ عبدالعزیز شکر بار نے وصیت فرمائی تھی اور کچھ تبرکات دیئے تھے اور کہا تھا کہ میری بیٹی کی اولاد میں سے اگر کوئی تمہارے پاس آکر فلاں سوال کا فلاں جواب دے تو میرے یہ تبرکات اس تک پہونچا دینا۔ یہ تبرکات دادا کے زمانہ سے اس وقت تک ان کی وصیت کے مطابق محفوظ چلے آرہے ہیں۔ شاہ عظمت اللہ نے فرمایا کہ چونکہ اس سوال کا صحیح جواب تم نے دیدیا اس لئے وصیت پوری کرنے کا وقت آگیا، یہ کہہ کر شاہ عبدالرحیم[ؒ] صاحب کے سر پر انھوں نے عمامہ باندھا اور اپنے طریقہ کی اجازت عطا فرمائی اور جب چلنے لگے تو کچھ مٹھائی اور نقد روپئے بھی عنایت کیے۔ شاہ عبدالرحیم صاحب وہاں سے ان سب چیزوں کو لئے ہوئے اپنے مرشد ابو القاسم[ؒ] کے پاس پہونچے اور مٹھائی اور روپئے خلیفہ صاحب کے آگے رکھدیئے اور پورا ماجرا بیان کیا۔ بہ بشاشت قلبی تلقی کردند اور آخر میں خلیفہ ابوالقاسم[ؒ] نے شاہ عبدالرحیم صاحب کو یہ بشارت سنائی۔

نقد اشارت بہ جمعیت ظاہر و عمامہ اشارت بہ اجازت و جمعیت باطن۔

روپیہ تو ظاہر حال کے اطمینان اور فراغبالی کی طرف اشارہ ہے اور عمامہ باطنی اطمینان اور فراغبالی اور اجازت کا اشارہ ہے۔

تذکرہ حضرت شاہ ولی اللہ صـ۲۰۱

توحید وجودی

یہ حقیقت ہے کہ حضرت شیخ عبدالعزیز شکر بار پر توحید وجودی کا غلبہ تھا۔ حضرت خواجہ باقی باللہ اور حضرت شاہ عبدالرحیم محدث دہلوی بھی توحید وجودی کا ذوق آشنا تھے۔ دراصل ان حضرات پر حضرت شیخ عبدالعزیز شکر بار رحمۃ اللہ کا روحانی اثر تھا۔

شیخ عبدالعزیز شکر بارؒ سے خواجہ باقی باللہ اور شاہ عبدالرحیمؒ دونوں ہی ذہنی اور روحانی طور پر بہت ہی متاثر تھے۔ یہ بھی ایک تاریخی واقعہ ہے کہ حضرت خواجہ باقی باللہ، حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی اور حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی آپ کے مزار کی جاروب کشی کیا کرتے تھے۔

شیخ محمد اکرام نے شیخ عبدالعزیز شکر بارؒ کے متعلق بڑا ہی قیمتی جملہ لکھا ہے کہ .....

> "پر یہ بزرگ شیخ عبدالعزیز شکر بار دہلوی ہیں جنھیں عوام میں شہرت حاصل نہیں ہوئی لیکن جن کا ذکر خواص کی روح کو تازگی بخشتا ہے۔"
>
> (رود کوثر ص ۱۷)

تصنیف وتالیف

شیخ عبدالعزیز شکر بارؒ صوفی منش و درویش صفت انسان تھے۔ اصلاح قلب و تزکیۂ نفس آپ کا خاص مشغلہ تھا جس کی طرف آپ ہمہ تن متوجہ تھے۔ لہٰذا تصنیف و تالیف نہ آپ کا موضوع تھا نہ اس کے لئے آپ کو فرصت تھی مگر اس عدیم الفرصتی کے باوجود آپ نے کئی اہم کتابیں تصنیف فرمائیں جن میں سب سے اہم شیخ امان پانی پتی کے رسالہ "غیریہ" کے جواب میں آپ

کا رسالہ "عینیہ" ہے اور آپ کی دوسری اہم تصنیف "آداب السلوک" ہے جو تصوف و سلوک کے اہم نکات و دقائق پر مشتمل ہے یہ دونوں کتابیں راقم کی نگاہ سے اب تک نہیں گزری ہیں۔

اولاد

حضرت شیخ عبد العزیز شکر بارؒ کے صاحبزادوں میں سب سے بڑے شیخ قطب العالم تھے۔ شیخ قطب العالم ہی بعد میں آپ کے نسبی و روحانی جانشین ہوئے۔ یہ اپنے دور کے ممتاز بزرگوں میں تھے۔

شیخ قطب العالم کا مزار شیخ عبد العزیز شکر بار کے مزار کے سرہانے، مسجد سے باہر تھا اور شیخ عبد العزیز شکر بارؒ کے مزار کی داہنی جانب شیخ شکر بارؒ کے ایک صاحبزادے اور بائیں جانب اہلیہ کی قبر تھی اور پائینتی کی جانب مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی کی ساس کی قبر ہے۔ شیخ شکر بار کے علاوہ آپکے خاندان کی تمام قبریں بے نشان ہوگئیں ہیں۔

شیخ قطب العالم کے صاحبزادے شیخ رفیع الدین محمدؒ تھے جن کی صاحبزادی سے شیخ وجیہہ الدین شہید کی شادی ہوئی۔ ——— شیخ عبد الحق محدث دہلوی، شیخ قطب العالم کے متعلق لکھتے ہیں کہ:

> "وہ عالم و فاضل، صاحب اخلاق حمیدہ و اوصاف پسندیدہ صدق و استقامت کا قدم والد کے (شیخ عبد العزیز شکر بار) سجادہ پر رکھ کر اوقات کو طاعت و عبادت میں مصروف رکھتے ہیں۔"

(اخبار الاخیار، اردو، ص۲۹۷)

مزار اقدس

اردن ہسپتال اور مولانا آزاد میڈیکل کالج سے ـــــــ قبرستان مہندیان میں داخل ہوتے ہی ایک قدیم مسجد نظر آتی ہے۔ جو اب "مکی مسجد" کے نام سے مشہور و معروف ہے۔ جو پہلے مسجد شکر بار اور جنوں کی مسجد کے نام سے مشہور تھی۔ ۱۹۵۹ء میں الحاج علی محمد شیر میوات متولی درگاہ شاہ ولی اللہ نے "مکی مسجد" نام دے کر مولد النبی صلی اللہ علیہ وسلم سے حسین رشتہ قائم فرمادیا۔ اس تاریخی مسجد کے صحن میں بے شمار قبریں ہیں جن میں سب سے ممتاز و نمایاں قبر شیخ عبدالعزیز شکر بارؒ کی ہے۔ مکی مسجد احاطہ قبرستان مہندیان میں داخل ہے۔ ہندوستان کے مشہور مورخ مرزا سنگین بیگ مرحوم نے سیر المنازل میں مدلل لکھا ہے کہ شیخ عبدالعزیز شکر بار کی قبر مہندیاں میں ہے۔ مرزا سنگین بیگ کے لفظوں میں سنیئے۔

"ومکانات معروف بہ مہندیان کہ مقبرہ شاہ عبدالعزیز شکر بار وغیرہ وقبرستان شاہ ولی اللہ صاحب والد ماجد حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب سلمہ اللہ تعالیٰ مع مزارات مولوی رفیع الدین و مولوی عبدالقادر صاحب رحمتہ اللہ علیہ واقع ومکان جیل خانہ محبوسان مجوزہ صاحب عدالت فوجداری۔"

یہاں مکانات ہیں جو مہندیوں کے نام سے معروف ہیں اس میں شیخ عبدالعزیز شکر بار کا مقبرہ ہے۔ حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب سلمہ اللہ تعالیٰ کے والد ماجد شاہ ولی اللہ صاحب کا قبرستان ہے۔ اس میں مولوی رفیع الدین اور مولوی عبدالقادر صاحب رحمتہ اللہ علیہ کے مزارات ہیں یہاں فوجداری عدالت کے مجوزہ قیدیوں کا جیل خانہ

ہے۔

وفات

شیخ عبدالعزیز شکر بار ۶ر جمادی الثانی ۹۷۵ھ بعمر ۶۸ سال "فسبحان الذی بیدہٖ ملکوت کل شیٔ والیہ ترجعون" پڑھتے ہوئے جان جان آفریں کی سپرد کی۔

شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے ان کی وفات کا قطعہ تاریخ کہا ہے:

ؔ شیخ کامل، عارف دوران خود عبدالعزیز — آنکہ میداد اہل دل را مجلس یاد از بہشت

ہرچہ از اوصاف اہل اللہ در عالم بود — حق تعالیٰ زاول فطرت بذات او سرشت

یادگار اہل چشت او بود در دوران خود — گشت از آن تاریخ فوتش یادگار اہل بہشت

۹۷۵ھ

شاہ عبدالرحیم محدث

ساتویں صدی ہجری میں چنگیز خان نے اسلامی ممالک پر زبردست حملہ کیا۔ اور مسلمانوں کی آپسی خلفشار و باہمی رسہ کشی سے فائدہ اٹھاکر تاتاری فوج مشرق سے نکل کر تمام ایشیائی اسلامی ممالک پر چھاگئی، اسی پُرآشوب دور میں مسلم ممالک کی ابتری اور تاتاری فتنہ کے غلبہ سے تنگ آکر بڑے بڑے روحانی مشائخ اور صاحب درس و افتار علمار نے ہندوستان کی طرف رخ کیا۔ اور اسی دور (ساتویں، آٹھویں صدی ہجری) میں شیخ الاسلام حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے اجداد و اسلاف میں سے شیخ شمس الدین مفتی ہندوستان آئے اور رُہتک میں مقیم ہوئے۔ شیخ شمس الدین مفتی چونکہ یکتائے روزگار اور مشہور زمانہ عالم دین اور صاحب تقوی بزرگ تھے۔ لہذا شاہانِ ہند نے شیخ کی آمد کو مغتنم سمجھتے ہوئے شیخ کے شایان شان استقبال کیا اور حکومت میں قضار و افتار کے مناصب جلیلہ پر فائز کیا اور یہ سلسلہ کئی پشتوں تک جاری رہا اور کئی پشتوں کے بعد شیخ محمودؒ نے علم و تصوف کے ساتھ جہاد بالسیف کو بھی اختیار فرمایا۔ لہذا شیخ الاسلام حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے دادا شیخ وجیہہ الدینؒ شہید نے اسی مناسبت سے راہ حق میں جام شہادت نوش فرماتے ہوئے داعی اجل کو لبیک کہا۔ ان کے بعد ان کے صاحبزادے حضرت شاہ عبدالرحیمؒ محدث دہلوی نے اپنے خاندان کا رخ پھر خالص علم و فضل کی طرف پھیر دیا کیونکہ

اس وقت قوم مسلم کو جہاد بالسیف سے زیادہ جہاد بالعلم کی ضرورت تھی۔ اور یہ قدرت کی مصلحت بھی تھی کیونکہ اب قدرت کو اس خاندان سے وہ کام لینا تھا جس کے لئے قدرت اسے ہندوستان میں لائی تھی۔ اور صدیوں سے اس خاندان کے اندر مجاہدانہ عزائم واعمال اور روحانی علمی فضل وکمال کی پرورش من جانب اللہ کی جارہی تھی۔ خاندان ولی اللہی کا مختصر تعارف ص۳

ولادت باسعادت

حضرت شاہ عبدالرحیم دہلوی کی پیدائش سنہ ۱۰۵۴ھ - سنہ ۱۶۴۴ء میں دہلی میں ہوئی، آپ کے والد ماجد کا اسم گرامی شیخ وجیہہ الدین تھا۔ وہ صاحب دعوت وعزیمت اور مجاہدانہ عزم وارادہ کے انسان تھے۔

شاہ عبدالرحیمؒ نے قرآن مجید اور صرف ونحو کی ابتدائی کتب والد محترم حضرت شیخ وجیہہ الدین شہید سے پڑھیں جس سے آپ نو برس کی عمر میں فارغ ہوگئے اس کے بعد آگرہ میں جہاں شاہ شیخ وجیہہ الدین شہیدؒ بہ سلسلۂ ملازمت مقیم تھے۔ اورنگ زیب عالمگیرؒ کے استاذ مرزا زاہد ہرویؒ سے معقولات اور علم کلام کی کتابیں پڑھیں۔

جیساکہ مولانا علی میاں صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ:

"شاہ عبدالرحیم صاحب چھوٹے رسائل سے شرح عقائد اور حاشیہ خیالی تک اپنے برادر بزرگ شاہ ابوالرضا محمد سے پڑھے، بقیہ کتابیں مرزا زاہد ہرویؒ سے پڑھیں (شاہ عبدالرحیم صاحبؒ خود فرماتے تھے کہ میں نے) شرح مواقف اور اصول کی ساری کتابیں مرزا زاہد سے پڑھیں ان کی مجھ پر خصوصی توجہ تھی۔ یہاں تک کہ اگر میں کسی دن کہتا کہ آج میں نے مطالعہ نہیں کیا ہے تو فرماتے کہ ایک دو سطر پڑھ لو۔ تاکہ ناغہ نہ ہو۔"

اور کچھ عرصے حضرت خواجہ باقی باللہ کے صاحبزادے حضرت خواجہ خوردؒ سے بھی فیض حاصل کیا اور ان سے حاشیہ خیالی کے مشکل مقامات میں رجوع کیا اور تشفی ہوئی حضرت خواجہ خوردؒ، خواجہ حسام الدین کے خلیفہ اور اس زمانے میں سلسلۂ نقشبندیہ کے باخدا درویش اور باکمال صوفیوں میں آپ کا شمار ہوتا تھا۔
اور جب آپ گیارہ سال کے ہوئے تو فقہ اور حدیث کی کتابیں پڑھنی شروع کیں اور تھوڑے ہی عرصے میں علوم قرآن وحدیث میں غیر معمولی مہارت حاصل کر کے کمال پیدا کر لیا۔

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ اپنے والد محترم کے بارے میں فرماتے ہیں۔

"میں نے ایک شخص کو بھی نہیں دیکھا کہ جو عام علوم میں عموماً اور فقہ وحدیث میں خصوصاً ان جیسا تجربہ رکھتا ہو۔"

انفاس العارفین ص ۱۴۰

مدرسہ رحیمیہ

لہٰذا شاہ عبدالرحیم محدث دہلویؒ کا شمار ہندوستان کے ممتاز علماء، فقہاء اور محدثین میں ہونے لگا وہ اپنے دور کے بلند پایہ عالم دین، متبحر محدث اور یگانۂ روزگار فقیہہ تسلیم کیے جانے لگے۔ یہی وجہ ہے کہ جب آپ نے علوم قرآن وحدیث اور فقہ کی تعلیم واشاعت کی خاطر آج سے تقریباً تین سو سال قبل ایک دینی درسگاہ کی بنیاد ڈالی تو ہند و بیرون ہند کے ہزار ہا تشنگان علوم نبوی جوق در جوق اس مرکز رحیمی کی طرف اپنی علمی تشنگی دور کرنے کے لئے دوڑ پڑے
یہ تاریخی مدرسہ رحیمیہ ______ پھتہ شیخ نرور میں قائم تھا۔
جہاں یہ خاندان ولی اللہی عرصہ دراز تک چشمہائے علوم نبوت سے دنیا کو سیراب

کرتا رہا مگر جس کو نیرنگی تقدیر ہی کہیئے کہ اب یہ سرچشمۂ علم و ہدایت مہندیان اور قبرستان مہندیان کے نام سے مشہور ہے۔ جہاں اب عرصہ دراز کے بعد جامعہ رحیمیہ کے نام سے ایک معیاری دار العلوم ہے۔

بہرحال حضرت شاہ عبدالرحیم صاحبؒ کا خاص انداز تربیت تھا جس میں آپ تعلیم و تعلّم کے ساتھ تربیت اخلاق اور تزکیۂ نفس پر بھی خصوصی توجہ فرماتے اور اس کو اس طرح اپنے رنگ میں رنگتے کہ جب طالب علم شریعت اور طریقت کی تعلیم مکمل کرتا اور شاہ صاحب اس کو اجازت درس و بیعت و ارشاد مرحمت فرماتے تو سند میں پورے اعتماد کے ساتھ یہ الفاظ تحریر فرماتے۔

"فمن صحبه فکانه صحبنی ویده کیدی فمن بایعه فکانه بایعنی

(انفاس رحیمیہ ص۲۴)

استغناء اور دنیا سے بے رغبتی

شاہ عبدالرحیم محدث دہلویؒ فطرۃً خاموش طبع اور گوشہ نشیں قسم کے انسان تھے۔ آپ نام و نمود اور جاہ طلبی سے متنفر رہتے اور بچپن ہی میں دنیا سے اس قدر بے رغبت ہو گئے تھے کہ خود تو حصول زر یا حصول مناصب کی سعی درکنار اگر کوئی بزرگ بھی کوئی ایسا وظیفہ اور عمل بتلانا چاہتے جس سے دنیا کا کوئی مقصد وابستہ ہوتا تو اس کی طرف قطعاً متوجہ نہیں ہوتے تھے اور فرما دیتے تھے کہ مجھے اس کی حاجت نہیں۔

بیعت و ارادت

حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب، حضرت خواجہ باقی باللہ کے صاحبزادے خواجہ خوردؒ سے والہانہ عقیدت و محبت رکھتے اور ان کی خدمت بابرکت میں

نہایت ہی پابندی سے حاضر ہو کر سلسلۂ عالیہ نقشبندیہ میں اکتسابِ فیض فرماتے رہتے کیونکہ حضرت خواجہ خوردؒ اپنے باکمال عارف باللہ والد کی طرح خود بھی واصل الی اللہ شیخ طریقت بزرگ تھے۔ ان سے بیعت کی درخواست کی تو خواجہ صاحب نے طرز اکابر کے مطابق اپنی کم مائیگی اور دوسروں کو اپنے سے اعلیٰ سمجھنے کے احساس کے ساتھ نہایت مخلصانہ طور پر مشورہ دیا کہ حضرت سید آدم بنوریؒ کے خلفاء اور مجازین میں سے کسی سے تعلق ارادت قائم کر لو جس پر حضرت شاہ صاحب نے عرض کیا کہ ہمارے علاقے میں تو حضرت آدم بنوریؒ کے خلفاء میں حافظ سید عبداللہ صاحب رہتے ہیں۔ اس پر خواجہ خوردؒ نے بہت خوش ہو کر فرمایا کہ وہ تو بہت بڑے صاحب نسبت بزرگ ہیں اور ان کا وجود بہت غنیمت ہے۔ لہذا جلد ان سے بیعت ہو جاؤ۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ:-

"خواجہ خوردؒ کے فرمانے کا مجھ پر ایسا اثر ہوا کہ بلا تاخیر سید صاحب کی خدمت میں بے تابانہ حاضر ہوا۔ اور بیعت کی درخواست کی اور انھوں نے بھی بغیر کسی تذبذب کے پہلی گزارش پر اس طرح مجھے بیعت فرمایا جیسے کہ ان کو خواجہ صاحب کے اس ایماء کا منجانب اللہ الہام ہو گیا ہو۔ اور اگرچہ حضرت خواجہ کے حکم کے مطابق تعلق سید صاحب کے ساتھ قائم ہو گیا تھا مگر میں دونوں بزرگوں حضرت خواجہ خورد اور حافظ سید عبداللہ کی خدمت میں برابر حاضر ہوتا رہتا اور ان کے فیوض و برکات سے مستفیض ہوتا تھا۔"

حافظ سید عبداللہ صاحب صاحبِ کشف بزرگ تھے۔ آپ کی خصوصی توجہات برابر اس عاجز پر منعطف رہتی تھیں۔ ایک دفعہ حافظ صاحب نے

فرمایا کہ:

"تم بچہ تھے اور بچوں میں کھیل رہے تھے، میری طبیعت کی تمہاری طرف کشش ہوئی۔ میں نے دعا کی کہ خدا اس بچہ کو اولیاء میں شامل فرما، اور اس کا کمال میرے ہاتھ سے ظاہر ہو۔ الحمد للہ کہ اس دعاء کا ثمرہ ظاہر ہوا۔"

(انفاس العارفین ص۱۱)

اس بیعت کو زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ شاہ صاحب کے سلسلہ طریقت کی تکمیل سے پہلے ہی سید صاحب کا وصال ہوگیا۔ لہذا شاہ صاحب نے اپنے پیر و مرشد حافظ سید عبد اللہؒ کے وصال کے بعد راہ سلوک کی تکمیل کیلئے شیخ ابو القاسم اکبر آبادیؒ سے بیعت و ارادت کا سلسلہ قائم کیا اور راہ سلوک کی تکمیل فرماکر شیخ ابو القاسم اکبر آبادیؒ سے ہی بیعت و ارشاد کی اجازت حاصل کی۔ شیخ ابو القاسم اکبر آبادی بھی شاہ صاحب سے بے پناہ تعلق رکھتے تھے اور شاہ صاحب کی جانب خصوصی توجہ فرماتے تھے اور اس کی خاص وجہ شاہ صاحب کی ذاتی صلاحیتوں کے علاوہ شاہ صاحب کا شیخ عبد العزیز شکربارؒ سے نسبی تعلق بھی تھا۔

فلسفہ ولی اللّٰہی کی اساس

شاہ عبد الرحیم محدث دہلوی اگرچہ اپنے نامور اور فخر روزگار صاحبزادہ شاہ ولی اللہؒ کی طرح شہرہ آفاق نہ بن سکے اور وہ خود شاہ ولی اللہؒ کے والد کی حیثیت سے زیادہ پہچانے گئے مگر یہ بھی ایک واقعی اور ناقابل انکار حقیقت ہے کہ شاہ ولی اللہؒ کا تمام فضل و کمال اور قبولیت عام ان کے والد بزرگوار شاہ عبد الرحیمؒ کی تعلیم و تربیت کے رہین منت ہیں خصوصاً فلسفہ ولی اللّٰہی کے

اصول ثلاثہ (یعنی متن قرآن مجید کو اصل قرار دینا اور وحدۃ الوجود کی صحیح اور صاف تشریح اور علوم اسلامیہ میں حکمت عملی کو خاص اہمیت دینا جن اصول ثلاثہ کی بنا ء پر علمی اور مذہبی دنیا نے شاہ ولی اللہ کو خاص اور منفرد مقام عطا فرمایا، ان تینوں کی خصوصی تعلیم شاہ صاحب کو شاہ عبدالرحیم صاحب نے ہی دی تھی۔ بلکہ بڑی اہمیت کے ساتھ ان اصول پر شاہ صاحب کی تربیت بھی فرمائی تھی۔ جیساکہ مفکرِ اسلام مولانا عبیداللہ سندھیؒ تحریر فرماتے ہیں کہ:

"شاہ ولی اللہ کی فکری تربیت اور ان کی علمی اساس میں ہم ان کے والد شاہ عبدالرحیم صاحب کو اصل مانتے ہیں، شاہ عبدالرحیم نے خود اپنے نامور صاجزادے کو تعلیم دی تھی۔ چنانچہ انھوں نے شاہ ولی اللہ کو قرآن کا ترجمہ تفسیروں سے الگ کر کے پڑھایا اور اس طرح قرآن کا اصل متن ان کے لئے قابل توجہ بنایا، پھر آپ نے وحدۃ الوجود کے مسئلے کو صحیح طریقے پر حل کیا۔ اور اسے اپنے صاجزادے کے ذہن نشین کیا۔ نیز شاہ عبدالرحیم صاحب ہی نے حکمت عملی کو اسلامی علوم میں ایک باوقار اور اہم مقام دیا اور اپنے صاجزادے شاہ ولی اللہ کو اس کی خاص طور سے تلقین کی۔ الغرض یہ تین چیزیں قرآن کے متن کو اصل جاننا وحدۃ الوجود کا صحیح حل اور اسلامی علوم میں حکمت عملی کی غیر معمولی اہمیت شاہ ولی اللہ کے علوم میں بنیادی حیثیت رکھتی ہیں اور یہ تینوں کی تینوں شاہ عبدالرحیم کی تربیت کا نتیجہ ہیں۔

شاہ ولی اللہ اور ان کا فلسفہ، مصنفہ مولانا عبیداللہ سندھیؒ
مطبوعہ سندھ ساگر اکیڈمی، لاہور صہ ۱۲

اہم کارنامہ

حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب کا ایک خصوصی اور اہم کارنامہ یہ بھی ہے کہ ہندوستان میں درس حدیث کا سلسلہ آپ نے ہی شروع فرمایا ورنہ آپ سے قبل ہندوستان میں درس حدیث کا کوئی چرچہ نہ تھا چنانچہ حیات ولی کے مصنف لکھتے ہیں۔

"ہندوستان میں جس معزز اور بزرگوار نے سب سے پیشتر حدیث کے درس و تدریس کی بنیاد ڈالی اور جس مشہور محدث نے اس غریب علم کے شائع کرنے اور پھیلانے میں کوشش بلیغ کی وہ ——— شاہ عبدالرحیم تھے۔"

شاہ صاحب کا فقہی مقام

شاہ عبدالرحیم اپنے عہد کے فخر روزگار فقیہہ اور عبقری مجتہد تھے۔ آپ کے فقہی استدلالات میں اجتہادی رنگ غالب ہوتا تھا۔ موصوف صرف فقہ حنفی ہی پر نہیں بلکہ مذاہب اربعہ کے فقہی جزئیات پر بڑی گہری نگاہ رکھتے تھے۔ لیکن آپ بنیادی طور پر فقہ حنفی کے مقلد تھے۔ البتہ بعض جزئیات میں وقتاً فوقتاً دوسرے مسالک فقہ میں کسی مسلک پر بھی عمل کر لیتے تھے، جس کا حق آپ جیسے متبحر عالم کو دیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ تحریر فرماتے ہیں کہ:

"والد کا عمل اکثر امور میں مذہب حنفی کے موافق تھا۔ لیکن بعض مسائل میں حدیث کے مطابق یا اپنے وجدان سے کسی دوسرے مذہب فقہی کو بھی ترجیح دیتے تھے۔" انفاس العارفین ص ۸۳

فتاویٰ عالمگیری کی تدوین میں شاہ صاحب کا نمایاں حصّہ

شاہ عبدالرحیم محدث دہلوی کا نام فتاوی عالمگیری کی تدوین و ترتیب میں سرفہرست تھا۔ لیکن آپ اس سرکاری خدمت کو زیادہ دن نباہ نہ سکے جس کی وجہ شاہ ولی اللہ صاحب اپنے الفاظ میں بیان کرتے ہیں کہ:

"اس (تدوین) زمانہ میں عالمگیرؒ کو اس کتاب کی ترتیب و تدوین کا بڑا اہتمام تھا۔ مُلّا نظام (افسر رشتۂ تدوین) روزانہ ایک صفحہ بادشاہ کے سامنے پڑھا کرتے تھے۔ ایک دن انھوں نے وہ حصّہ پڑھا جو مُلّا حامدؒ کے سپرد تھا۔ انھوں نے ایک ہی مسئلہ کے متعلق دو کتابوں کی دو متفرق عبارتوں کو جمع کرکے عبارت میں گنجلک پیدا کر دی تھی۔ شاہ عبدالرحیم صاحب (جو ان کے دوست تھے) کی نظر جب اس مقام پر پڑی تو اس کی تحقیق کی معلوم ہوا کہ دو کتابوں کی مختلف المعنی عبارتیں جمع کر دی ہیں۔

آپ نے مسودہ کے ساتھ حاشیہ پر عربی کی عبارت لکھ دی کہ:

"من لم یتفقہ فی الدین قد خلط فیہ ھذا غلط وصوابہ کذا"

(یعنی تفقہ نہ ہونے کی وجہ سے یہاں خلط مبحث ہو گیا ہے صحیح یوں ہے۔)

مُلّا نظام نے متن کی عبارت کے ساتھ شاہ عبدالرحیم صاحب کا حاشیہ بھی پڑھ دیا۔ وہ تو روانی میں پڑھتے گئے۔ لیکن بادشاہ جو پوری توجہ سے سنتے تھے۔ چونک پڑے اور فرمایا "ایں عبارت چیست؟ ملّا نظام گھبرائے کہ انھوں نے اس کا مطالعہ نہیں کیا تھا پھر سنبھل کر کہا کہ میں نے اس مقام کا مطالعہ نہیں کیا تھا۔ کل تفصیل سے اس کا مطلب عرض کر دوں گا۔ گھر آئے تو مُلّا حامدؒ سے

شکایت کی کہ میں نے یہ حصہ تمہارے اعتماد پر چھوڑ دیا تھا۔ تمہاری وجہ سے مجھے بادشاہ کے سامنے خفت اٹھانی پڑی۔ ملا حامد نے تو اس وقت تو کچھ نہیں کہا۔ شاہ صاحب سے اس کی شکایت کی شاہ صاحب نے کتابیں کھول کر ان کو دکھایا کہ عبارت میں خلل اور انتشار پیدا ہو گیا ہے۔
اس سے بعض معاصرین اور رفقار کو حسد پیدا ہوا اور شاہ صاحب کچھ عرصہ اس کام میں شریک ہونے کے بعد اس سے علیحدہ ہو گئے۔"

تاریخ دعوت و عزیمت ص۸۵ بحوالہ انفاس العارفین ص۲۴

اس واقعہ سے جہاں شاہ عبدالرحیم صاحب محدث رح کی دقت نظر، اور وسعت مطالعہ اور تفقہ فی الدین کا اندازہ ہوتا ہے وہیں اورنگ زیب عالمگیر رح کا فقہی ذوق نکھر کر سامنے آتا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ عالمگیر صرف ایک بادشاہ ہی نہیں ایک بہترین فقیہہ اور صاحب علم و فضل شخص بھی تھے۔ امور سلطنت کی غیر معمولی مصروفیات کے باوجود فقہی مسائل کو اس قدر انہماک اور استغراق کے ساتھ سننا اور غلطی پر بر وقت چونکنا اور قاری کو متنبہ کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ اس شہنشاہ کو علوم اسلامیہ پر بھی گہری نظر تھی۔

شاہ صاحب عالمگیر کی نگاہ میں

شہنشاہ ہندوستان اورنگ زیب عالمگیر رحمۃ اللہ علیہ شاہ عبدالرحیم صاحب محدث دہلوی کی بڑی قدر کرتے تھے اور ملاقات کا اشتیاق رکھتے تھے۔ لیکن آپ کے زہد و ورع اور استغنا کا یہ عالم تھا کہ آپ شہنشاہِ وقت سے ملنے کبھی نہیں جاتے تھے۔ بقول خواجہ میر درد رحمۃ اللہ علیہ

نہیں مذکور شاہوں کا بیاں یہ کچھ اپنی محفل میں
اگر کچھ ذکر بھی آیا تو ابراہیم ابن ادھمؒ کا

حتیٰ کہ ایک بار عالمگیر رحمتہ اللہ علیہ نے شوق ملاقات کا پیام آپ کے پاس بھیجا مگر آپ نے ملنے سے انکار کر دیا۔ اور ایک معمولی کاغذ پر جس میں آپ کا جوتا لپٹا ہوا تھا یہ عبارت لکھکر شہنشاہِ ہندوستان کے پاس بھیجدی۔

"اہل اللہ کا اس پر اجماع ہے کہ وہ فقیر بہت بُرا ہے جو کسی امیر کے آستانہ پر ہو، حق سبحانہٗ تعالیٰ فرماتا ہے۔" دنیاوی زندگی کا سرمایہ بہت ہی قلیل ہے" تم کو اس کا بھی قلیل ترین جزء ملا ہے اگر بالفرض اس میں سے مجھے بھی دو گے تو وہ جزء لایتجزیٰ ہوگا اس ٹکڑے کے لئے میں اپنے نام کو خداوند تعالیٰ کے دفتر سے کیوں کٹواؤں۔

مشائخ چشت کے ملفوظات میں مذکور ہے کہ جس کا نام بادشاہوں کے دفتر میں لکھ لیا جاتا ہے۔ حق تعالیٰ کے دفتر سے اس کا نام کٹ جاتا ہے۔"

شاہ ولی اللہ محدثؒ "انفاس العارفین" میں اس خط کو نقل کر کے تحریر فرماتے ہیں کہ عالمگیر کو جب رقعہ ملا تو اس نے اپنی جیب میں رکھ لیا اور جب کپڑے بدلتا تو اس کو اہتمام کے ساتھ پھر جیب میں رکھ لیتا اور فرصت کے وقت اس کو پڑھ کر روتا تھا۔

شاہ عبدالرحیم اور شیخ اکبر

شاہ عبدالرحیم صاحب شیخ محی الدین بن عربیؒ (شیخ اکبر) صاحب فتوحات مکیہ کے بڑے معتقد و مداح تھے۔ شیخ محی الدین بن عربیؒ اپنے عہد

کے جلیل القدر عارف باللہ اور ممتاز فلسفی اور صوفی تھے۔ ان کی عالمانہ اور عارفانہ باتیں بعض اکابر کے لئے باعث غلط فہمی ہوئیں۔ راقم الحروف نے شیخ اکبر کی شہرہ آفاق تصنیف "فتوحات مکیہ" حکیم الاسلام قاری محمد طیب ؒ مہتمم دارالعلوم دیوبند کے ذاتی کتب خانہ میں دیکھی ہے۔ یہ کتاب کبھی حکیم الاسلام کے زیر مطالعہ رہ چکی ہے۔

قابل الذکر بات یہ ہے کہ کوئی صفحہ ایسا نظر سے نہیں گزرا جس پر حضرت رحمۃ اللہ علیہ کا تشریحی نوٹ نہ ہو۔ کاش! یہ تشریحی فوائد شائع کر دیئے جاتے تو شیخ اکبرؒ کے سلسلے میں بہت سی غلط فہمیاں دور ہو جاتیں جن کی وجہ سے ہندستان کے علمی حلقوں میں بھی شیخ اکبرؒ معتوب ہیں۔ اللہ جزائے خیر دے حضرت حکیم الامت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کو انھوں نے شیخ اکبر کے بعض خیالات کی نہایت منصفانہ وعادلانہ تشریح وتوضیح کر کے شیخ اکبر کو علمی حلقوں میں ایک عارف باللہ صوفی کی حیثیت سے متعارف کرایا۔ بہرحال میں یہ ذکر کر رہا تھا کہ شاہ عبدالرحیم صاحب شیخ اکبر کے بڑے مداح تھے۔ شاہ ولی اللہ صاحب نے لکھا ہے کہ:

> "حضرت والد ماجد شیخ محی الدین بن عربی کی بہت تعظیم کرتے تھے اور فرماتے تھے کہ اگر میں چاہوں تو فصوص کو بر سر منبر بیان کر کے تمام مسائل کے اثبات کے لئے آیات واحادیث سے دلائل پیش کر دوں! اور اس انداز سے بیان کروں کہ کسی کا شک باقی نہ رہے مگر اس کے باوجود آپ وحدۃ الوجود کے کھلم کھلا بیان سے احتراز فرماتے تھے۔ کیونکہ اس دور کے اکثر لوگ اس کے سمجھنے کی اہلیت نہیں رکھتے اور نا سمجھی کی بنا پر الحاد اور زندقے کے بھنور میں پھنس جاتے ہیں" انفاس العارفین صفحہ ۱۸۲

عجیب و غریب واقعات

شاہ عبدالرحیم دہلوی صاحب صاحبِ حال اور صاحبِ کشف بزرگ تھے۔ آپ کے تصرفات، مکاشفات اور کرامات کے بے شمار واقعات ہیں۔ ان واقعات کا ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

شاہ ولی اللہ صاحب لکھتے ہیں کہ

"سننے میں آیا ہے کہ ایک دن مخدومی شیخ ابوالرضا محمد کی مجلس میں توجہ اور تاثیر کی بات چل پڑی۔ رات کا وقت تھا تیز ہوا چل رہی تھی۔ چراغ روشن کرنے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ حضرت والد صاحب نے فرمایا کہ نگاہیں چراغ پر مرکوز رکھو۔ قدرت کے عجیب کرشمے مشاہدے میں آئیں گے۔ چراغ کو پیالے میں رکھ کر لے آئے۔ حضرت والد صاحب چراغ کی طرف متوجہ ہوئے۔ جب حضرت نے پوری دلجمعی کے ساتھ توجہ ڈالی تو پیالہ بھی چراغ سے ہٹا دیا گیا۔ چراغ خوب جل اٹھا اور اس کے شعلے میں آندھی کے اثر کی کوئی لپک نہ تھی۔"

انفاس العارفین ص ۱۲۷

شاہ ولی اللہ صاحب نے دوسرا واقعہ لکھا ہے کہ

" والد صاحب نے فرمایا ایک مرتبہ علاقہ میں بارش نہ ہوئی لوگوں نے میری طرف رجوع کیا اور دعا چاہی۔ میں نے دعا مانگی تو بوندا باندی شروع ہو گئی۔ میں نے کہا کہ موسلا دھار بارش کا نہ ہونا ہماری دیواروں کی کمزور لیپا پوتی کی وجہ سے ہے۔ گویا تدبیر خداوندی ہماری دیواروں کے گرانے سے احتراز کر رہی ہے

لوگ جلدی سے گارا بنا کر لائے اور ہماری دیواروں کی لپائی شروع کر دی۔ فوراً موسلا دھار بارش شروع ہو گئی۔

انفاس العارفین ص۱۳۳

شاہ عبدالرحیم صاحب کی چیخ و پکار

مغل شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر کے وصال کے بعد ہی سلطنت مغلیہ پر ادبار و زوال کا آغاز ہو گیا تھا۔ شاہ عبدالرحیم دہلویؒ صاحب السیف والقلم عالم دین تھے۔ وہ اپنی فراست ایمانی اور سیاسی بصیرت کی بناء پر دیکھ رہے تھے کہ مسلم سلطنت کو زوال و ادبار سے بچانے کا اب صرف ایک ہی طریقہ ہے کہ امراء اور سلاطین میدان جہاد میں کود پڑیں اور دشمنان اسلام کا ڈٹ کر مقابلہ کریں، شاہ عبدالرحیم صاحب نے اسی مقصد کی خاطر آصفیہ خاندان کے بانی نظام الملک آصف جاہ کو جو خط لکھا تھا وہ ایک تاریخی حیثیت رکھتا ہے۔

وزیر الممالک، آصف جاہ کی طرف جہاد کا شوق دلانے کے لئے لکھا گیا۔

بجانب وزیر الممالک، آصف جاہ	اس نقیر کی خاطر عاطر پر یہ منکشف
در تحریص جہاد تحریر یافت	ہوا کہ عالم ملکوت میں یہ امر طے
بر خاطر عاطر ایں نقیر واضح شد	شدہ ہے کہ کفار ذلیل و خوار ہوں
کہ در ملکوت مقرر شدہ کہ کفار	اور کچھ زمانے میں باغی رسوا و خراب
ذلیل و خوار شوند و بعد ازاں	ہوں۔ اب اگر شوکت مآب
یک چند مدت باغیان رسوا و خراب	(آصف جاہ) ان گمراہوں کی لعنت
گردند۔ واگر آں شوکت	میں کمر ہمت باندھیں تو یہ سارے

اما ب بریں ملاعین کمر ہمت بر بندند۔ ایں ہمہ منسوب بایشاں شود و تمام عالم مسخر ایشاں گردد و سبب رواج ملت و استقامت دولت ایشاں باشد۔ سعی قلیل خواہد بود و فوائد جلیل۔ و اگر سعی نکنند۔ ایں جملہ بخود بہ حوادث سماویہ ہلاک و مضمحل گردند۔ دریں صورت ایں معنی بایشاں منسوب نہ گردد۔

کارنامے ان سے منسوب ہوں گے تمام عالم ان کا مسخر ہوگا اور یہ کام رواج ملت اور ان کی دولت کے استحکام کا باعث ہوگا (اس معاملے میں) سعی قلیل سے بھی فائدہ جلیل ہوگا اور اگر آپ کوشش نہ کریں گے۔ تب بھی کفار حوادث سماوی سے ہلاک اور مضمحل ہوجائیں گے۔ لیکن اس صورت میں کارنامے ان کے گنے نہ جائیں گے۔

کار زلف تست مشک افشانی اما عاشقان
مصلحت را تہمتے بر آہوئے چین بستہ اند

اے (محبوب) مشک کی خوشبو پھیلانا تمہارے زلف کا کام ہے لیکن عاشقوں نے کسی مصلحت کی وجہ سے چین کے ہرن پر تہمت لگائی ہے۔

چوں ایں معنی منقح و موکد معلوم است لہذا، بآں عزیز القدر بے اختیار نوشتہ مے شود وقت را غنیمت دانند و در جہاد اعدار اللہ

چونکہ یہ امر یکی طرح معلوم تھا۔ اس لئے بے اختیار اس عزیز کو لکھا گیا۔ وقت کو غنیمت سمجھیں اور جہاد کے معاملہ میں سستی یا دیر نہ کریں۔ تھوڑی دیر کے بعد سب چیزیں واضح ہوجائیں

تقاعد و تغافل کار فرما نشوند بعد چندیں کار واضح نخواہد شد۔ چوں اظہار اتم مطلوب نبود و دوستی و خیر خواہی دامن گیر از مبالغہ احتراز رفت و سخنے ازیں فاش تر تصور نمی شد۔

گی چونکہ ایک چیز کا اظہار مطلوب تھا۔ اور دوستی اور خیر خواہی دامن گیر ہے۔ اس لئے مبالغہ سے پرہیز کیا گیا اور اس سے زیادہ فاش تر لکھا نہیں جا سکتا۔

گوئے توفیق و کرامت درمیان افگندہ اند
کس بمیداں در نمے آید سواراں راچہ شد

توفیق و کرامت کا گنبد درمیان میں ڈال دیا گیا ہے پھر بھی کوئی شخص میدان میں نہیں آتا، آخر شہسواروں کو کیا ہو گیا ہے۔

سخنے کہ با محرمان خود در پردہ ادا مے کردیم ایں جا بے پردہ نوشتہ شد، تا عذر نماند۔"

وہ باتیں جو محرموں سے بھی پردہ میں کہی جاتی تھیں یہاں بے پردہ لکھی گئی ہیں تاکہ کوئی عذر نہ رہے۔"

والسلام والاکرام

رود کوثر ص۵۴۵

شعر و شاعری

شاہ عبدالرحیم محدث دہلوی ایک متبحر عالم اور محدث ہوتے کے ساتھ ایک بلند پایہ شاعر بھی تھے۔ مگر آپ کے اشعار میں بھی تصوف کا ہی رنگ جھلکتا تھا۔ آپ نے فارسی اور ہندی میں اپنی شاعری کے کچھ نمونے چھوڑے ہیں۔ جن میں سے چند اشعار ہدیہ ناظرین کر رہا ہوں جس سے آپ کے ذوق کی ستھرائی اور آپ کا قادرالکلام شاعر

ہو تا معلوم ہو سکے۔

گر تو راہ حق بخواہی اے پسر! خاطر کس را مرنجان الحذر

در طریقت رکن اعظم رحمت است ایں چنیں فرمود آں خیر البشر

شاہ صاحب لکھتے ہیں کہ والد صاحب ایک مرتبہ نماز ظہر کے بعد اس فقیر کی طرف متوجہ ہوئے اور فی البدیہہ یہ رباعی پڑھی اور فرمایا قلم ودوات لاؤ اور لکھ لو کیونکہ حق سبحانہ تعالیٰ نے یہ شعر اچانک میرے دل پر القاء کر دیا ہے۔ تاکہ تجھے ان کے ذریعہ وصیت کروں۔ پھر اشارہ سے فرمایا کہ یہ بہت بڑی نعمت ہے جس کا شکر لازم ہے۔ یہ رباعی بھی حضرت کے پاکیزہ خیال کا مرقع ہے ؎

اے کہ نعمت ہائے تو از حد فزوں شکر نعمت ہائے تو از حد بروں

عجز از شکر تو باشد شکر ما گر بود فضل تو مارا رہنموں۔

ہندی کا دوہا

شاہ صاحب اپنے مکاتیب میں بڑے سلیقے سے ہندی اشعار درج کیا کرتے تھے کیونکہ شاہ صاحب اپنے ملک کی زبان پر بھی کامل عبور رکھتے تھے، لہٰذا یہ ہندی دوہا بھی شاہ صاحب کی طرف منسوب ہے ؎

جب جیو نہ تھا تب پیو نہ تھا اب پیو ہے جیو ناتھ

رحیم پیا سوں یوں ملے جوں بوند سمندر ناتھ

انفاس العارفین ص۱۷۸

تصنیفات یا مکاتیب

شاہ عبدالرحیم صاحب علم وحدیث و قرآن پر مہارت تامہ کے ساتھ فارسی زبان وادب کے بھی ممتاز مکتوب نگار اور بلند مرتبت مصنف تھے۔ "انفاس رحیمیہ" آپ کے ہی مکتوبات وملفوظات کا مجموعہ ہے جس کو شاہ اہل اللہ صاحب نے مرتب کیا ہے۔ یہ مکاتیب صاف شستہ اور رواں دواں اسلوب میں لکھے گئے ہیں۔ ان مکاتیب کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ شاہ صاحب کا انداز بیاں بے حد جاذب اور دلکش ہے اور چونکہ ان میں سے بیشتر خطوط مریدوں اور معتقدوں کو لکھے گئے ہیں۔ اس لئے ان میں تصوف اور معرفت کے رموز انتہائی آسان اور عام فہم انداز میں بیان کئے گئے ہیں۔ یہ "مجموعۂ مکاتیب" جامعہ رحیمیہ کی لائبریری میں موجود ہے۔

انفاس العارفین کے علاوہ شاہ صاحب شیخ تاج سنبھلیؒ کے عربی رسالہ کا فارسی زبان میں ترجمہ کیا ہے۔ اور شاہ صاحب نے اپنے استاذ ومربی میر زاہد ہروی کی اقامت ومعیت میں کئی اہم عربی کتابوں پر حواشی بھی لکھے ہیں۔

ارشاد رحیمیہ

شاہ عبدالرحیم صاحب نے اپنے شاہکار مکاتیب کے علاوہ ایک اور مفید اور یادگار تصنیف چھوڑی ہے وہ ہے "ارشاد رحیمیہ در طریق حضرات نقشبندیہ"، جیسا کہ عنوان سے ظاہر ہے کہ اس میں نقشبندیہ سلسلہ کے بنیادی اشغال واوراد اور شجرہ اسلافِ نقشبندیہ کا بیان ہے۔

نکاح واولاد

شاہ عبدالرحیم دہلوی کا پہلا نکاح شاہ وجیہہ الدین شہیدؒ کی زندگی میں ہوا۔ پہلی اہلیہ سے صرف ایک صاحبزادے صلاح الدین پیدا ہوئے۔ جو کچھ بڑے ہو کر انتقال کر گئے۔ دوسرا نکاح کبر سنی میں شیخ محمد پھلتی کی صاحبزادی سے ہوا۔ جن سے دو صاحبزادے پیدا ہوئے۔ شاہ ولی اللہ اور شاہ اہل اللہ۔

وفات

شاہ عبدالرحیم صاحب فرخ سیر بادشاہ کے عہد میں بعمر ۷۷ سال بروز چہار شنبہ ۱۲ ار صفر ۱۱۳۱ھ میں وفات پائی۔ شاہ عبدالرحیم صاحبؒ اپنے سلبی اخلاف شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ، شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ شاہ رفیع الدین دہلویؒ، شاہ عبدالقادر دہلویؒ، شاہ عبدالغنیؒ اور خاندان ولی اللّٰہی کے دوسرے افراد کے ساتھ قبرستان مہندیان میں ایک چبوترے پر آسودہ راحت ہیں۔

جناب علی محمد شیر میوات صاحب متولی درگاہ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے اس چبوترے پر چھت ڈلوادی ہے۔ تاکہ زائرین دھوپ اور بارش کی صعوبت سے محفوظ رہیں جس کی وجہ سے یہاں کی فضا بھی پر رونق ہوگئی ہے۔ اور خاندان ولی اللّٰہی کے یہ مزارات آج مرجع خلائق بنے ہوئے ہیں۔

امام شاہ ولی اللہ محدث

ولادت

شاہ ولی اللہ کی ولادت با سعادت ۴ شوال المکرم ۱۱۱۴ھ بروز بدھ طلوع آفتاب کے وقت دہلی میں ہوئی۔ یہ وہ مبارک ساعت تھی جس میں حضرت شاہ عبدالرحیم کے گھر ایک ماہتاب علم نبوت طلوع ہوا جب کہ شاہ عبدالرحیم کی عمر طبعی ۶۰ سال سے متجاوز ہو چکی تھی۔ اور آپ کی اہلیہ محترمہ تو سنِ یاس کو پہونچ چکی تھیں مگر خداوند تعالیٰ کی جانب سے شاہ صاحب کو اس نعمت عظمیٰ کی بشارت پہلے دی جا چکی تھی، جس کا واقعہ اس طرح بیان کیا جاتا ہے کہ ایک مرتبہ شاہ عبدالرحیم صاحب حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کے مزار کی زیارت کے لئے تشریف لے گئے اس زیارت کے دوران آپ کو حضرت خواجہ بختیار کاکیؒ نے بشارت دی کہ عنقریب آپ کے یہاں ایک فرزند ارجمند پیدا ہوگا۔ اس کا نام قطب الدین احمد رکھنا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ شاہ صاحب کی اہلیہ محترمہ عہد یاس کو پہونچ چکی تھیں۔ اس بنا پر شاہ عبدالرحیم صاحبؒ کو گمان ہوا کہ

یہ اشارہ عینی بیٹے کی طرف نہیں پوتے کی طرف ہے۔ لیکن قدرت کو بیٹا ہی دینا منظور تھا۔ لہذا ظاہری اسباب میں یہ صورت بنی کہ اس واقعہ کے چند روز بعد یہ اتفاق پیش آیا کہ شاہ صاحب کا عقد شیخ محمد پھلتی کی صاحبزادی فخر النساء سے ہو گیا یہ ایک نیک سیرت خاتون اور بڑی صاحب فضل و کمال خاتون تھیں۔ اسی نامور خاتون کے بطن سے شاہ ولی اللہ پیدا ہوئے، جن کے بارے میں شیخ محمد عاشق پھلتی لکھتے ہیں۔

والدۂ شریفہ شان کہ بعلم	آپ کی والدہ ماجدہ تفسیر و حدیث
شریعت از تفسیر و حدیث	جیسے علوم شرعیہ کی عالمہ آداب
عالمہ و بآداب طریقت	طریقت سے آراستہ پیراستہ
متادبہ و باسرار حقیقت عارفہ	اسرار حقیقت کی معرفت رکھنے
و بمصداق اسم خود فخر النساء	والی اور ان وجوہ سے حقیقتاً طبقہ
بودند۔	اناث کیلئے باعث فخر اور اسم با مسمی تھیں۔

القول الجلی ص۱۰

نام و نسب

اور چونکہ خداوند تعالیٰ اس مادر زاد ولی کو اسم با مسمیٰ ولی اللہ بنانا چاہتا تھا اس لئے شاہ صاحب کی ولادت کے موقع پر شاہ عبد الرحیم صاحب کو حضرت بختیار کاکی کا بتایا ہوا بشارتی نام یاد نہیں رہا۔ اور آپ نے اپنے صاحبزادے کا نام ولی اللہ تجویز فرما دیا اور اس کے کچھ عرصے بعد جب شاہ صاحب کو وہ بشارت یاد آئی تو قطب الدین احمد نام رکھا۔ مگر ولی اللہ نام نے اس درجہ شہرت پائی کہ نہ صرف آپ بلکہ آپ کی نسبی و علمی و روحانی اولاد سب خاندان ولی اللہی کے نام سے آج تک پہچانی جاتی ہے

بلکہ علمی سلسلہ تو مکتب ولی اللہی ہی کے نام سے ہی دنیا میں جانا پہچانا جاتا ہے بہرحال آپ کا القائی نام ولی اللہ اور بشارتی نام قطب الدین اور کنیت ابوالفیاض اور تاریخی نام عظیم الدین ہے۔ اور بعض لوگ آپ کا القائی نام احمد اور ولی اللہ عرفیت اور لقب بتاتے ہیں۔

سلسلۂ نسب

حضرت شاہ ولی محدث دہلوی والد ماجد کی طرف سے "فاروقی" اور والدہ محترمہ کی طرف سے "سید" ہیں آپ خود فرماتے ہیں۔

"بحضرت عمرؓ شجرہ ما می رسد بحضرت علیؓ از جہت امہات نسل واصل می شود"۔

انفاس العارفین ص۳۸

اس اعتبار سے شاہ صاحب خالص عربی النسل اور نسباً فاروقی ہیں۔ حضرت شاہ صاحب نے اپنی بعض تصنیفات میں اپنے والد ماجد سے سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے درج ذیل کل تینتیس (۳۳) واسطے بیان فرماتے ہیں جو اس طرح ہے:

"شاہ ولی اللہ بن الشیخ عبدالرحیم بن الشہید وجیہہ الدین بن معظم بن منصور بن احمد بن محمود بن قوام الدین عرف قاضی قاذن بن قاضی قاسم بن قاضی کبیر عرف قاضی بدہ بن عبدالملک بن قطب الدین بن کمال الدین بن شمس الدین مفتی بن شیر ملک بن محمد عطار ملک بن ابوالفتح ملک بن عمر حاکم ملک بن عادل ملک بن فاروق بن جرجیس بن احمد بن محمد شہریار بن عثمان ماہان بن ہمایون بن قریش بن سلیمان بن عفان بن عبداللہ بن محمد بن عبداللہ بن عمر بن الخطاب۔"

اس نسب نامہ میں متعدد ناموں کے ساتھ لفظ "ملک" آیا ہے۔
جس کے متعلق شاہ صاحب خود تحریر فرماتے ہیں۔

یہ زمانہ قدیم میں تعظیمی لقب جانا جاتا تھا جیسے ہمارے زمانہ
میں "خان"

جس سے معلوم ہوتا ہے کہ شاہ صاحب کے آباء و اجداد زمانہ قدیم
سے ہی دینی و دنیوی وجاہت کے مالک رہے ہیں۔

ایام طفولیت

حضرت شاہ صاحب کے اندر نوعمری ہی سے انتہائی سعادت مندی
اور غیر معمولی متانت و سنجیدگی پائی جاتی تھی آپ عام بچوں کی طرح کھلنڈر
اور لا ابالی نہیں تھے آپ کی سعادت مندی اور اطاعت شعاری کے سلسلے میں
یہ واقعہ بیان کیا جاتا ہے کہ ایک مرتبہ آپ اپنے چند ہم عمر بچوں کے ساتھ
سیر و تفریح کے لئے تشریف لے گئے اور جب تفریح سے فارغ ہو کر
گھر واپس آئے تو شاہ عبدالرحیم نے فرمایا میاں آج تم نے اس سیر و تفریح
سے کون سی ایسی چیز حاصل کی ہے۔ جو تمہیں زندگی میں کام آئے گی میں نے
تو یہ پڑھا یہ لکھا۔ اور یہ عبادت کی۔ حضرت شاہ صاحب والد محترم کی زبان
سے یہ ناصحانہ کلمات سنتے ہی فرط ندامت سے پسینہ پسینہ ہو گئے اور
اس کے بعد آپ پھر کبھی کھیل کود کی طرف متوجہ نہیں ہوئے اس واقعہ سے
جہاں شاہ صاحب کی سعادت مندی و اطاعت شعاری کا اندازہ ہوتا وہیں
والد محترم کی حسن تربیت کا بھی پتہ چلتا ہے۔

تعلیم و تکمیل

حضرت شاہ صاحب جب پانچ برس کے ہوئے تو رواج زمانہ کے مطابق مکتب میں قرآن مجید پڑھنے کے لئے بیٹھائے گئے اور صرف دو سال میں آپ نے قرآن مجید حفظ کر لیا اور اسی سال فارسی کی تعلیم شروع کی اور ایک ہی سال میں اس کی بھی تکمیل کر لی۔ اور پندرہ سال ہی کی عمر میں شاہ صاحب نے نحو، صرف، منطق، فلسفہ، فقہ، تفسیر اور حدیث غرض جملہ کتب متداولہ کی نہ صرف تکمیل کر لی بلکہ ہر فن میں مہارت تامہ اور کامل عبور حاصل کر لیا اور آپ ان تمام فنون پر ایسا استاذانہ کلام کرنے لگے کہ بڑے بڑے صاحب فن آپ کی غیر معمولی بصیرت و مہارت سے ششدر و حیران رہ جاتے تھے۔

عقد

شاہ صاحب کی عمر جب چودہ سال کی ہوئی تو شاہ عبدالرحیم صاحب کو اپنے فرزند ارجمند کے عقد کی فکر ہوئی اور جب رشتہ پکا ہو گیا تو شاہ صاحب نے لڑکی والوں پر زور دیا کہ جلد از جلد اس فرض سے فراغت حاصل کر لی جائے اور جب لڑکی کے اعزہ نے سامان شادی کے تیار نہ ہونے کا عذر کیا تو آپ نے کہلا بھیجا کہ مصلحت جلدی کرنے میں ہے جس کا اظہار اس وقت مناسب نہیں۔ چنانچہ شاہ صاحب کے اصرار پر سسرال کے لوگ رضامند ہو گئے اور اسی سال آپ کی شادی ہو گئی۔ اور شادی ہو جانے کے چند ہی روز بعد شاہ کی خوشدامن کا انتقال ہو گیا۔ پھر تھوڑے ہی دنوں کے بعد خوشدامن کے والدہ کا وصال ہو گیا۔ کچھ ہی دن گزرے تھے کہ شاہ ولی اللہ کے

پچچا شیخ ابوالرضا محمد کے صاحبزادے شیخ فخر عالم رحلت فرما گئے۔ ان صدمات اور مختلف امراض و ضعف کی وجہ سے آپ کے والد صاحب بھی سخت بیمار ہو گئے اور ان پے در پے حادثات پر لوگوں نے سمجھا کہ عجلت میں شاہ صاحب کی مصلحت کیا تھی۔ اور اس وقت شادی نہ ہوئی ہوتی تو شادی میں کتنی تاخیر کرنی پڑتی اور شادی کتنی بے لطف ہوتی۔

بیعت و دستار بندی

پندرہ سال کی عمر میں شاہ صاحب نے اپنے والد بزرگوار کے دست مبارک پر بیعت کی اور ان کی نگرانی میں اشتغال صوفیہ میں مشغول ہو گئے خصوصاً سلسلۂ نقشبندیہ کے اذکار کو از اوّل تا آخر پورا فرمایا چنانچہ شاہ صاحب خود تحریر فرماتے ہیں :

و پانزدھم سال بود کہ باوالد بزرگوار بیعت کردم و باشتغال صوفیہ خصوصاً نقشبندیہ مشائخ مشغول شدم واز حیثیت توجہ و تلقین و تعلیم آداب طریقت ولبس خرقۂ صوفیہ ارتیاط درست نمودم	پندرھویں سال تھا کہ والد بزرگوار سے بیعت ہوا اور اشتغال صوفیہ خصوصاً مشائخ نقشبندیہ کے اشتغال میں مشغول ہوا۔ اور توجہ تلقین، تعلیم، آداب طریقت اور خرقۂ صوفیہ پہننے کی راہ اپنی نسبت کو درست کیا۔

الجزء اللطیف فی ترجمۃ العبد الضعیف ص۳

رحلت پدر بزرگوار

اس طرح گویا شاہ عبدالرحیم صاحب نے اپنے پندرہ سالہ نونہال، نوعمر نوجوان

کو تمام علوم ظاہری و باطنی میں کامل کر دیا اور دنیاوی اعتبار سے بھی نہ صرف یہ کہ پال پوس کر بڑا کر دیا بلکہ نکاح و شادی کے فرائض سے بھی سبکدوشی حاصل کر کے سفر آخرت کی تیاری شروع فرمادی اور اس کے بعد ایک ڈیڑھ سال ہی کے عرصہ میں یہ تمام بار امانت اپنے لائق فرزند کے سپرد کر کے اپنے مولائے حقیقی سے جا ملے۔ شاہ صاحب کے انتقال کے بعد تمام تلامذہ و متوسلین نے خلف الرشید شاہ ولی اللہ کو شاہ عبدالرحیم صاحبؒ کا قائم مقام منتخب فرمایا کیونکہ شاہ عبدالرحیم صاحب کے تلامذہ و منتسبین میں آپ ہی اس مقام اور مسند کے سب سے زیادہ اہل تھے۔

درس و تدریس

لہٰذا شیخ الاسلام حضرت شاہ ولی اللہؒ اپنے فخر روزگار والد شاہ عبدالرحیمؒ کے وصال کے بعد ۱۱۳۱ھ مطابق ۱۷۱۹ء میں مسند درس و ارشاد پر فائز ہوگئے اور درس و تدریس اور دعوت وارشاد کا سلسلہ شروع فرمادیا۔ اور دوران تدریس جملہ علوم نقلیہ و عقلیہ کا انتہائی تفکر و تعمق کے ساتھ مطالعہ فرماکر محدثین و فقہائے مستنبطین کے طریق استدلال و استنباط میں درک حاصل فرمایا! جیسا کہ حضرت شاہ صاحب خود فرماتے ہیں :

> "والد صاحب کی وفات کے بعد بارہ سال تک کتب دینیہ اور معقولات کے درس میں اشتغال رہا۔ اور ہر علم و فن میں غور کرنے کا موقع ملا۔ ______ اور مذاہب اربعہ کی فقہ اور ان کی اصول فقہ کی کتابوں اور ان احادیث کے غائر مطالعہ کے بعد جن سے وہ حضرات اپنے مسائل میں استنباط فرماتے ہیں۔ نور غیبی کی مدد سے "فقہائے محدثین" کا طریقہ دلنشیں

ہوا۔"

الجزء اللطیف فی ترجمۃ العبد الضعیف ص۱۶۱

شاہ صاحب درس و تدریس کے دوران نہایت ہی استغراق، محویت کے ساتھ مشغول و مصروف رہتے جس کی وجہ سے آپ پر عجیب استغراقی و انہماکی کیفیت طاری رہتی جس کا اثر آپ کے معمولات پر اس درجہ ظاہر ہونے لگا کہ آپ کے کھانے اور آرام فرمانے کی مقدار بھی گھٹ کر نہ ہونے کے برابر رہ گئی تھی اور اس محویت کا اثر یہ ہوا کہ آپ نے محسوس فرمایا کہ علوم قرآن و حدیث کے بغیر جملہ علوم و فنون بے روح اور بے جان ہیں اور تمام علوم عقلیہ کی حقیقی روح قرآن و حدیث ہی ہیں۔ لہذا انہماک و استغراق کے ساتھ شاہ صاحب ۱۲ سال مسلسل مدرسہ رحیمیہ مہندیان میں درس و تدریس کے ذریعہ تشنگانِ علوم نبوت کو سیراب فرماتے اور انسانی قلوب کو علومِ الٰہی سے منور فرماتے رہے۔

سفرِ حرمین

اس کے بعد خیال آیا کہ علمائے حجاز سے بھی علوم میں استفادہ کرنا چاہیئے خصوصاً علم حدیث تو ضرور ان حضرات سے حاصل کرنا چاہیئے، لہذا طالبعلم بن کر بلکہ حقیقی معنی میں مہمان رسول ﷺ بننے کے لئے ۱۱۴۳ھ مطابق ۱۷۳۱ء میں حجاز مقدس روانہ ہو گئے اور چودہ ماہ کے قریب وہاں مقیم رہ کر شاہ صاحب نے شیخ ابو طاہر جیسے محدث یگانہ کے علاوہ شیخ محمد وفد اللہؒ سلیمان المغربیؒ، شیخ محمد بن محمد سلیمان المغربی، تاج الدینؒ قلعی حنفیؒ مفتی مکہ شیخ سناویؒ، شیخ احمد قشاشیؒ، سید عبدالرحمن ادریسیؒ، شمس الدین محمد بن علاء بابلی شیخ عیسیٰ جعفری، شیخ حسن عجیمیؒ، شیخ احمد علیؒ اور شیخ عبداللہ بن سالمؒ

بصریؒ جیسے فخر روز گار محدثین سے اکتساب فیض کیا۔
شیخ ابو طاہر مدنی کا شمار مدینہ منورہ کے اجلۂ محدثین میں ہوتا تھا۔
ان سے خصوصیت کے ساتھ اکتساب فیض فرمایا۔ اور شیخ ابو طاہر مدنیؒ
شاہ صاحب کی غیر معمولی ذہانت، فطانت اور جودت طبع سے بے حد
متاثر تھے لہذا شیخ صاحب نے بھی فیض رسانی میں انتہائی فیاضی کا ثبوت دیا
اور جو کچھ خزانہ علوم نبوت اللہ تعالیٰ نے شیخ کو مرحمت فرمایا تھا۔ بے کم و
کاست شاہ صاحب کی خدمت میں منتقل فرما دیا۔ شیخ ابو طاہر شاہ صاحب سے
اس درجہ متاثر تھے کہ شاہ صاحب کے متعلق فرمایا کرتے تھے۔

یسند عنی اللفظ وکنت اصحح منه المعنیٰ
یہ الفاظ کی سند تو مجھ سے لیتے ہیں مگر میں ان سے حدیث
کے معانی حاصل کرتا ہوں۔

الیانع الجنی ص۱۸

شاہ ولی اللہ صاحب نے مشائخ و اساتذہ حرمین کے تعارف و تذکرہ
میں ایک رسالہ "انسان العین فی مشائخ الحرمین" کے نام سے مرتب فرمایا
ہے۔ شاہ صاحب نے اس میں اپنے محبوب و محسن استاد شیخ ابو طاہر مدنیؒ
کا والہانہ انداز سے تعارف کرایا ہے۔ شیخ ابو طاہر مدنی صرف ایک
عظیم المرتبت محدث ہی نہیں بلکہ علوم باطن کے بھی امام تھے۔
شیخ ابو طاہر مدنی نے شاہ صاحب کو خرقۂ باطن سے بھی نوازا تھا
حاصل یہ کہ استاد شاگرد کے درمیان ایسا قلبی لگاؤ پیدا ہو گیا تھا کہ جب
شاہ صاحب نے حجاز سے ہندوستان واپسی کا ارادہ ظاہر کیا اور شیخ
مدنیؒ سے رخصت چاہی تو اس وقت شفیق و مہربان استاذ اور سعادتمند
شاگرد دونوں کی جو کیفیت تھی اس کا ذکر شاہ صاحب نے ایک خط میں

کیا ہے جس سے استاذ شاگرد کے والہانہ تعلق کا اندازہ ہوتا ہے۔ شاہ صاحبؒ تحریر فرماتے ہیں:

"میں اس وقت کو کبھی فراموش نہیں کر سکتا کہ جب میرے کوچ کا زمانہ قریب ہوا اور جدائی کی گھڑی سر پر آ کھڑی ہوئی اور رخصتانہ ملاقات کے دوران میں مزاج پرسی کے بعد میں نے یہ شعر پڑھا:

نسیتُ کل طریقٍ کنت اعرفه
الا طریقاً یودینی الی ربعکم

"میں بجز اس راستے کے جو مجھے تمہاری زمین تک پہنچا دے ان تمام راستوں کو بھول گیا۔ جن سے میں اس سے پیشتر واقف تھا"

تو شیخ کی پُرنم آنکھوں سے آنسوؤں کی ندیاں بہنے لگیں اور دونوں رخسارے سُرخ ہو گئے۔ یہاں تک کہ وفور گریہ سے آپ کا گلا بند ہو گیا اس کے بعد آپ نے نہایت خلوص کے ساتھ اس عاجز کے حق میں دعا کی۔"

رود کوثر ص۵۲۴

سراج الہند امام شاہ عبدالعزیز دہلوی نے لکھا ہے کہ:

"میرے والد صاحب جب مدینہ طیبہ سے رخصت ہونے لگے تو استاذ محترم سے عرض کیا اور وہ یہ سن کر خوش ہوئے میں نے جو کچھ پڑھا تھا سب بھلا دیا۔ سوائے علم دین وحدیث کے۔"

ملفوظات عزیزی ص۲۳

ایک یمنی محدث کی شہادت

حضرت شاہ ولی اللہ کی علمی جلالت شان کو مشائخ عرب وعجم نے یکساں طور پر تسلیم کیا ہے۔ حجۃ الاسلام فی الارض مولانا محمد قاسم نانوتوی سے امیر شاہ خاں مرحوم نے ایک یمنی محدث کا بڑا ہی دلچسپ واقعہ نقل کیا ہے جس کا ذکر یہاں دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

امیر شاہ خاں تحریر فرماتے ہیں کہ:

"سفر حج میں حضرت (النانوتوی رحمۃ اللہ علیہ) کا جہاز یمن کے ساحل کے کسی بندرگاہ پر ٹھہر گیا۔ معلوم ہوا کہ چند دن ابھی رکا رہیگا حضرت نانوتویؒ کو کسی نے خبر دی کہ اس بندرگاہ کے شہر میں ایک کہنہ سال معمر بزرگ محدث رہتے ہیں، ان کی ملاقات کو حضرت تشریف لے گئے، مل کر مولانا نانوتویؒ ان کے علم سے بہت متاثر ہوئے اور درخواست کی کہ سند اجازت عطا ہو اس پر محدث صاحب نے پوچھا تم کس کے شاگرد ہو؟ انھوں نے اپنے استاذ مولانا عبدالغنی مجددیؒ کا نام لیا۔ محدث صاحب ناواقف تھے، پوچھا مولانا عبدالغنی کس کے شاگرد ہیں؟ جواب ملا شاہ اسحاقؒ کے۔ شاہ اسحاقؒ سے بھی وہ ناواقف تھے، پوچھا کہ وہ کس کے شاگرد تھے؟ کہا شاہ عبدالعزیز صاحب کے، شاہ عبدالعزیز صاحب کا نام سن کر محدث صاحب رکے۔ بولے ان کو میں جانتا ہوں اور اس کے بعد فرمایا۔

شاہ ولی اللہ طوبیٰ کا درخت ہے، جس طرح جہاں جہاں طوبیٰ کی شاخیں ہیں وہاں جنت اور جہاں اس کی شاخیں نہیں ہیں وہاں جنت

نہیں، یونہی جہاں شاہ ولی اللہ کا سلسلہ ہے وہاں جنت ہے
اور جہاں ان کا سلسلہ نہیں ہے وہاں جنت نہیں۔"

شاہ ولی اللہ صاحب نے حجاز مقدس سے واپس آنے کے بعد دوبارہ اپنے والد بزرگوار کے مدرسہ رحیمیہ چھتہ شیخ نرور (موجودہ قبرستان مہندیان) میں درس حدیث شروع کر دیا۔ اور تشنگان علوم جو چشمۂ فیض کے منتظر تھے۔ اطراف واکناف سے کھنچ کھنچ کر پہونچنے لگے اور چند ہی دنوں میں دوبارہ گلزار رحیمی میں قال اللہ، قال الرسول کی صدائیں گونجنے لگیں۔

شاہ صاحب کی سیاسی بصیرت

شاہ ولی اللہ صاحب جہاں بلند پایہ محدث تھے وہیں عظیم مفکر، ممتاز دانشور اور بالغ نظر سیاسی مبصر بھی تھے۔ اور اس سیاسی بصیرت میں حجاز مقدس کے قیام نے چار چاند لگا دیئے کیونکہ آپ کو حجاز میں تحصیل علم کے ساتھ ساتھ مختلف ممالک خصوصاً اسلامی ممالک کے احوال وکوائف سے باخبر ہونے کا پورا موقع ملا۔ اور ان احوال کی روشنی میں ہندوستان کے مسائل کے حل کرنے میں بڑی رہنمائی ملی جیسا کہ حضرت مولانا سید محمد میاں صاحب مرحوم لکھتے ہیں:

"وہاں دوسال قیام کر کے علمی اور روحانی مشاغل کے ساتھ ساتھ بڑا کام یہ کیا کہ یورپ اور ایشیا کے زائرین سے ان ممالک کے متعلق پوری واقفیت حاصل کی۔

علمائے ہند کا شاندار ماضی ص۵

لہٰذا شاہ ولی اللہ صاحبؒ خود ایک خط میں لکھتے ہیں۔

احوال ہند بر ما مخفی نیست	ہندوستان کے حالات ہم پر پوشیدہ
کہ خود مولد ومنشاء فقیر است	نہیں ہیں کیونکہ ہندوستان

بلادِ عرب نیز دیدم و احوال مردم ولایت از ثقات اینجا شنیدم	خود اپنا وطن ہے ممالک عرب بھی دیکھ لئے ہیں اور ولایت والوں کے حالات وہاں کے معتمد لوگوں کے ذریعہ معلوم ہوتے ہیں۔

شاہ ولی اللہ کی سیاسی تحریک صفحہ ۱۴۱

ہندوستان کی حالت زار اور شاہ صاحب کی بے چینی

شیخ الاسلام شاہ ولی اللہ نے جب آنکھ کھولی تو مغلوں کا طاقتور تاجدار اورنگ زیب عالمگیر دنیائے آب و گل سے رخصت ہو چکا تھا اور شاہ صاحب کا وطن ہندوستان رو بزوال تھا جس میں خانہ جنگی، فسادات اور خلفشار و انتشار کے سوا کچھ نہ تھا .....

دلی غریب چاروں طرف سے آفات کا ہدف بنی ہوئی تھی، بدامنی اور شورش کے آثار ہر سمت نمایاں تھے۔ مرہٹے، روہیلے، جاٹ، افغان اور سکھ سب ہی ملک گیری کی ہوس میں مبتلا اور فتنہ و فساد پر تلے ہوئے تھے امراء و سلاطین جن سے کچھ اصلاح کی توقع ہو سکتی تھی ان کی حالت بھی عجیب و غریب تھی۔ کبھی رنگ رلیوں میں مبتلا ہوتے اور کبھی اندرونی و بیرونی فتنوں و شورشوں سے دوچار ہوتے۔

غرض ایک طرف اگر شاہانِ وقت اپنے اسلاف کی دولت رقص و سرود کی محفلوں اور حسن و جمال کے بازاروں میں لٹا رہے تھے اور دوسری طرف رعایا بدحال، پریشان غربت و افلاس کے ہاتھوں برباد اور ستمگروں کے مظالم سے پامال ہو رہی تھی۔

شاہ ولی اللہ صاحب کے سامنے ایک طرف مغلوں کی کمزور اور بزدل

حکومت تھی تو دوسری طرف ملکوں کو بربادی کے دہانے پر لیجانے والی ابھرتی ہوئی قوتیں تھیں۔ شاہ صاحب کے ذہن و دماغ پر ان حالات کا جو اثر ہوا اس کا اندازہ ان کے اس شعر سے ہوتا ہے۔ ؎

کان نجوماً او مضت فی الغیاھب
عیون الافاعی او روس العقارب

"تاریکیوں میں جو ستارے چمک رہے ہیں مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ ناگوں کی آنکھیں ہیں یا بچھوں کے سر ہیں۔"

لیکن شاہ صاحب جاٹوں، مرہٹوں، سکھوں اور روہیلوں کے حملوں اور شورشوں سے مرعوب نہیں ہوئے بلکہ ایک بیدار مغز مفکر اور جیالے مرد مجاہد کی طرح ملک کی عظمت رفتہ کی بازیابی کے لئے غور و فکر اور جد و جہد شروع کر دی اور شب و روز اسی سوچ بچار میں غلطاں و پیچاں رہتے کیونکہ عالمگیر کے نالائق جانشیں حکمرانوں سے مایوس ہو چکے تھے۔ سکھوں اور روہیلوں جیسے شر پسندوں کے مقابلہ کا ان میں دم خم نہیں پاتے تھے۔ اور ملک کو غلط طاقتوں کا تختہ مشق بننے سے روکنا ضروری تھا۔ لہذا ضروری تھا کہ کسی ایسی طاقت کا سہارا لیا جائے جو ان شر پسند طاقتوں کو زیر کر سکے۔ اور خود ملک گیری اور وسعت پسندی کے جذبات سے پاک ہو اگرچہ وہ طاقت غیر ملکی ہی ہو۔ لہذا اس سلسلہ میں آپ کی سیاسی بصیرت نے شاہ ابدالی کا انتخاب فرمایا، مجبوراً احمد شاہ ابدالی کو آواز دی اور نواب نجیب الدولہ کی معرفت احمد شاہ ابدالی کو قندھار سے بلوایا۔ جس نے سب سے پہلے پانی پت کی لڑائی میں مرہٹوں سے ٹکر لیکر ان کے دانت کھٹے کر دیئے اور اس طرح ان کا زور ٹوٹ گیا۔ لیکن سلطنت دہلی کا نظم و نسق کچھ اس حد تک ناقص ہو چکا تھا کہ وہ اتنی بڑی فتح سے معمولی استفادہ بھی نہ کر سکا۔ البتہ اتنا ضرور ہوا کہ بعض صوبوں میں نظام کچھ مستحکم ہو گیا شاہ صاحب

نے احمد شاہ ابدالی کو ہندوستان پر حملہ آور ہونے کے لئے بڑی دردمندانہ اپیل کی تھی اور اس کام میں ہاتھ بٹانے کے لئے دیگر با اثر امراء سے بھی خط و کتابت کی تھی۔

شاہ صاحب احمد شاہ ابدالی کے نام خط میں تحریر فرماتے ہیں:

"عصر حاضر میں آپ سے زیادہ طاقتور اور پرشوکت کوئی اور بادشاہ موجود نہیں۔ آپ کو ہندوستان کی جانب توجہ کرنا واجب ہے تاکہ مرہٹوں کی قوت ٹوٹے اور ناتوان مسلمان سکون کی سانس لے سکیں۔"

۲۷ر جون ۱۹۶۹ء، ہفت روزہ الجمعیۃ، دہلی

شاہ صاحب کی فرمائش پر احمد شاہ ابدالی کئی بار ہندوستان پر حملہ آور ہوا چونکہ جنگی حالات سے عوام کا متاثر ہونا لابدی ہے۔ اس لئے احمد شاہ ابدالی کی فوج سے بھی بے گناہ عوام کو مالی وجانی نقصان برداشت کرنا پڑا۔ لہٰذا جس سے شاہ صاحب جیسے دردمند اور محب وطن کا متاثر ہونا بھی یقینی تھا۔ شاہ صاحب بھی فوج کی ان ناشائستہ حرکتوں سے بہت متاثر ہوئے اور فوراً نجیب الدولہ جو احمد شاہ ابدالی کا راز دان اور شاہ صاحب کا بڑا معتقد تھا۔ ایک طویل خط تحریر فرمایا جس میں ہدایت فرمائی کہ:

"جب افواج شاہی کا گزر دہلی میں ہو تو اس وقت اس بات کا پورا انتظام واہتمام ہونا چاہیئے کہ شہر سابق کی طرح ظلم سے پامال نہ ہو جائے، دہلی والے کئی بار لوٹ مار، ہتک عزت اور بے آبروئی کا تماشہ دیکھ چکے ہیں۔ اسی وجہ سے مطلب برآری اور مقاصد میں تاخیر پیش آرہی ہے۔ آخر میں مظلوموں کی آہ بھی اثر رکھتی ہے۔ اگر اس بار آپ چاہتے ہیں کہ وہ کام جو

تشنۂ تکمیل تھے وہ مکمل ہو جائیے تو اس بات کی پوری تاکید و پابندی ہونی چاہیئے کہ کوئی فوجی دہلی کے مسلمانوں اور غیر مسلموں سے جو ذمی کی حیثیت رکھتے ہیں تعرض نہ کرے۔"

شاہ ولی اللہؒ کے سیاسی مکتوبات ص۲۸

جن حالات میں اور جن مقاصد کے لئے شاہ صاحب نے احمد شاہ ابدالی کو ہندوستان آنے کی دعوت دی اور اس پر جس طرح کی پابندیاں عائد کیں اب کسی کو یہ حق نہیں پہونچتا کہ وہ شاہ صاحب پر یہ الزام لگائے یا اعتراض کرے کہ آخر شاہ صاحب نے اپنے ملک پر دوسروں کو حملہ کرنے کی دعوت کیوں دی؟ کیونکہ سابقہ تفصیلات سے یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ اندرون ملک اصلاح کی کوئی تدبیر کارگر نہیں ہو سکتی تھی اور پھر دعوت بھی ایسے شخص کو دی جس کا دماغ ملک گیری یا وسعت پسندی کی ہوس سے پاک تھا۔ یہی وجہ ہے احمد شاہ ابدالی اپنا کام مکمل کر کے واپس چلا گیا، غاصب قوموں کی طرح جم کر نہیں بیٹھا جیسا کہ مولانا سعید احمد اکبر آبادی مرحوم تحریر فرماتے ہیں:

"حضرت شاہ صاحب محب وطن تھے، اور اتنے ہی جتنا کہ اس آریہ ورت کا کوئی چار ہزار برس کا باشندہ ہو سکتا ہے۔ لیکن اگر گھر میں آگ لگ رہی ہو، اور خود گھر والے اس کو بجھانے اور اس پر قابو پانے پر قادر نہ ہوں تو کیا اس وقت باہر والوں کو امداد کے لئے نہ بلانا گھر سے غداری اور خودکشی نہیں ہے؟ سوچنے کی بات یہ ہے کہ احمد شاہ ابدالی نے مرہٹوں کی طاقت کو زیر و زبر کیا اور اب پورے ہندوستان میں کوئی طاقت اس کی حریف نہیں ہو سکتی تھی۔ لیکن اس کے باوجود نجیب الدولہ کو امیر الامراء بنا کر چلا گیا اور خود اس نے اپنی حکومت قائم نہیں کی۔ ایک مورخ یہ سمجھ سکتا ہے کہ یہ

سب کچھ حضرت شاہ صاحب کے اشارے اور ایما پر ہی ہوا ہو گا جنھوں نے اپنے گھر کو درست کرنے کے لئے بیرونی امداد تو لی لیکن اپنے ملک پر بیرونی طاقت کا قبضہ گوارا نہیں کیا۔ رہا امداد کے لئے بلانا تو واقعہ یہ ہے کہ مرہٹوں نے اس ملک میں اس قدر مضبوط اقتدار قائم کر لیا تھا اور ان کی وجہ سے پورے ملک میں عام تباہی و بربادی اس درجہ میں پھیلی ہوئی تھی کہ بیرونی امداد کو طلب کرنے کے علاوہ کوئی چارہ ہی نہیں تھا، چنانچہ اس معاملہ میں حضرت شاہ صاحب خود اکیلے نہیں، بلکہ خود نجیب الدولہ، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ہندو راجہ مہاراجہ، احمد شاہ ابدالی سے امداد کے خواہاں تھے۔

سیر المتاخرین کے الفاظ یہ ہیں:۔

نجیب الدولہ و راجہا ئے ہند از دست مرہٹہ و عماد الملک بجاں آمدہ زوال دولت و ملکِ خود از دست و برد مرہٹہ برائے العین مشاہدہ نمودہ عرائض استدعا بخدمت احمد شاہ ابدالی نگاشتہ خواہاں ورود شدند۔

نجیب الدولہ اور ہندوستان کے راجہ مہاراجوں نے مرہٹوں اور عماد الملک کے ہاتھوں اپنے ملک و دولت کا زوال بچشم خود دیکھ کر احمد شاہ ابدالی کو درخواستیں بھیجیں اور ہندوستان میں اس کے ورود کے خواہاں ہوئے۔

اور اس کی وجہ یہ ہے کہ جیسا کہ مرہٹوں کی تاریخ سے ظاہر ہے اور خود ہندو ارباب قلم نے اس کی تصریح کی ہے یہ لوگ انسانیت اور شرافت کے دشمن تھے، اور کوئی ظلم و ستم ایسا نہیں تھا جو انھوں نے ہندو، مسلمانوں اور عیسائیوں وغیرہ پر روا نہ رکھا ہو، پس یہ ظاہر

ہے کہ شاہ صاحب کا ابدالی کو بلانا وطن کی محبت اور اہل ملک کی خیر خواہی کے جذبہ ہی سے تھا اور اس میں وہ بالکل حق بجانب تھے، اگر شاہ صاحب کے پیش نظر صرف مسلمانوں کی خیریت اور بھلائی ہوتی تو وہ نجیب الدولہ کو دہلی بلاتے ہوئے مسلمانوں کے ساتھ "ذمیان" یعنی غیر مسلموں کی بھی صراحت نہ کرتے اور مسلمانوں کے ساتھ ان کے لئے بھی امن و امان کی درخواست نہ کرتے۔

برہان، مارچ ۱۵۶ء

ہندوستان میں انگریزوں کی آمد

انگریز ۱۶۰۸ء میں ہندوستان میں تجارت کے لئے داخل ہوئے تھے۔ اپنی عیارانہ سازشوں کے تحت ۱۶۶۳ء میں اس قابل ہو گئے کہ ہر قسم کی دست درازیوں اور اشتعال انگیزیوں پر اتر آئے اور حکومت وقت سے جنگ کرنے کے لئے پر تولنے لگے۔ تاہم عالمگیر کے عہد تک انھیں سیاست میں دخل اندازی کا براہ راست موقع نہ ملا۔ اگرچہ در پردہ وہ حکومت کی بعض باغی طاقتوں مثلاً مرہٹوں وغیرہ کو اکساتے رہے اور اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ جب مرہٹوں نے شیواجی کی قیادت میں دفعتاً سورت پر حملہ کر کے وہاں کے باشندوں اور تاجروں کو لوٹا تھا تو انگریز تاجروں کی کوٹھیاں محفوظ چھوڑ دی تھیں۔ ایسا محسوس ہوتا کہ انگریز کے ایما پر ہی یہ خفیہ چھاپہ پہلے سے طے شدہ منصوبے کے مطابق مرہٹوں نے مارا تھا۔

شاہ صاحب انگریزوں کی خفیہ سازشوں سے خوب واقف تھے اور محسوس

کرتے رہتے تھے کہ ہندوستان کے مرہٹے انگریزوں کے آلہ کار بن رہے ہیں اس وجہ سے شاہ صاحب نے احمد شاہ ابدالی کو جنگ کی دعوت دی تھی تاکہ مرہٹوں کے ساتھ ساتھ انگریزوں کی بھی ہمتیں پست ہوجائیں۔

شاہ صاحب کی سیاسی تحریک کے ارکان اول

شاہ صاحب کے مخصوص تلامذہ ومعتقدین اور آزادی وطن کے اولین مجاہدین کے اسماء گرامی حسب ذیل ہیں۔

(۱) مولانا محمد عاشق پھلتیؒ (۲) مولانا نور اللہ بڈھانویؒ (۳) مولانا محمد امین صاحب کشمیریؒ (۴) مولانا شاہ ابوسعید صاحبؒ (۵) شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ (۶) مولانا مخدوم صاحب لکھنویؒ۔

انحطاط وزوال کے اسباب وعلل

شیخ الاسلام حضرت شاہ ولی اللہ صاحب دنیائے اسلام کے عظیم مفکر، زیرک دانشور، مخلص مصلح اور مجدد امت تھے، انھوں نے سلطنت مغلیہ کے زوال و انحطاط کے بنیادی سبب اقتصادی انحطاط کو قرار دیکر باقی اسباب کو اسکا تابع اور لازمی نتیجہ قرار دیا ہے۔ اور مسلم معاشرہ کے زوال پذیر ہونے کا اصل سبب شعائر اسلامی سے روگردانی اور علوم دینیہ سے غفلت کو بتایا ہے۔ اور حقیقت بھی یہی ہے کہ جب انسان اپنے دین اور علوم دینیہ سے دور ہوتا ہے تو مذہبی پستی میں چلا جاتا ہے اور پھر دنیا کی نظر میں وہ اور اس کا مذہب دونوں بے وقعت ہوجاتے ہیں اور جب انسان اقتصادی اعتبار سے کمزور ہوتا ہے تو اس کو دور کرنے کے لئے چوری، ڈکیتی، رشوت خوری میں مبتلا ہوتا ہے حتی کہ بعض مرتبہ انصاف کی کرسی پر بیٹھ کر انصاف کا خون کرتا ہے اور

انتظامی عہدوں پر فائز ہو کر بد نظمی پھیلاتا ہے اور ان تمام مفاسد کی آبیاری عالم نما جاہلوں اور موروثی پیرزادوں اور بے ایمان اور مفاد پرست ارکان دولت اور عیش پسند بادشاہوں اور منافع خور تاجروں کے ذریعہ ہوتی ہے۔ جیسا کہ پروفیسر خلیق نظامی صاحب نے تحریر فرمایا ہے کہ :۔

"مسلم سوسائٹی کے زوال کا سبب ان (شاہ صاحب) کے خیال میں مذہبی شعار سے بے اعتنائی اور علوم دینیہ سے بے تعلقی تھی سلطنت مغلیہ کے زوال کا سبب انھوں نے اقتصادی انحطاط کو قرار دیا تھا اسی کے باعث تمام سیاسی انتشار اور بدنظمیاں پیدا ہوئی تھیں۔ فرماتے ہیں کہ جس سوسائٹی میں اقتصادی توازن نہ ہو اس میں طرح طرح کے روگ پیدا ہو جاتے ہیں۔ نہ وہاں عدل وانصاف قائم ہو سکتا ہے اور نہ مذہب ہی اپنا اچھا اثر ڈال سکتا ہے۔

شاہ ولی اللہ دہلوی کے سیاسی مکتوبات ص ۳۳

اس لئے شاہ صاحب کو مرد حق آگاہ ونبض شناس زمانہ اور حق گو مرد مجاہد ہونے کی بنا پر حق بات کہنے سے نہ بادشاہوں کی سطوت روک سکتی تھی نہ فوجیوں کی توپ و تفنگ ان کی سد راہ ہو سکتی تھی اور نہ جاہل واعظوں، خشک زاہدوں اور موروثی پیرزادوں کے جاہل معتقدین کی بھیڑ ان کو مرعوب کر سکتی تھی لہذا اس مرد مجاہد نے انتہائی جرأت اور بے باکی کے ساتھ بادشاہوں، فوجیوں واعظوں، خشک زاہدوں اور پیرزادوں کی اصل بیماریوں اور خود فریبیوں کی مخلصانہ نشاندہی کی اور ان کی دکھتی ہوئی رگوں پر انگلی رکھی، اور جہاں تک معاشی خرابیوں کا تعلق ہے اس میں تقریباً ہر طبقہ کو یکساں گرفتار پاتے ہوئے ایک مخلص قائد، دردمند مصلح اور مرد حق آگاہ کی حیثیت سے تمام ہی طبقوں کو خطاب فرمایا ہے۔

سلاطین اسلام سے خطاب

اے بادشاہو! ملأ اعلیٰ کی مرضی اس زمانہ میں اس امر پر مستقر ہو چکی ہے کہ تم تلواریں کھینچ لو اور اس وقت تک نیام میں داخل نہ کرو جب تک مسلم مشرک سے بالکلیہ جدا نہ ہو جائے اور اہل کفر وفسق کے سرکش لیڈر کمزوروں کے گروہ میں جا کر شامل نہ ہو جائیں اور یہ کہ ان کے قابو میں پھر کوئی ایسی بات نہ رہ جائے جس کی بدولت وہ آئندہ سر اٹھا سکیں، "قاتلوھم حتّٰی لاتکون فتنۃٌ و یکون الدین کلہ للّٰہ" (یعنی ان سے جنگ کرتے رہو تا آنکہ فتنہ فرو ہو جائے، اور "دین" صرف اللہ کے لئے مخصوص ہو جائے) پھر جب کفر و اسلام کے درمیان ایسا کھلا نمایاں امتیاز پیدا ہو جائے، تب تمھیں چاہیئے کہ ہر تین دن یا چار دن کے سفر کی منزلوں پر اپنا ایک ایک حاکم مقرر کرو ایسا حاکم جو عدل وانصاف کا مجسمہ ہو، قوی ہو جو ظالم سے مظلوم کا حق وصول کر سکتا ہو اور خدا کے حدود کو قائم کر سکتا ہو اور اس میں سرگرم ہو کہ پھر لوگوں میں بغاوت وسرکشی کے جذبات پیدا نہ ہوں، نہ وہ جنگ پر آمادہ ہوں اور نہ دین سے مرتد ہونے کی کسی میں جرأت باقی رہے، نہ کسی گناہ کبیرہ کے ارتکاب کی کسی کو مجال ہو، اسلام کا کھلے بندوں اعلان ہو، اور اس کے شعائر کا اعلانیہ اظہار کیا جائے، ہر شخص اپنے متعلقہ فرائض کو صحیح طور پر ادا کرے، چاہیئے کہ ہر شہر کا حاکم اپنے پاس اتنی قوت رکھے جس کے ذریعہ سے اپنی متعلقہ آبادی کی اصلاح کر سکتا ہو۔

مگر اسی کے ساتھ اس کو اتنی قوت فراہم کرنیکا موقع نہ دیا جائے

جس کے بل بوتے پر وہ خود ان سے نفع گیر ہونیکی تدبیریں سوچنے لگے اور حکومت کے مقابلہ پر آمادہ ہوجائے۔ چاہیئے کہ اپنے متعلقہ مقبوضات کے بڑے علاقہ اور اقلیم پر ایسے امیر مقرر کیئے جائیں جو جنگی مہمات کا اختیار رکھتے ہوں ایسے امیر کے ساتھ بارہ ہزار کی جمعیت رکھی جائے، مگر جمعیت ایسے آدمیوں سے بھری ہو جن کے دل میں جہاد کا دلولہ ہو اور خدا کی راہ میں کسی کی ملامت سے خوفزدہ نہ ہوں ہر سرکش اور متمرد سے جنگ اور مقابلہ کی ان میں صلاحیت ہو

اے بادشاہو! جب تم یہ کر لوگے تو اس کے بعد ملاً اعلیٰ کی رضامندی یہ چاہے گی کہ تم لوگوں کی منزلی اور عائلی زندگی کی طرف توجہ کرو، ان کے باہمی معاملات کو سلجھاؤ اور ایسا کرو کہ پھر کوئی معاملہ ایسا نہ ہونے پائے جو شرعی قوانین کے مطابق نہ ہو، اسی کے بعد لوگ امن و امان کی صحیح مسرت سے فائز المرام ہو سکتے ہیں۔

امراء وارکان دولت سے خطاب

اے امیرو! دیکھو کیا تم خدا سے نہیں ڈرتے، دنیا کی فانی لذتوں میں تم ڈوبے جارہے ہو اور جن لوگوں کی نگرانی تمہارے سپرد ہوئی ہے، ان کو تم نے چھوڑ دیا ہے تاکہ ان میں بعض بعض کو کھاتے اور نگلتے رہیں، کیا تم اعلانیہ شرابیں نہیں پیتے؟ اور پھر اپنے اس فعل کو تم برا بھی نہیں سمجھتے، تم نہیں دیکھ رہے ہو کہ بہت سے لوگوں نے اونچے اونچے محل اس لئے کھڑے کیئے ہیں کہ ان میں زناکاری کی جائے اور شرابیں ڈھالی جائیں، جُوا کھیلا جائے، لیکن تم اس میں دخل نہیں دیتے اور اس حال کو نہیں بدلتے، کیا حال ہے

اُن بڑے بڑے شہروں کا جن میں چھ سو سال سے کسی پر حدِ شرعی نہیں جاری ہوئی جب کوئی کمزور مل جاتا ہے تو اسے پکڑ لیتے ہو اور جب کوئی قوی ہوتا ہے تو چھوڑ دیتے ہو۔ تمہاری ساری ذہنی قوتیں اس پر صرف ہو رہی ہیں کہ لذیذ کھانوں کی قسمیں پکواتے رہو اور نرم گداز جسم والی عورتوں سے لطف اٹھاتے رہو، اچھے کپڑوں اور اونچے مکانات کے سوا تمہاری توجہ اور کسی چیز کی طرف منعطف نہیں ہوتی۔ کیا تم نے اپنے سر کبھی اللہ کے سامنے جھکائے؟ خدا کا نام تمہارے پاس صرف اس لئے رہ گیا ہے کہ اپنے تذکروں اور قصّے کہانیوں میں اس نام کو استعمال کرو، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کے لفظ سے تمہاری مراد زمانہ کا انقلاب ہے کیونکہ تم اکثر بولتے ہو خدا قادر ہے کہ ایسا کر دے یعنی زمانہ کے انقلاب کی یہ تعبیر ہے۔

اہلِ صنعت و حرفت سے خطاب

اربابِ پیشہ! دیکھو! امانت کا جذبہ تم سے مفقود ہو گیا ہے، تم اپنے رب کی عبادت سے بالکل خالی الذہن ہو چکے ہو، اور تم اپنے فرضی بنائے ہوئے معبودوں پر قربانیاں چڑھاتے ہو، تم مدارا اور سالار کاج کرتے ہو، تم میں بعض لوگوں نے فال بازی اور ٹوٹکا اور گنڈے وغیرہ کا پیشہ اختیار کر رکھا ہے، یہی ان کی دولت ہے اور یہی ان کا ہنر ہے، یہ لوگ خاص قسم کا لباس اور جامہ اختیار کرتے ہیں، خاص طرح سے کھانے کھاتے ہیں، ان میں جن کی آمدنی کم ہوتی ہے وہ اپنی عورتوں اور اپنے بچوں کے حقوق کی پروا نہیں کرتے، تم میں بعض صرف شراب خوری کو پیشہ بنائے ہوئے ہیں اور

تم ہی میں کچھ لوگ عورتوں کو کرایہ پر چلا کر پیٹ پالتے ہیں۔ یہ کیسا بدبخت آدمی ہے اپنی دنیا اور آخرت دونوں کو برباد کر رہا ہے۔ حالانکہ حق تعالیٰ نے تمہارے لئے مختلف قسم کے پیشے اور کمانے کھانے کے دروازے کھول رکھے ہیں، جو تمہاری اور تمہارے متعلقین کی ضرورتوں کے لئے کافی ہو سکتے ہیں، بشرطیکہ تم اعتدال کی راہ اپنے خرچ میں اختیار کرو، اور محض اتنی روزی پر قناعت کرنے کے لئے آمادہ ہو جاؤ جو تمہیں بآسانی اخروی زندگی کے نتائج تک پہونچادے، لیکن تم نے خدا کی ناشکری کی، اور غلط راہ حصولِ رزق کی اختیار کی، کیا تم جہنم کے عذاب سے نہیں ڈرتے، جو بڑا بُرا ٹھکانا ہے۔

دیکھو! اپنی صبح و شام کو تم خدا کی یاد میں بسر کیا کرو، اور دن کے بڑے حصہ کو اپنے پیشہ میں صرف کرو اور رات کو اپنی عورتوں کے ساتھ گزارو، اپنے خرچ کو اپنی آمدنی سے ہمیشہ کم رکھا کرو، پھر جو بچ جایا کرے اس سے مسافروں کی، مسکینوں کی مدد کیا کرو اور کچھ اپنے اتفاقی مصائب اور ضرورتوں کے لئے پسماندہ بھی کیا کرو، تم نے اگر اس راہ کو اختیار نہ کیا تو تم غلط راہ پر جا رہے ہو، اور تمہاری تدبیر درست نہیں ہے۔"

تفہیمات ص ۲۱۷

پھر اسی طرح مشائخ کی اولاد، اس زمانہ کے طلبۂ علم اور واعظوں زاہدوں کو بھی آپ نے خصوصیت کے ساتھ پکارا ہے، مثلاً مشائخ کی اولاد کو نصیحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

مشائخ کی اولاد یعنی پیرزادوں سے خطاب

اے وہ لوگو! جو اپنے آبا و اجداد کے رسوم کو بغیر کسی حق کے پکڑے ہوئے ہو، یعنی گذشتہ بزرگانِ دین کی اولاد میں ہو، میرا آپ سے سوال ہے کہ آپ کو کیا ہو گیا ہے کہ ٹکڑیوں ٹکڑیوں، ٹولیوں ٹولیوں میں آپ بٹ گئے ہیں، ہر ایک اپنے اپنے راگ اپنی منڈلی میں الاپ رہا ہے اور جس طریقہ کو اللہ نے اپنے رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے نازل فرمایا تھا اور محض اپنے لطف و کرم سے جس راہ کی طرف راہنمائی فرمائی تھی۔ اُسے چھوڑ کر ہر ایک تم میں ایک مستقل پیشوا بنا ہوا ہے اور لوگوں کو اسی کی طرف بلا رہا ہے، اپنی جگہ اپنے کو راہ نما ٹھہرائے ہوئے ہے، حالانکہ در اصل وہ خود گم کردہ راہ اور دوسروں کو بھٹکانے والا ہے، ہم ایسے لوگوں کو قطعاً پسند نہیں کرتے جو محض لوگوں کو اس لئے مرید کرتے ہیں تاکہ ان سے ٹکے وصول کریں، ایک علم شریف کو سیکھ کر دنیا بٹورتے ہیں، کیونکہ جب تک اہل دین کی شکل و شباہت اور طرز و انداز وہ نہ اختیار کریں گے دنیا حاصل نہیں ہو سکتی۔

اور نہ میں ان لوگوں سے راضی ہوں جو سوائے اللہ و رسولؐ کے خود اپنی طرف لوگوں کو بلاتے ہیں اور اپنی مرضی کی پابندی کا لوگوں کو حکم دیتے ہیں، یہ لوگ بٹ مار اور راہ زن ہیں ان کا شمار دجّالوں کذّابوں، فتانوں اور ان لوگوں میں ہے جو خود فتنہ اور آزمائش کے شکار ہیں۔

خبردار! خبردار! ہرگز اس کی پیروی نہ کرنا جو اللہ کی کتاب اور رسول کی سنت کی طرف دعوت نہ دیتا ہو اور اپنی طرف بلاتا ہو، اور

چاہیئے کہ زبانی جمع خرچ صوفیائے کرام کے اشاروں کے متعلق عام مجلسوں میں نہ کیا جائے کیونکہ مقصد تو (تصوف) سے صرف یہ ہے کہ آدمی کو احسان کا مقام حاصل ہو جائے، لوگو، دیکھو! کیا تمہارے لئے اللہ تبارک و تعالیٰ کے اس ارشاد میں کوئی عبرت نہیں ہے؟ "وان هذا صراطی مستقیما فاتبعوه و لا تتبعوا السُّبُل فتفرق بکم عن سبیله" یہ میری راہ ہے سیدھی، تو اس پر چل پڑو اور مختلف راہوں کے پیچھے نہ پڑو وہ تمہیں اللہ کی راہ سے بچھڑا دیں گے۔

انعام ۱۵۳

غلط کار علماء سے خطاب

ارے بدعقلو! جنھوں نے اپنا نام علماء رکھ چھوڑا ہے، تم یونانیوں کے علوم میں ڈوبے ہوئے اور صرف ونحو و معانی میں غرق ہو اور سمجھتے ہو کہ یہی علم ہے، یاد رکھو! علم یا تو قرآن کی کسی آیت محکم کا نام ہے یا سنتِ ثابتہ قائمہ کا چاہیئے کہ قرآن سیکھو، پہلے اس کے غریب لغات کو حل کرو، پھر سبب نزول کا پتہ چلاؤ اور اس کے مشکلات کو حل کرو، اسی طرح جو حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحیح ثابت ہو چکی ہے، اسے محفوظ کرو، یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز کس طرح پڑھتے تھے، وضو کرنیکا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا کیا طریقہ تھا، اپنی ضرورت کے لئے کس طرح جاتے تھے اور حج کیونکر ادا فرماتے تھے، جہاد کا آپ کے کیا قاعدہ تھا، گفتگو کا کیا انداز تھا، اپنی زبان کی حفاظت کس طرح فرماتے تھے، حضور صلعم

کے اخلاق کیا تھے، چاہتے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری روش کی پیروی کرو، اور آپ کی سنت پر عمل کرو مگر اس میں بھی اس کا خیال رہے کہ جو سنت ہے اسے سنت ہی سمجھو، نہ کہ اس کو فرض کا درجہ عطا کرو اسی طرح چاہیئے کہ جو تم پر فرائض ہیں انھیں سیکھو مثلاً وضو کے ارکان کیا ہیں؟ نماز کے ارکان کیا ہیں؟ زکوٰۃ کا نصاب کیا ہے؟ قدر واجب کیا ہے؟ میت کے حصوں کی مقدار کیا ہے؟ پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عام سیرت کا مطالعہ کرو جس سے آخرت کی رغبت پیدا ہو، صحابہؓ اور تابعین کے حالات پڑھو، اور یہ چیزیں فرائض سے فاضل اور زیادہ ہیں، لیکن ان دنوں تم جن چیزوں میں الجھے ہوئے ہو اور جس میں سر کھپا رہے ہو، اس کو آخرت کے علم سے کیا واسطہ؟ یہ دنیا کے علوم ہیں؟

پھر ان ہی طلبار کو فرماتے ہیں :۔

جن علوم کی حیثیت صرف ذرائع اور آلات کی ہے (مثلاً صرف ونحو وغیرہ) تو ان کی حیثیت آلہ اور ذریعہ ہی کی رہنے دو، نہ کہ خود انھیں کو مستقل علم بنا بیٹھو، علم کا پڑھنا تو اس لئے واجب ہے کہ اس کو سیکھ کر مسلمانوں کی بستیوں میں اسلامی شعائر کو رواج دو، لیکن تم نے دینی شعار اور اس کے احکام کو تو پھیلایا نہیں اور لوگوں کو زائد از ضرورت باتوں کا مشورہ دے رہے ہو۔

تم نے اپنے حالات سے عام مسلمانوں کو یہ باور کرا دیا ہے کہ علمار کی بڑی کثرت ہو چکی ہے، حالانکہ ابھی کتنے بڑے بڑے علاقے ہیں، جو علمار سے خالی ہیں اور جہاں علمار بھی پائے جاتے ہیں وہاں بھی دینی شعاروں کو غلبہ حاصل نہیں ہے۔ پھر آپنے ان

لوگوں کو بھی مخاطب کیا ہے جنھوں نے اپنے وسوسوں کا نام دین رکھ چھوڑا ہے اور ان کے وسواسی معیار پر پورا نہیں اترتا گویا دین سے وہ خارج ہے، اس گروہ میں زیادہ تر زہاد، عبّاد اور وعّاظ ہی اس زمانہ میں مبتلا تھے اس لئے عنوان کا آغاز انھیں سے کیا گیا ہے، فرماتے ہیں:۔

دین میں تنگی پیدا کرنے والے واعظوں اور کنج نشین زاہدوں سے خطاب

دین میں خشکی اور سختی کی راہ اختیار کرنے والوں سے میں پوچھتا ہوں اور واعظوں اور عابدوں اور ان کنج نشینوں سے سوال ہے جو خانقاہوں میں بیٹھے ہیں کہ یہ جبر اپنے اوپر دین کو عائد کرنے والو! تمہارا کیا حال ہے ہر بری بھلی بات، ہر رطب ویابس پر تمہارا ایمان ہے، لوگوں کو تم جعلی اور گڑھی ہوئی حدیثوں کا وعظ سناتے ہو، اللہ کی مخلوق پر تم نے زندگی تنگ کر چھوڑی ہے، حالانکہ تم تو (اے امّت محمدیہ) اس لئے پیدا ہوئے تھے کہ لوگوں کو آسانیاں بہم پہونچاؤ گے نہ کہ ان کو دشواریوں میں مبتلا کر دوگے، تم ایسے لوگوں کی باتیں دلیل میں پیش کرتے ہوئے جو بیچارے مغلوب الحال تھے۔ اور عشق و محبت الٰہی میں عقل وحواس کھو بیٹھے تھے، حالانکہ اہل عشق کی باتیں وہیں کی وہیں لپیٹ کر رکھ دی جاتی ہیں، نہ کہ ان کا چرچا کیا جاتا ہے، تم نے وسواس کو اپنے لئے گوارا کر لیا ہے اور اس کا نام احتیاط رکھ چھوڑا ہے، حالانکہ تمہیں صرف یہ چاہیئے تھا کہ اعتقاداً وعملاً احسان کے مقام کے لئے جن امور کی

ضرورت ہے بس اسکو سیکھ لیتے، لیکن جو بیچارے اپنے اپنے خاص حال میں مغلوب تھے، خواہ مخواہ ان کی باتوں کو احسانی، خالص امور میں گڈمڈ کرنے کی حاجت نہ تھی اور نہ ارباب کشف کی چیزوں کو۔ ان میں مخلوط کرنے کی ضرورت تھی، چاہیئے کہ مقام احسان کی طرف لوگوں کو بلاؤ، پہلے اسے خود سیکھ لو، پھر دوسروں کو دعوت دو، کیا تم اتنا بھی نہیں سمجھتے کہ سب سے بڑی رحمت اور سب سے بڑا اکرم اللہ کا وہ ہے جسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پہونچایا ہے وہی صرف ہدایت ہے، جو آپ کی ہدایت ہے پھر تم کیا بتا سکتے ہو کہ تم جن افعال کو کرتے ہو وہ رسول اللہ صلعم اور آپ کے صحابۂ کرام رض کیا کرتے تھے۔"

آخر میں ایک عام خطاب عام مسلمانوں کے نام ہے جس میں کسی خاص طبقہ کی تخصیص نہیں ہے۔

فرماتے ہیں:

عام امت مسلمہ سے جامع خطاب، امراض کی تشخیص اور علاج کی تجویز

میں مسلمانوں کی عام جماعت کی طرف اب مخاطب ہوں اور کہتا ہوں، اے آدم کے بچو! دیکھو تمہارے اخلاق سو چکے ہیں۔ تم پر بیجا حرص و آز کا ہوکھا سوار ہو گیا ہے، تم پر شیطان نے قابو پا لیا ہے۔ عورتیں مردوں کے سر چڑھ گیئں ہیں اور مرد عورتوں کے حقوق برباد کر رہے ہیں۔ حرام کو تم نے اپنے لئے خوشگوار بنا لیا ہے اور حلال تمہارے لئے بدمزہ ہو چکا ہے

پھر قسم ہے اللہ کی، اللہ نے ہرگز کسی کو اس بس سے زیادہ تکلیف نہیں دی ہے، چاہیئے کہ تم اپنی شہوانی خواہشوں کو نکاح کے ذریعہ پوری کرو، خواہ تمہیں ایک سے زیادہ نکاح ہی کیوں نہ کرنا پڑے اور اپنے مصارف وضع قطع میں تکلف سے کام نہ لیا کرو۔ اسی قدر خرچ کرو جس کی تم میں سکت ہو، یاد رکھو! ایک کا بوجھ دوسرا نہیں اٹھاتا اور اپنے اوپر خواہ مخواہ تنگی سے کام نہ لو، اگر تم ایسا کرو گے تو تمہارے نفوس بالآخر فسق کے حدود تک پہونچ جائیں گے، اللہ تعالی اس کو پسند فرماتا ہے کہ اس کے بندے اس کی آسانیوں سے نفع اٹھائیں، جیساکہ یہ بھی اسی کو پسند ہے کہ جو چاہیں وہ اعلی مدارج پر احکام کی پابندی بھی کر سکتے ہیں۔ اپنے شکم کی خواہشوں کی تکمیل چاہیئے کہ کھانوں سے کرو اور اتنا کمانے کی کوشش کرو جس سے تمہاری ضرورتیں پوری ہوں، دوسروں کے سینوں کے بوجھ بننے کی کوشش نہ کرو کہ ان سے مانگ مانگ کر کھایا کرو، تم ان سے مانگو اور وہ نہ دیں، اسی طرح بیچارے بادشاہوں اور حکام کے اوپر بھی بوجھ نہ بن جاؤ، تمہارے لئے یہی پسندیدہ ہے کہ تم خود کما کر کھایا کرو، اگر تم ایسا کرو گے تو خدا تمہیں معاش کی بھی راہ سجھائیگا۔ جو تمہارے لئے کافی ہو گی۔

اے آدم کے بچو! جسے خدا نے ایک جائے سکونت د رکھی ہو جس میں وہ آرام کرے، اتنا پانی جس سے وہ سیراب ہو، اتنا کھانا جس سے بسر ہو جائے، اتنا کپڑا جس سے تن ڈھک جائے ایسی بیوی جو اس کی شرمگاہ کی حفاظت کر سکتی ہو اور اس کو رہن سہن کی جدو جہد میں مدد دے سکتی ہو تو یاد رکھو کہ دنیا کامل طور

سے اس شخص کو مل چکی ہے، چاہیئے کہ اس پر خدا کا شکر کرے۔
بہرحال کوئی نہ کوئی کمائی کی راہ آدمی ضرور اختیار کرے اور
اور اسی کے ساتھ قناعت کو اپنا دستور زندگی بنائے اور رہنے سہنے
میں اعتدال کا جادہ اختیار کرے اور اللہ کی یاد کے لئے جو فرصت
ہم دست ہو اسے غنیمت شمار کرے، کم از کم تین وقتوں صبح شام اور
پچھلی رات کے ذکر کا خاص طور پر خیال رکھے، حق تعالیٰ کی یاد اس
کی تسبیح و تہلیل اور قرآن کی تلاوت کے ذریعہ سے کیا کرے اور
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث سنے اور ذکر کے حلقوں میں
حاضر ہوا کرے۔
اے آدم کے بچو! تم نے ایسے بگڑے ہوئے رسوم اختیار
کر لئے ہیں جن سے دین کی اصلی صورت بگڑ گئی ہے۔ تم عاشورار کے
دن جھوٹی باتوں پر اکھٹے ہوتے ہو، اسی طرح شب برات میں کھیل
کود کرتے ہو، اور مردوں کے لئے کھانے پکا پکا کر کھلانے کو اچھا
خیال کرتے ہو، اگر تم سچ ہو تو اس کی دلیل پیش کرو۔
اسی طرح اور بھی بری بری رسمیں تم میں جاری ہیں جس نے
تم پر تمہاری زندگی تنگ کر دی ہے، مثلاً تقریبات کی دعوتوں
میں تم نے حد سے زیادہ تکلف برتنا شروع کر دیا ہے، اسی طرح ایک
بری رسم یہ بھی ہے کہ کچھ بھی ہو جائے لیکن طلاق کو گویا تم نے ناجائز
ٹھہرا لیا ہے، یونہی بیوہ عورتوں کو نکاح سے روکے رہتے ہو، ان
رسموں میں تم اپنی دولت ضائع کرتے ہو، وقت برباد کرتے ہو،
اور جو صحت بخش روش تھی، اسے چھوڑ بیٹھے ہو۔
تم نے اپنی نمازیں برباد کر رکھی ہیں، تم میں کچھ لوگ ہیں، جو

دنیا کمانے میں اور اپنے دھندوں میں اتنے پھنس گئے ہیں کہ نماز کا انھیں وقت ہی نہیں ملتا، کچھ لوگ ہیں، جو قصہ کہانی سننے میں وقت گنواتے ہیں، خیر پھر بھی اگر ایسی مجلسیں لوگ ایسے مقامات پر قائم کیا کرتے جو مسجدوں سے قریب ہوں تو شاید ان کی نمازیں ضائع نہ ہوتیں،

تم نے زکوٰۃ کو بھی چھوڑ دیا ہے حالانکہ کوئی ایسا دولت مند نہیں ہے جس کے اقربا، و اعزہ میں حاجت مند لوگ نہیں ہوتے اگر ان لوگوں کی وہ مدد کیا کریں اور ان کو کھلایا پلایا کریں اور زکوٰۃ کی نیت کر لیا کریں تو یہ بھی ان کے لئے کافی ہو سکتی ہے، تم میں بعضوں نے روزے چھوڑ رکھے ہیں، خصوصاً جو فوجی ملازم ہیں کہتے ہیں کہ وہ روزہ رکھنے پر قادر نہیں ہیں، یعنی جو محنت انھیں برداشت کرنی پڑتی ہے اس کے ساتھ وہ روزے نہیں رکھ سکتے، تم کو معلوم ہونا چاہیئے کہ تم نے راہ غلط کر دی ہے اور تم حکومت کے سینہ پر بوجھ بن گئے ہو، بادشاہ جب اپنے خزانہ میں اتنی گنجائش نہیں پاتا جس سے تمہاری تنخواہ ادا کرے، تب رعایا پر زندگی کو دشوار کرتا ہے، سپاہیو! یہ تمہاری کیسی بری عادت ہے،

کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو روزے رکھتے ہیں۔ لیکن سحری نہیں کرتے اور رمضان میں ان سخت کاموں کو نہیں چھوڑتے جن کی وجہ سے روزے ان پر گراں ہو جاتے ہیں۔

ملأ اعلیٰ کی طرف سے اصلاحی مطالبات کا اس زمانہ میں جن جن امور سے متعلق تقاضا ہو رہا ہے اس کا ایک طویل باب ہے لیکن کھڑکی سے آدمی بڑی نیکیوں کو جھانک سکتا ہے اور ڈھیر کے لئے اس کا نمونہ کافی ہے۔

تذکرہ حضرت شاہ ولی اللہ صفحہ

اور اقتصادی و معاشی نظام کو تباہ و برباد کرنیوالوں کو متنبہ فرمانے کے بعد شاہ صاحب نے اپنی سیاسی مہارت اور روحانی بصیرت سے قرآن و حدیث کی روشنی میں ایک ایسا جامع اور مفید نظامِ معاشیات مرتب فرمایا کہ اس کی نظیر پیش کرنے سے دنیا عاجز ہے اور شاہ صاحب کے انتقال کے پچاس پچپن سال بعد جو "نظریہ اقتصادیات" دنیا کے سامنے پیش کیا گیا، جس کو معاشیات کے حل میں شاہکار کا درجہ دیا جاتا ہے اور کارل مارکس جس کو اقتصادیات کے حل کا داعی اور موسس کہا جاتا ہے اور اس نظریہ کا زبردست حامی اور کارل مارکس کا دست راست استالن وہ بھی شاہ صاحب کے مرتب کردہ اصول وضوابط کو سن کر دنگ رہ گیا۔ جیسا کہ مولانا عبیداللہ سندھیؒ تحریر فرماتے ہیں کہ :

"میں نے شاہ صاحب کے فکر کی روشنی میں اسلام کا معاشی فکر استالن کے سامنے پیش کیا تو وہ بہت متاثر ہوا۔"

شاہ ولی کی سیاسی تحریک ص۱۵

مگر افسوس یہ ہے کہ پریس اور پروپیگنڈے کی وہ طاقت جو مارکس کے متبعین کو اور انقلابِ فرانس کے داعیان کو حاصل ہوئی وہ حضرت شاہ صاحبؒ کے افکار کی اشاعت کے لئے میسّر نہ آسکی۔ ورنہ اہل دنیا ہزار اسلام بیزاری اور مذہب بیزاری کے ولی اللہی فکر کو گلے لگاتے اور کارل مارکس ــــــ اور استالن کی جانب نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھتے۔ ناظرین کو شاہ صاحب کے اصول معاشیات روشناس کرانے کے لئے چند اصول پیش کئے جاتے ہیں۔

ملاحظہ فرمائیں :

شاہ صاحب کے اقتصادی اُصول

۱۔ دولت کی اصل بنیاد محنت ہے۔ مزدور کاشتکار قوت کاسبہ ہیں۔ باہمی تعاون مدنیت (شہریت) کی روح رواں ہیں، جب تک کوئی شخص ملک وقوم کے لئے کام نہ کرے ملک کی دولت میں اس کا حصہ نہیں۔

(حجۃ اللہ البالغہ، باب سیاستہ المدینہ۔ البدور البازغہ، بحث الاتفاق الثابت اور الخیر الکثیر)

۲۔ جوا، سٹہ اور عیاشی کے اڈے ختم کئے جائیں جن کی موجودگی میں تقسیم دولت کا صحیح نظام قائم نہیں ہو سکتا۔

(حجۃ اللہ البالغہ ۔ باب ابتغاء الرزق)

۳۔ مزدور کاشتکار اور جو لوگ ملک وقوم کے لئے دماغی کام کریں، دولت کے اصل مستحق ہیں۔ ان کی ترقی وخوش حالی ملک وقوم کی ترقی وخوشحالی ہے۔ جو نظام ان قوتوں کو دبائے وہ ملک کے لئے خطرہ ہے۔

(حجۃ اللہ البالغہ ۔ باب ابتغاء الرزق)

۴۔ جو سماج محنت کی صحیح قیمت ادا نہ کرے، مزدوروں اور کاشتکاروں پر بھاری ٹیکس لگائے قوم کا دشمن ہے۔

(حجۃ اللہ البالغہ ۔ باب السیاستہ المدینۃ ایضاً باب الرسوم السائرہ بین الناس)

۵۔ جو پیداوار اور آمدنی باہمی تعاون کے اصول پر نہ ہو وہ خلاف قانون ہے۔

(حجۃ اللہ البالغہ ۔ باب ابتغاء الرزق)

۶۔ کام کے اوقات محدود کئے جائیں، مزدوروں کو اتنا وقت

ضرور ملنا چاہیئے کہ وہ اخلاقی و روحانی اصلاح کر سکیں اور ان کے اندر مستقبل کے متعلق غور و فکر کی صلاحیت پیدا ہو سکے۔

(حجۃ اللہ البالغہ۔ باب ثانیہ الارتفاقات و باب اصلاح الرسوم و باب ضبط المبہم)

۷۔ تعاون باہمی کا بڑا ذریعہ تجارت ہے۔ لہٰذا اس کو تعاون کے اصول پر ہی جاری رہنا چاہیئے پس تاجروں کے لئے جائز نہیں کہ وہ بلیک مارکیٹ یا غلط قسم کے کمیشن لگا کر تجارت کے فروغ و ترقی میں رکاوٹ پیدا کریں۔

(حجۃ اللہ البالغہ۔ باب البیوع المنہی عنہا)

۸۔ وہ کاروبار جو دولت کی گردش کو کسی خاص طبقہ میں منحصر کر دے۔ ملک کے لئے تباہ کن ہے۔

(حجۃ اللہ البالغہ۔ باب الارتفاق الرابع و باب البیوع المنہی عنہا)

۹۔ وہ شاہانہ نظامِ زندگی جس میں چند اشخاص یا چند خاندانوں کے عیش و عشرت کے سبب سے دولت کی صحیح تقسیم میں خلل واقع ہو اس کا مستحق ہے کہ اس کو جلد از جلد ختم کر کے عوام کی مصیبت ختم کی جائے اور ان کو مساویانہ نظام زندگی کا موقع دیا جائے۔

(حجۃ اللہ البالغہ۔ باب الرسوم السائرۃ بین الناس، باب السیاستہ المدنیتہ وایضاً باب ابتغاء الرزق و باب البیوع المنہی عنہا)

سیاست اور نظام حکومت کے بنیادی اصول

۱۔ زمین کا حقیقی مالک اللہ ہے۔ باشندگانِ ملک کی حیثیت وہ ہے جو کسی مسافر خانہ میں ٹھہرنے والوں کی۔ ملکیت کا مطلب یہ ہے کہ اس کے حق انتفاع میں دوسرے کی دخل اندازی قانوناً ممنوع ہو۔

(حجۃ اللہ البالغہ، باب ابتغاء الرزق)

۲۔ سارے انسان برابر ہیں کسی کو حق نہیں کہ وہ اپنے آپ کو مالکِ ملک، ملک الناس، مالک قوم یا انسانوں کی گردنوں کا مالک تصور کرے نہ کسی کے لئے جائز ہے کہ وہ کسی صاحب اقتدار کے لئے ایسے الفاظ استعمال کرے۔

(شاہ اسماعیل شہید۔ منصب امامت۔ ذکر سلطنت ضالہ)

۳۔ اسٹیٹ کے سربراہ کی وہ حیثیت ہے جو کسی وقف کے متولی کی، وقف کا متولی اگر ضرورت مند ہو تو اتنا وظیفہ لے سکتا ہے کہ تمام باشندۂ ملک کی طرح گزارسکے۔

(ازالۃ الخفاء۔ جلد دوم عہد فاروق اعظم)

بنیادی حقوق

۱۔ روٹی، کپڑا، مکان اور ایسی استطاعت کہ نکاح کر سکے اور بچوں کی تعلیم و تربیت کر سکے، بلا لحاظ مذہب و نسل ہر ایک انسان کا پیدائشی حق ہے۔

۲۔ مذہب رنگ و نسل کے تفاوت کے بغیر عام باشندگان کے معاملات میں یکسانیت کے ساتھ عدل و انصاف اور ان کے جان و مال کی حفاظت، ان کی عزت و ناموس، حق ملکیت میں آزادی، حقوق شہریت میں یکسانیت، ہر باشندہ ملک کا بنیادی حق ہے۔

۳۔ زبان اور تہذیب کو زندہ رکھنا ہر فرقہ کا بنیادی

حق ہے۔

(حجۃ اللہ البالغہ اور البدور البازغۃ)

بین الاقوامی تحفظات

ان حقوق کو حاصل کرنے کی شکل یہ ہے کہ خود مختار علاقہ بنائے جائیں۔ یہ خود مختار اکائیاں اپنے معاملات میں آزاد ہوں گی۔ ہر ایک یونٹ میں اتنی طاقت ضرور ہونی چاہیئے کہ اپنے جیسے یونٹ کا مقابلہ کر سکے۔ یہ تمام اکائیاں ایک ایسے بین الاقوامی نظام (بلاک) میں منسلک ہوں جو فوجی طاقت کے لحاظ سے اقتدار اعلیٰ کا مالک ہو۔ اس کو یہ حق نہیں ہوگا کہ کسی مخصوص مذہب یا مخصوص تہذیب کے کسی یونٹ پر حملہ کر سکے۔

(حجۃ اللہ البالغہ اور البدور البازغۃ)

مذہبیات

۱۔ (الف) دین اور سچائی کی اصل بنیاد ایک ہے، اس کے پیش کرنے والے ایک ہی سلسلہ کی کڑیاں ہیں۔

(ب) داعیان صداقت ہر ملک اور ہر قوم میں گزرے ہیں۔ ان سب کا احترام ضروری ہے۔

(ج) سچائی اور دین کے بنیادی اصول تمام فرقوں میں تقریباً تسلیم شدہ ہیں۔ مثلاً پروردگار کی عبادت اس کے لئے نذر و نیاز، صدقہ خیرات، روزہ وغیرہ یہ سب کام سب کے نزدیک اچھے ہیں۔ البتہ عملی صورتوں میں اختلاف ہے۔

(د) ساری دنیا کے سماجی اصول اور ان کا منشاء و مقصد ایک ہے مثلاً ہر ایک مذہب اور ہر ایک فرقہ میں جنسی انارکی کو ناپسند اور اخلاقی جرم قرار دیتا ہے۔ ایسے ہی ہر ایک فرقہ مردہ کو نظروں سے غائب کر دینا ضروری سمجھتا ہے۔ اختلاف اس میں ہے کہ زمین میں دفن کر کے نظروں سے اوجھل کیا جائے یا جلا کر۔

حجۃ اللہ البالغہ۔ باب اصل الدین واحد۔ البدور البازغۃ۔ فصل حق الارتفاقات اور مقالہ ثالثہ وغیرہ)

۲۔ جہاد ایک مقدس فرض ہے مگر اس کے معنی یہ ہیں کہ مقدس اصول کے لئے انسان اپنے اندر جذبۂ فدائیت پیدا کرے یہاں تک کہ اپنی ہستی کو ان اصولوں کے لئے فنا کر دے۔

البدور البازغۃ الارتفاقات الثالث۔ حجۃ اللہ البالغہ

مقدمہ تحریک شیخ الہند ج ۲ ص ۱۲۷

ترجمہ قرآن مجید

یہ ایک ناقابل فراموش حقیقت ہے کہ سیاسی زوال کے ساتھ قوموں پر تہذیبی اور علمی زوال بھی آتا ہے۔ شاہ صاحب نے بادشاہوں اور مسلمانوں کے انحطاط و زوال کا گہرا مطالعہ کرنے کے بعد اور اس کا سیاسی و معاشی حل پیش کرنے کے ساتھ علوم قرآنیہ کی ترویج و اشاعت کو بنیادی حیثیت دیکر مسلمانوں کا رشتہ براہ راست قرآن پاک سے جوڑنے کی سعی فرمایا۔ اور اس سعی کا سب سے روشن و تابناک کارنامہ فتح الرحمٰن فی ترجمۃ القرآن ہے۔ جس میں شاہ صاحب نے قرآن مجید کا فارسی ترجمہ اور اس کے تشریحی فوائد لکھ کر مسلمانوں کے ذہن و دماغ کو قرآن مجید سے قریب تر کرنے کی مخلصانہ جد و جہد کی جس پر گندم نما جو فروشوں اور علم کے نام پر اپنی اجارہ داری قائم کرنے والے مدعیانِ علم جہال کا برافروختہ

ہونا لازمی تھا۔ لہذا یہ سب طیش میں آکر شاہ صاحب کے خلاف کمربستہ ہو گئے اور جب کچھ بس نہ چلا تو شاہ صاحب کے قتل کے درپے ہو گئے مگر اللہ نے خصوصی مدد فرما کر ان کے اس ارادہ میں ان کو ناکام کر دیا۔ اور شاہ صاحب کی تحریک کامیابی کی طرف بڑھتی رہی۔ جیسا کہ حضرت مولانا سید محمد میاں صاحب مرحوم تحریر فرماتے ہیں کہ:

"حضرت شاہ ولی اللہؒ نے قرآن مجید کا ترجمہ اس وقت کی دفتری زبان فارسی میں کیا تو مولوی نما جاہ پرست مشتعل ہو گئے ....
اور اسی غضب اور طیش میں انھوں نے حضرت شاہ صاحب پر قاتلانہ حملہ کرایا۔ جس کی مدافعت قدرت کے اس غیبی ہاتھ نے کی جو تاریخ عالم میں عظمت پانے والوں کی حفاظت ہر ایسے موقعہ پر کیا کرتا ہے۔

تحریک شیخ الہند ص۴۸

شاہ صاحب سے پہلے قرآن مجید کی افہام و تفہیم کا عام رواج نہ تھا۔ اس عہد کے بعض علماء بھی قرآن مجید اور اس کی تعلیمات سے کما حقہ واقف نہ تھے۔ شیخ محمد اکرام نے لکھا ہے کہ:

"اکبر کے دربار میں جب مسلمان علماء اور پرتگیز مشنریوں میں مباحثے ہوتے اور مشنریوں نے (جو کلام مجید کے لاطینی ترجمہ کی وجہ سے اسکے اندراجات سے خوب واقف تھے) کلام مجید کے بعض حصوں پر اعتراض کیے تو اس وقت پتا چلا کہ جن مسلمانوں نے عربی میں قرآن پڑھا بھی تھا انھیں بھی اس کے مضامین اور اندراجات سے پوری طرح واقفیت نہ تھی۔ بسا اوقات یہ ہوتا کہ پادری کلام مجید کے کسی بیان پر اعتراض کرتے اور مسلمان

کہدیتے کہ یہ تو قرآن مجید میں ہے ہی نہیں اور پھر جب کلام مجید
کھول کے دیکھا جاتا تو وہ حوالے نکلتے"

رود کوثر ص۵۵۲

شاہ صاحب کو علماء سوء کی مجرمانہ غفلت کا خوب احساس تھا۔ انھوں نے
علماء سوء اور جاہل مشائخ کے علی الرغم قرآن مجید کا فارسی ترجمہ کیا اور عوامی
درس قرآن مجید کی بنیاد ڈالی جس کی وجہ سے شاہ صاحب کی خوب مخالفت
ہوئی۔ لیکن آپ نے جاہل صوفیوں اور بداندیش مشائخ کی پرواہ نہیں کی اور
اپنی منزل مقصود کی طرف تیز گام رہے اور اس کا عام احساس قلوب میں پیدا
فرمایا کہ کامیابی کی کنجی قرآن سے رشتہ جوڑنا اور اس رشتہ کو توڑنا تباہی و
بربادی کی اساس ہے اور اس احساس کو اتنا پروان چڑھایا اور لوگوں کے
قلوب میں اس طرح موجزن کیا کہ صدیوں کے بعد بھی ہر مصلح قوم اس کا اعتراف
کرنے پر مجبور نظر آتا ہے۔

لہذا شیخ الہند مولانا محمود حسن اسیر مالٹا کے متعلق مفتی محمد شفیعؒ مفتی اعظم
پاکستان تحریر فرماتے ہیں:

"مالٹا کی قید سے واپس آنے کے بعد ایک رات بعد عشاء دارالعلوم
میں تشریف فرما تھے۔ علماء کا بڑا مجمع سامنے تھا۔ اس وقت فرمایا کہ
ہم نے مالٹا کی زندگی میں دو سبق سیکھے ہیں یہ الفاظ سن کر سارا مجمع
ہمہ تن گوش ہوگیا کہ اس استاذ العلماء درویش نے اسی سال علماء
کو درس دینے کے بعد آخر عمر میں جو سبق سیکھے ہیں وہ کیا ہیں فرمایا
کہ: میں نے جہاں تک جیل کی تنہائیوں میں غور کیا کہ پوری دنیا میں
مسلمان دینی اور دنیوی ہر حیثیت سے کیوں تباہ ہو رہے ہیں تو
اس کے دو سبب معلوم ہوئے۔

ایک ان کا قرآن کو چھوڑ دینا دوسرے ان کے آپس کے اختلافات اور خانہ جنگی اسلئے میں وہیں سے یہ عزم لے کر آیا ہوں کہ اپنی باقی زندگی اسی کام میں صرف کروں کہ قرآن کریم لفظاً اور معناً عام کیا جائے۔

وحدتِ امت ص۲۰

منفرد اسلوب

شیخ الاسلام شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی شہرہ آفاق شخصیت ان کے علمی و تحقیقی کارناموں ان کی تجدیدی خدمات کیساتھ ساتھ ان کا منفرد انداز و یگانہ اسلوب نگارش بھی کسی تعارف و تعریف کا محتاج نہیں۔

شاہ صاحب ایک ایسے منفرد اسلوب کے موجد ہیں جو جامعیت اور خطابت، قوت استدلال اور سادگی و شگفتگی میں نبی عربی ؐ کے طرز تکلم سے بڑی حد تک مشابہ ہے جیسا کہ ہندوستان کے نامور عالم دین مولانا مناظر احسن گیلانی مرحوم لکھتے ہیں کہ:

> " شاہ صاحب پہلے آدمی ہیں جنھوں نے اپنی عبارتوں میں زیادہ تر 'جوامع الکلم' والنبی الخاتم صلی اللہ علیہ وسلم کے طرز گفتگو کی پیروی کی ہے۔ حتی الوسع وہ اس کی کوشش کرتے ہیں کہ اپنے مدعا کا اظہار انہی لغات اور ان ہی محاوروں سے کریں جو لسانِ نبوت اور زبانِ رسالت سے خاص تعلق رکھتے ہیں۔"

شاہ صاحب ہندوستانی ہونے کے باوجود اہل عرب کی طرح فصیح بلیغ زبان لکھتے تھے، آپ کی زبان کی روانی اور عربیت سے بڑے بڑے ادیب بھی متاثر ہو جاتے تھے اور اس باب میں شاہ صاحب کی شاہکار اور شہرۂ آفاق تصنیف " حجۃ اللہ البالغہ " ہے جس میں شاہ صاحب نے احکام

شریعت کی حکمتوں، مصلحتوں اور علتوں کو بڑے محققانہ اور عارفانہ انداز سے بیان کیا ہے۔

شاہ صاحب دنیائے اسلام میں پہلے عالم دین اور محرم راز شریعت ہیں جنھوں نے اس عظیم الشان موضوع پر قلم اٹھایا اور بے نظیر کتاب تصنیف فرمادی۔ شاہ صاحب سے پہلے امام غزالیؒ، شیخ اکبرؒ، علامہ خطابیؒ اور شیخ الاسلام عزالدین بن عبدالسلامؒ نے بھی بعض احکام کی حکمتوں اور مصلحتوں کو بیان کیا ہے۔ لیکن ان کی کوئی مستقل تصنیف نہیں ہے۔ شاہ صاحب اس موضوع پر متقدمین کی مختصر کوششوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"متقدمین نے ان مصالح کی نقاب کشائی کی ہے جن کی ابواب شرعی میں رعایت کی گئی ہے۔ بعد کے محققین نے بعض قیمتی نکتے بھی بیان کئے ہیں۔ لیکن اس کی مقدار اتنی ہی ہے کہ اب اس موضوع پر کلام کرنا خرق اجماع نہیں رہا۔ کسی نے اس موضوع پر مستقل تصنیف نہیں کی اور اس کے اصول و فروع کو پورے طور پر مرتب نہیں کیا۔"

مقدمہ حجۃ اللہ البالغہ ص۳

مولانا شبلی نعمانی مرحوم لکھتے ہیں:

"حجۃ اللہ البالغہ جس میں شاہ صاحب نے شریعت کے حقائق و اسرار بیان کئے ہیں۔ درحقیقت علم کلام کی روح رواں ہے علم کلام درحقیقت اس کا نام ہے کہ مذہب اسلام کی نسبت ثابت کیا جائے کہ وہ منزل من السماء ہے۔"

رود کوثر ص۵۴۹

مشہور و معروف عربی عالم شیخ مصطفےٰ مکی تحریر فرماتے ہیں۔
"جب حجۃ اللہ البالغہ عرب میں پہنچی تو علماء اسے دیکھ کر حیران ہو گئے، مصر میں چونکہ ادب کا مشغلہ زیادہ ہے۔ ان لوگوں نے ادب کے پیرایہ میں تعمق نظر ڈالی اور دیکھ کر حیرت زدہ ہوئے کہ ایک ہندی کی ایسی تحریر کہ عرب کے کملا بھی نہیں لکھ سکتے۔"

تصنیفات و تالیفات

شاہ صاحب کثیر التصانیف بزرگ ہیں، آپ کی تصانیف کی تعداد میں تذکرہ نگاروں کا شدید اختلاف پایا جاتا ہے۔ بعض مورخین دو سو سے زائد بیان کرتے ہیں۔ سید محمد نعمان شاگرد شاہ صاحب کے خط میں نوے کی تعداد لکھی ہے۔ مولانا علی میاں صاحب نے ترپن ۵۳ کی تعداد تحریر کی ہے۔ لیکن یہ اختلاف محض اس سبب سے ہے کہ شاہ صاحب کے مختلف رسائل الگ الگ بھی شائع ہوئے ہیں اور کئی کئی رسالے ساتھ بھی چھپے ہیں، بہرحال شاہ صاحب کی بعض تصانیف بہت ضخیم اور بعض بہت مختصر ہیں، ان کی تصانیف کی فہرست مختصر تعارف کے ساتھ ہدیہ ناظرین ہے۔

۱۔ فتح الرحمٰن فی ترجمۃ القرآن

شاہ صاحب ہندوستان کے پہلے عالم دین ہیں جنھوں نے قرآن کریم کا فارسی ترجمہ کیا اور ترجمہ بھی نہایت سلیس اور مطلب خیز!

شاہ صاحب کے بعد قرآن مجید کے جو ترجمے ہوئے ہیں ان تمام ترجموں میں شاہ صاحب کا رنگ ہے۔ اس ترجمہ کے ساتھ جا بجا "تشریحی فوائد" ہیں جو بہت ہی اہم اور مفید ہیں۔ یہ ترجمہ متعدد بار ہند و پاک سے شائع ہو چکا

ہے۔ حسن اتفاق سے یہ ترجمہ کتب خانہ جامعہ رحیمیہ مرکز شاہ ولی اللہ میں موجود ہے۔ پاکستانی مطبوعہ ہے۔

۲۔ الفوز الکبیر فی اصول التفسیر

شاہ صاحب نے فارسی زبان میں اصول تفسیر میں نہایت مختصر رسالہ تحریر فرمایا ہے۔ راقم الحروف کے خیال میں یہ مختصر رسالہ علامہ سیوطیؒ کی کتاب "الاتقان فی تفسیر القرآن" پر بھی بھاری ہے علماء نے اس رسالہ کی اہمیت وافادیت کے پیش نظر دینی مدارس کے نصاب میں داخل کیا ہے، یہ فارسی رسالہ اردو اور عربی میں منتقل ہوگیا ہے۔

۳۔ فتح الخبیر بما لا بد من حفظہ فی علم التفسیر

یہ عربی رسالہ ہے، جس میں قرآن مجید کے مشکلات اور غرائب کی تشریح وتوضیح کی گئی ہے اور آیات قرآنی کے اسباب نزول پر گاہ بگاہ روشنی ڈالی گئی ہے۔

الفوز الکبیر کے ساتھ یہ مجموعہ شائع ہوا ہے۔

۴۔ تاویل الاحادیث فی امور قصص الانبیاء

رسولوں، نبیوں کے مکذبین پر عذاب الٰہی آئے اور رسول کے ذریعہ جن معجزات کا ظہور ہوا اس کتاب میں ان کو مطابق فطرت ثابت کیا گیا ہے۔ بہر حال یہ شاہ صاحب کا کمال فن ہے۔

۵۔ المسوّیٰ من الموطأ

"المسوّیٰ" موطاء امام مالک کی مبسوط عربی شرح ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اسی شرح میں شاہ صاحب کا مجتہدانہ رنگ نمایاں ہوتا ہے، ہندوپاک اور مکہ مکرمہ سے شائع ہوچکی ہے۔

۶۔ المصفّٰی شرح الموطأ

موطا، امام مالک کی فارسی شرح ہے، اس میں آپ نے احادیث اور آثار کو الگ الگ کر دیا ہے اور امام مالکؒ کے اقوال کو مناسب طریقہ سے بیان کیا ہے اور احادیث پر مجتہدانہ انداز سے بحث کی ہے۔

۷۔ شرح تراجم ابواب صحیح البخاری

شاہ صاحب نے امام بخاریؒ کے عنوانات ابواب کی اس طرح توجیہہ و تشریح کی ہے کہ ابواب و احادیث میں مناسبت پیدا ہو جاتی ہے، یہ رسالہ عربی میں ہے۔ دائرۃ المعارف حیدر آباد اور اصح المطابع کراچی نے اسے صحیح بخاری کے ساتھ شائع کیا ہے۔

۸۔ حجۃ اللہ البالغۃ

حضرت شاہ ولی اللہ محدث کی شاہکار تصنیف ہے۔ شاہ صاحب نے اسلامی تعلیمات و دینی احکامات کو مطابق فطرت اور مبنی بر عدل ثابت کیا ہے ہر حکم الہی اور امر شریعت کے اسرار و مصالح نہایت مدلل انداز سے بیان کیا ہے۔

افسوس ہے کہ مولانا عبید اللہ سندھیؒ اور حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب مرحوم کے بعد یہ کتاب یتیم ہو گئی ہے۔ علمائے ہند نے اس کتاب کو شجرہ ممنوعہ قرار دے دیا ہے۔ اچھے سے اچھے عالم دین اس کا نام سنتے ہی دہشت زدہ ہو جاتے ہیں۔ حالانکہ اس کتاب کی زبان بہت ہی آسان ہے اور معمولی غور و فکر کے بعد مطلب سمجھ میں آجاتا ہے۔

حجۃ اللہ البالغہ کا مختلف علماء نے مختلف ترجمے کئے ہیں۔

۱۔ آیات اللہ الکاملہ — از مولوی خلیل احمد صاحب اسرائیلی، بغیر متن عربی۔

۲۔ ترجمہ حجۃ اللہ البالغہ — از محمد شبیر صاحب، بغیر متن عربی۔

۳۔ شموس البالغہ — از عبدالحق صاحب ہزاروی مطبوعہ لاہور، مع متن عربی

۴۔ ترجمہ حجۃ اللہ البالغہ — از مولانا عبدالرحیم مطبوعہ لاہور، بغیر متن عربی۔

۵۔ نعمۃ اللہ السابغہ — از محمد عبدالحق حقانی، مطبوعہ مطبع رحمانی پٹنہ، بغیر متن

اصح المطابع کراچی مع عربی متن۔

۹۔ ازالۃ الخفاء عن خلافۃ الخلفاء

یہ شاہ صاحب کی دوسری شہرہ آفاق تصنیف ہے۔ اس میں آپ نے خلفائے راشدین کی خلافت آیات و احادیث اور تاریخ سے دلائل و براہین دیکر حق ثابت کی ہے اور شیعہ وسنی کے باہمی نزاعات و اختلافات کو نہایت عدل و انصاف کے ساتھ حل کیا ہے۔ یہ فارسی زبان میں ہے۔ مطبع صدیقی بریلی سے شائع ہو چکی ہے۔ اب اردو ترجمہ کے ساتھ بھی شائع ہو رہی ہے یہ کتاب کتب خانہ دارالعلوم دیوبند میں موجود ہے۔

۱۰۔ التفہیمات الالٰہیۃ

شاہ صاحب سماجی آدمی تھے۔ معاشرے کے دکھ درد سے آشنا تھے۔ آپ نے اس کتاب میں معاشرے کے ہر طبقہ کو مخاطب کر کے اصلاح پر ابھارا ہے اور اس میں تصوف و سلوک کی باتیں بھی ہیں۔ بعض مقالات فارسی میں ہیں اور بعض عربی میں۔ پوری کتاب دو جلدوں میں ہے۔ مجلس علمی ڈابھیل گجرات کے زیر اہتمام شائع ہوئی ہے۔

۱۱۔ الخیر الکثیر

تصوف اور علم اسرار و حکم میں ایک معیاری کتاب ہے۔ یہ بھی مجلس علمی ڈابھیل گجرات سے شائع ہوئی ہے۔ اصل کتاب عربی زبان میں ہے اور ترجمہ بھی شائع ہوا ہے۔

۱۲۔ فیوض الحرمین

قیام حرمین شریفین کے دوران جو فیوض و برکات بصورت خواب والقا شاہ صاحب کو حاصل ہوئے یہ ان ہی کا مجموعہ ہے۔ اصل عربی زبان میں ہے اور ترجمہ کے ساتھ بھی شائع ہوا ہے۔

۱۳۔ الانصاف فی بیان سبب الاختلاف

اس کتاب میں فقہی اختلافات کے اسباب پر محققانہ بحث کی گئی ہے اور ہر طبقہ کی افراط و تفریط پر تنقید کی گئی ہے۔ نہایت مفید کتاب ہے اور ترجمہ کے ساتھ بھی کئی بار چھپ چکی ہے۔

۱۴۔ عقد الجید فی بیان احکام الاجتہاد والتقلید

اس عربی رسالہ میں شاہ صاحب نے اجتہاد و تقلید کے مسائل پر نہایت محققانہ اور منصفانہ بحث کی ہے اور ترجمہ کے ساتھ شائع بھی ہو چکا ہے۔

۱۵۔ البلاغ المبین

رسالہ رد بدعت و شرک اور دعوت توحید پر مشتمل ہے۔ اردو ترجمہ کے ساتھ بھی شائع ہوا ہے۔

۱۶۔ قرۃ العینین فی تفضیل الشیخین

تفضیل شیخین کے متعلق فارسی زبان میں اہم رسالہ ہے۔ شائع ہو گیا ہے۔

۱۷۔ انسان العین فی مشائخ الحرمین

یہ رسالہ شاہ صاحب کے عربی شیوخ و اساتذہ کے حالات و واقعات پر مشتمل ہے۔

۱۸۔ الدر الثمین فی مبشرات النبی الامین

شاہ صاحب نے اس رسالہ میں ان بشارتوں کا ذکر کیا ہے جو آپ کو اور آپ کے نسبی یا روحانی بزرگوں کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ہوئیں۔ یہ رسالہ عربی زبان میں ہے۔

۱۹۔ انفاس العارفین

شاہ صاحب اس کتاب میں اپنے والد بزرگوار اور دوسرے خاندانی بزرگوں کے حالات و واقعات بیان کئے ہیں۔ اصل کتاب فارسی میں ہے اور ترجمہ بھی دستیاب ہے۔ اس میں بعض ابواب الحاقی ہیں۔

۲۰۔ القول الجمیل

یہ رسالہ وظائف و اذکار اور طریقت کے چاروں سلسلوں کے بیان پر مشتمل ہے۔ اصلاً عربی میں ہے۔ اردو ترجمہ کے ساتھ شائع ہو چکا ہے۔

۲۱۔ الطاف القدس

شاہ صاحب نے اس رسالہ میں تصوف و سلوک کا وہ طریقہ تحریر فرمایا ہے جو آپ کے خیال میں انسب اور زمانہ حاضر میں قابلِ عمل ہے۔ فارسی زبان میں ہے۔

۲۲۔ ہمعات

یہ بھی تصوف سے متعلق رسالہ ہے۔

۲۳۔ سرور المحزون فی ترجمۃ نور العین

یہ سیرت نبوی پر بہترین کتاب ہے۔ اصلاً فارسی میں ہے۔ اردو ترجمہ بھی چھپ چکا ہے۔

۲۴۔ مکتوبات مع مناقب امام بخاری و ابن تیمیۃ

شاہ صاحب کے چند مکاتیب اور امام بخاری اور علامہ ابن تیمیہ کے حالات پر دو مختصر رسائل کا مجموعہ ہے۔ اردو ترجمہ کے ساتھ شائع ہو چکا ہے۔

۲۵۔ مکتوبات المعارف مع مکاتیب ثلثۃ

شاہ صاحب کے متفرق مکاتیب کا مجموعہ ہے۔

۲۶۔ الجزء اللطیف فی ترجمۃ العبد الضعیف

شاہ صاحب نے فارسی میں آپ بیتی تحریر فرمائی ہے۔

۲۷۔ المقالۃ الوضیۃ فی النصیحۃ والوصیۃ

فارسی زبان میں مختصر پند نامہ ہے۔ اپنے صاحبزادوں، دوستوں، شاگردوں اور عقیدت مندوں کو نصیحتیں فرمائی ہیں۔

۲۸۔ چہل حدیث

اس رسالہ میں شاہ صاحب وہ احادیث جمع کر دی ہیں جو اسلام کے بنیادی اصول سے متعلق ہیں۔ اردو ترجمہ کے ساتھ شائع ہو چکا ہے

۲۹۔ اطیب النغم

شاہ صاحب عربی کے بہترین شاعر بھی تھے۔ یہ آپ کے نعتیہ کلام کا مجموعہ ہے۔ ان کے علاوہ بھی چند رسائل و کتب حسب ذیل ہیں۔

۳۰۔ الزھراوین

۳۱۔ شفاء القلوب

۳۲۔ الھوامع شرح حزب البحر

۳۳۔ لمعات

۳۴۔ سطعات

۳۵۔ المسلسلات

۳۶۔ الذکر المیمون

۳۷۔ السر المکتوم

۳۸۔ اعراب القرآن

۳۹۔ الفضل المبین فی المسلسل من حدیث النبی الامین

۴۰۔ العقیدۃ الحسنۃ

۴۱۔ المقدمۃ السنیۃ فی انتصار الفرقۃ السنیۃ

۴۲۔ شرح رباعیتین

۴۳۔ العطیۃ الصمدیۃ

۴۴۔ فتح الودود فی معرفۃ الجنود

۴۵۔ الارشاد الی مہمات الاسناد

۴۶۔ رسائل اوائل

۴۷۔ تراجم البخاری

۴۸۔ مایجب حفظ للناظر

۴۹۔ مأثر الاجداد

۵۰۔ رسالہ دانشمندی

۵۱۔ الانتباہ فی سلاسل اولیاء اللہ

۵۲۔ رسائل تفہیمات

۵۳۔ النوادر من احادیث سید الاوائل والاواخر

آپ کی زیادہ تر تصانیف امتداد زمانہ کے باعث ضائع ہو چکی ہیں اور بہت سی ایسی تصانیف ہیں جو اگرچہ معلوم نہیں ہوئیں ہیں لیکن اب تک کتب خانوں اور لائبریریوں کی زینت ہیں۔

شعروشاعری

شاہ صاحب اپنے تمام علمی وروحانی کمالات کے ساتھ شعروشاعری کے میدان کے بھی کامیاب شہسوار تھے اور فارسی اور عربی کے مایہ ناز شاعر تھے۔ آپ نے عربی اور فارسی غزلوں اور رباعیوں کا ایک عظیم ذخیرہ چھوڑا ہے۔

آپ کا تخلص امین تھا۔ آپ کی اکثر غزلوں اور رباعیوں میں تصوف و معرفت کے مضامین ہوتے ہیں۔

بطور نمونہ چند رباعیاں پیش ہیں۔

بہ زلفِ پیچ در پیچ کسے گم کردہ ام خود را
خروشِ دردِ دل شبہا نمی کردم چہ کردم
دلے پر درد، جان فگار، یار تند خو دارم
جہاں را پر ز یاربہا نمی کردم چہ کردم

عربی نظم میں "اطیب النغم فی مدح سید العرب والعجم" کے نام سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح و نعت میں ایک طویل قصیدہ ہے جس کا پہلا شعر یہ ہے۔

کأنّ نجوماً او مضت فی الغیاھب
عُیونُ الافاعی او رؤس العقارب

مجدد امت

شیخ الاسلام حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی حقیقی طور پر بارہویں صدی کے مانے ہوئے مجدد تھے۔ آپ کے اندر مجدد ہونے کی تمام ضروری شرائط بدرجہ اتم موجود تھیں۔ جیسا کہ شاہ صاحب نے "تفہیمات الٰہیہ" میں خود تحریر فرمایا ہے۔

"جب میرا دورہ حکمت یعنی علم اسرار دین پورا ہو گیا تو اللہ تعالیٰ نے مجھے خلعت مجددیت پہنائی، پس میں نے مسائل اختلافی میں جمع (وتطبیق) کو معلوم کر لیا۔"

شاہ صاحب نے ایک اور جگہ لکھا ہے کہ:

مجھے خدا نے یہ شرف بخشا ہے کہ میں اس زمانہ کا مجدد، وصی اور قطب ہوں اگر خدا نے چاہا تو میری کوششوں سے مسلمانوں میں نئی زندگی پیدا ہو جائیگی۔ اور ہندوستان میں آج جو اسلامی سرمایہ اپنے صحیح انداز میں موجود ہے وہ

بلاشبہہ شاہ صاحب جیسے مجددین ہی کی کاوشوں اور کوششوں کا نتیجہ ہے۔ اگر شاہ صاحب کا وجود نہ ہوتا تو بظاہر اسلامی فلسفہ کو ایرانی اور ہندو فلسفہ نگل گیا ہوتا اور اور صحیح اسلام اور اسلامی فلسفہ کہیں ڈھونڈے سے بھی نہ ملتا۔ شاہ صاحب نے اپنے تجدیدی و اصلاحی کام کا جو دائرہ کار متعین فرمایا تھا اس کو ان دس حصوں یا شعبوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ ۱۔ جہاد بالقرآن ۲۔ اشاعت سنت ۳۔ رد بدعت ۴۔ اصلاح عقائد و معاشرت ۵۔ حقیقی اسلامی تصوف کا تعارف ۶۔ اخلاقی تربیت کا مسنون طریقہ کار ۷۔ فقہی اور اجتہادی اختلافات میں اعتدال کی تلقین ۸ شریعت اسلامیہ کا بطور ایک مکمل نظام حیات کے عقلی اور استدلالی تعارف ۹۔ اسلامی اجتماعیت اور خلافت کی تشریح ۱۰۔ اس وقت کی مسلم حکومت کو اخلاقی زوال اور سیاسی انتشار سے بچانے کی منظم جدوجہد۔

جس میں سے ہر شعبہ اپنے اندر اتنی وسعت اور گہرائی رکھتا ہے کہ ہر شعبہ کے لئے ایک مستقل جماعت درکار ہے مگر یہ شاہ صاحب کی تجدیدی صلاحیت ہی تھی کہ ان تمام شعبوں میں تن تنہا کام کر کے اپنے جانشینوں کے لئے راہ عمل تجویز فرما گئے اور ان کے بعد ان کے جانشینوں نے بڑی سے بڑی حد تک کامیابی کی منزل تک پہنچایا۔ یہ ہے بارہویں صدی کے مجدد کا تجدیدی منصوبہ جسے وہ بروئے کار لائے۔

وفات

اس طرح جب شاہ صاحب اپنے تجدیدی فرائض کو باحسن وجوہ انجام دیئے اور اپنے پیچھے ایک جماعت بھی کار ہائے تجدید سنبھالنے کے لئے تیار کر دی تو داعیٔ اجل کو لبیک کہتے ہوئے ۲۹ محرم ۱۱۷۶ھ ـ ۱۷۶۳ء کو اس دار فانی سے کوخیر باد کہا اور جان جان آفرین کے سپرد فرمادی اور والد

بزرگوار حضرت شاہ عبدالرحیم دہلوی کے پہلو میں آرام فرما ہو گئے۔ گویا آپ کو ان کارہائے تجدید کے لئے خداوند نے اس دنیا میں بھیجا تھا۔ ؎

اربابِ چمن مجھ کو بہت یاد کریں گے
ہر شاخ پر اپنا ہی نشاں چھوڑ دیا ہے

حضرت شاہ صاحب کے مزار پر یہ لوح لگی ہے۔

مرقد

حجۃ الاسلام حضرت مولانا امام شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ ابن حضرت مولانا شاہ عبدالرحیم محدث دہلویؒ

تاریخ پیدائش ۴ر شوال المکرم ۱۱۱۴ھ۔ بروز بدھ

تاریخ وفات ۲۹ر محرم الحرام ۱۱۷۶ھ بروز ہفتہ مطابق ۲۰ر اگست ۱۷۶۲ء بوقت ظہر بعمر ۶۲ سال رحلت نمود (بزمانۂ شاہ عالم ثانی)

شاہ عبدالعزیز محدث

ولادت اور تعلیم و تکمیل

سراج الہند شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ، شیخ الاسلام حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے بڑے صاحبزادے تھے۔ وہ پنجشنبہ کی رات ۲۵ رمضان المبارک ۱۱۵۹ھ ۱۲ اکتوبر ۱۷۴۶ء میں دارالسلطنت دہلی میں پیدا ہوئے۔

والد محترم نے آپکا نام عبدالعزیز تجویز فرمایا۔ اور جب تاریخی نام کی تلاش کی تو خداوند تعالیٰ نے "عظیم حلیم" القاء فرمایا۔

شاہ عبدالعزیز صاحب پانچ ہی برس کے تھے کہ قرآن مجید حفظ کرنا شروع کیا۔ اور جلد ہی حفظ قرآن مجید سے فارغ ہو کر فارسی زبان کی تعلیم شروع کر دی۔ اور تھوڑی ہی مدت میں نہ صرف یہ کہ فارسی زبان سیکھلی بلکہ ادب فارسی پر زبردست عبور حاصل کر کے فارسی زبان کے ایک ماہر اور قادرالکلام ادیب بن گئے۔

شاہ عبدالعزیز صاحب نے اکثر و بیشتر علوم اپنے جلیل القدر والد ماجد

شاہ ولی اللہ محدثؒ سے حاصل کئے۔ ابھی شاہ عبدالعزیز صاحب کے علوم وفنون تشنۂ تکمیل ہی تھے کہ شاہ ولی اللہؒ کا سایہ عاطفت سر سے اٹھ گیا۔ جبکہ شاہ صاحب عمر کے ابتدائی حصہ میں تھے اور اس وقت آپ کی عمر زیادہ سے زیادہ ۱۶ برس کی ہوگی۔ اول تو اس کچی عمر میں سایہ پدری سے محرومی خود سانحۂ عظیم ہے۔ مگر آپ کے لئے اس حادثۂ فاجعہ میں مزید شدت اس لئے پیدا ہوگئی کہ گھر کے سب سے بڑے ہونے کے سبب گھر کی تمام تر ذمہ داری کا بوجھ اس ننھی سی جان پر آپڑا۔ مزید براں اپنی تعلیم کے ساتھ تین چھوٹے بھائیوں کی تربیت و پرورش کا بار بھی آپ پر آگیا۔ کیونکہ والد صاحبؒ کے انتقال کے وقت شاہ رفیع الدین صرف ۱۲ برس کے شاہ عبدالقادر ۹ برس کے اور شاہ عبدالغنی ۵ برس کے تھے۔ اسی لئے شاہ ولی اللہ محدث دہلوی پر بھی نوعمر اور ننھے منے بچوں کو تن تنہا چھوڑ کر چلا جانا بڑا شاق گزر رہا تھا۔

لہذا جب آپ کو اپنے مکاشفہ یا بیماری کی نوعیت سے اندازہ ہوا کہ سفر آخرت قریب ہے تو ان نونہالوں کی پرورش اور تعلیم و تربیت کے بارے میں متفکر ہوکر بتقاضائے بشریت بارگاہ الٰہی میں عرض کیا کہ:

> "الٰہی میرے بچے چھوٹے ہیں ان کا کیا ہوگا؟ جس کا جواب بارگاہ صمدیت سے فوراً ملنا ہی تھا لہذا بواسطہ سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم آپ کو جواب دیا گیا اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خواب میں تشریف لاکر فرمایا، ولی اللہ (رحمۃ اللہ علیہ) یہ بچے تیرے نہیں ہمارے ہیں پھر تو فکر کیوں کرتا ہے؟"

اس جواب ایزدی پر شاہ صاحب کا مطمئن ہونا یقینی ہی تھا۔ لہذا یہ اللہ کا ولی اپنے چاروں نونہالوں کو مولائے کریم کی حفاظت میں دیکر باطمینان

تمام اس دنیا سے رخصت ہوا! ادھر تائید غیبی نے ان ماہ پاروں کی دستگیری شروع فرمائی اور اللہ رب العزت نے اپنے آغوش رحمت میں اس طرح پروان چڑھایا کہ ان میں سے ہر ایک آفتاب و ماہتاب علم وعرفان بن کر افق عالم پر اس طرح چمکا کہ صدیاں گزرنے پر بھی ان کی ضیاء پاشیوں میں کوئی کمی نہیں آئی اور آج بھی تمام عالم اسلام کے علمائے کرام اور خصوصاً علماء ہند وپاک ان کے انوار علوم سے اکتساب نور کرنے پر مجبور ہیں اور اس کا نظم خداوند تعالیٰ نے اس طرح فرمایا کہ حضرت شاہ عبدالعزیز کے تکمیل علم کے لئے نادرۂ روزگار اور ماہران علم حدیث و قرآن اور صاحب نسبت ماہران طریقت تین شخصیتوں، شیخ نور اللہ بڑھانوی، شیخ محمد امین کشمیریؒ اور شاہ محمد عاشق بن شاہ محمد پھلتیؒ کو منتخب فرمایا جن میں شاہ محمد عاشق صاحب تو حضرت شاہ ولی اللہؒ کے مخصوص تلامذہ میں سے بھی خصوصی تربیت یافتہ اور شاہ ولی اللہ کے محرم راز حضرات میں سے تھے۔ تو یہ حضرات حضرت شاہ عبدالعزیز پر جتنی بھی توجہ کرتے کم تھا لہٰذا ان تینوں حضرات نے شاہ عبدالعزیز کے بیٹے کو علوم نبوت سے معمور کرنے میں پوری پوری سعی بلیغ فرمائی اور ادھر شاہ صاحب نے بھی استفادہ اور اکتساب فیض کی جدوجہد میں کوئی کسر نہیں چھوڑی اور ان اکابر کے فیوض علمیہ و روحانیہ سے بھرپور استفادہ فرمایا اور حدیث، تفسیر، فقہ، اصول فقہ، کلام، منطق، فلسفہ اور شعر وادب میں غرض کہ تمام علوم دینیہ و عصریہ میں ممتاز حیثیت اختیار فرمائی۔ اور خصوصیت کے ساتھ فن حدیث جس سے خاندانی حیثیت سے قلبی لگاؤ تھا۔ خصوصی مہارت حاصل کر لی۔ اور محدث جلیل نواب صدیق حسن خاں قنوجی تحریر فرماتے ہیں کہ:

"شاہ عبدالعزیز بن شیخ اجل ولی اللہ محدث دہلوی رحمہما اللہ استاذ

الاساتذہ، امام نقاد، بقیۃ السلف، حجۃ خلف اور دیار ہند کے خاتم مفسرین و محدثین تھے اور ....

اپنے وقت میں علماء اور مشائخ کے مرجع تھے۔ تمام علوم متداولہ اور غیر متداولہ میں خواہ فنون عقلیہ ہوں یا نقلیہ، ان کو جو دستگاہ حاصل تھی وہ بیان سے باہر ہے۔ کثرت حفظ و علم، خوابوں کی تعبیر سلیقۂ وعظ، انشاء پردازی، تحقیقاتِ نفائس علوم مذاکرہ اور مخالفوں کے ساتھ مباحثہ کرنے میں وہ اپنے معاصرین سے ممتاز تھے۔

اتحاف النبلاء المتقین باحیاء مآثر الفقہاء المحدثین ص ۲۹۶

نیز مولانا سید عبد الحئی صاحب لکھنوی تحریر فرماتے ہیں۔

مرحوم اپنے علم و فضل، آداب، ذکاوت، ذہانت، فہم و فراست اور سرعت حافظہ میں عالم کے اندر یگانہ روزگار علماء میں سے تھے۔ پندرہ برس کی عمر سے درس و تدریس میں مصروف ہوئے درس دیا اور فیض پہنچایا۔ یہاں تک کہ ہندوستان میں یکتا عالم ہوگئے۔ اور فضلائے ان سے اکتساب کمال کیا۔ بیشتر مقامات سے طلبہ محض ان سے پڑھنے کے لئے آئے اور ان پر ایسے لوٹ پڑے جیسے پیاسا پانی پر لوٹ پڑتا ہے ...."

نزہۃ الخواطر ص ۴۶۸

صاحب وقائع عبد القادر خانی لکھتے ہیں کہ:

مولانا شاہ عبد العزیزؒ علم تفسیر، حدیث، فقہ، سیرت اور تاریخ میں شہرہ آفاق تھے اور علم ہیئت، ہندسہ، مجسطی، مناظر اسطرلاب جرثقیل، طبعیات، منطق، مناظرہ، اتفاق و اختلاف ملل و نحل، تیافہ تاویل، تطبیق مختلف، اور تفریق مشتبہ میں یکتائے روزگار تھے۔

فن ادب اور ہر قسم کے اشعار سمجھنے میں بلند مرتبہ رکھتے تھے، منقول میں کلام اللہ اور حدیث سے دلیل پیش کرتے تھے اور معقول میں جو ثبوت مناسب سمجھتے خواہ مخواہ یونانیوں میں سے افلاطون، ارسطو اور متکلمین میں سے فخر الدین رازی وغیرہ کے اقوال کی تائید میں مبتلا نہیں ہوتے تھے اور اپنی تحقیقات کو فن معقول میں صاف صاف بیان کر دیتے تھے۔

علم وعمل (وقائع عبدالقادر خانی) ج ۱ ص ۲۴۶

شاہ ولی اللہ کی جانشینی

چونکہ آپ بڑے صاحبزادے ہونے کے ساتھ ساتھ بڑے صاحب علم وفضل بھی تھے اور حضرت شاہ ولی اللہ کی جانشینی کی اہلیت وصلاحیت آپ کے اندر بدرجہ اتم پائی جاتی تھی اور آپ کے روشن کارناموں نے ثابت بھی کر دیا کہ اس دور میں اگر شاہ ولی اللہ کی جانشینی کا کوئی اہل ہو سکتا ہے تو صرف شاہ عبدالعزیز ہی ہیں۔ لہٰذا خویش وبیگانہ سب نے مل کر مسند خلافت پر متمکن کر دیا۔ اس طرح شاہ عبدالعزیز ۲۵ برس کی عمر میں ہی اپنے والد محترم کی خالی مسند درس وتدریس پر رونق افروز ہو گئے اور چونکہ آپ بھی والد محترم کی طرح جامع الحیثیات والجہات انسان تھے اس وجہ سے اپنے والد کے انداز درس وتدریس اور تعلیم وتربیت کے طرز پر سلسلہ تدریس وتربیت اخلاق جاری فرما کر بڑی حد تک والد کی کمی کو پُر کر دیا اور بہت جلد شاہ صاحب کی علمی شہرت چار دانگ عالم میں پھیل گئی اور اطراف عالم کے تشنگان علم وفن والہانہ انداز سے شاہ عبدالعزیز صاحب کے درس میں حاضر ہو کر ولی اللہی علوم وفنون سے مستفیض ہونے لگے اور بہت ہی قلیل مدت میں شاہ صاحب کے علوم سے مستفیدین اور عرفان باطن سے معمور تلامذہ اور

مجازین پورے عالم اسلام میں خصوصاً پورے غیر منقسم ہندوستان میں پھیل گئے۔ اور اس ہندوستان میں کوئی ایسی جگہ باقی نہیں رہی جو شاہ عبدالعزیزؒ کے شاگرد اور مرید سے خالی ہو۔

مولانا سندھیؒ نے "شاہ ولی اللہؒ کی سیاسی تحریک" میں لکھا ہے کہ:-

"اس زمانہ کے ایک عالم دین نے اس لئے ملک کی سیاحت کی کہ اسے علم حدیث کا کوئی ایسا استاذ ملے جو شاہ عبدالعزیزؒ کا شاگرد نہ ہو مگر پورے ہندوستان میں اسے ایک مدرس بھی ایسا نہیں ملا۔"

مولانا سندھی کا خیال ہے کہ شاہ ولی اللہؒ کے خواص سے اگر دس آدمیوں نے استفادہ کیا تو شاہ عبدالعزیزؒ کے خواص سے دس ہزار مستفید ہوئے۔

شیخ محسن بن یحییٰ ترہتی نے لکھا ہے کہ:

"وہ (عبدالعزیز محدث) کمال اور شہرت کے ایسے مقام کو پہنچے کہ تم دیکھتے ہو کہ لوگ بلاد ہند میں اپنا ان سے انتساب کرنا فخر سمجھتے ہیں بلکہ اپنے آپ کو ایسے رشتے میں منسلک کرتے ہیں جو ان کے شاگردوں پر منتہی ہوتا ہے قابل فخر خیال کرتے ہیں۔"

الیانع الجنی ص۱۱۸

چند نامور تلامذہ

حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کے سامنے جن بڑے بڑے علماء، فضلاء، اور مشائخ طریقت نے زانوئے تلمذ تہہ کیا۔ ان میں حضرت شاہ رفیع الدین محدث دہلویؒ، امام المفسرین شاہ عبدالقادرؒ، حضرت شاہ عبدالغنی دہلویؒ امام العلماء مولانا رشید الدین دہلویؒ، مولانا عبدالحی بن ہبۃ اللہ بڈھانویؒ، مفتی

الٰہی بخش کاندھلویؒ، سید قمر الدین سونی پتیؒ، حضرت شاہ غلام علی مجددیؒ (خلیفہ مرزا مظہر جان جاناںؒ شہید) مولانا سید قطب الہدیٰ بن مولانا محمد واضح رائے بریلوی، مولانا مفتی صدر الدین آزردہ دہلویؒ مولانا امام الدین دہلویؒ مولانا صدر علی رامپوریؒ، مولانا حیدر علی فیض آبادی اور سید طائفۃ الاولیاء حضرت شاہ فضل رحمان گنج مراد آبادی (پیر و مرشد حضرت مولانا سید محمد علی مونگیریؒ)

تقریر و خطابت

شاہ صاحب ایک بہترین محدث اور عمدہ مفسر و ماہر علوم عقلیہ و نقلیہ ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے عہد کے ممتاز خطیب اور مقرر بھی تھے۔ آپ کی شعلہ بار تقریر اس شان کی ہوا کرتی تھی کہ بڑے بڑے سنگدل موم ہوجاتے تھے۔ شاہ صاحب کی مجلس وعظ میں ہر مذہب و ملت کے لوگ جوق در جوق شریک ہوتے اور آپ کا طرز استدلال ایسا ہوتا تھا کہ سخت سے سخت کٹر متعصب کو بھی تسلیم کئے بغیر چارہ نہیں رہتا تھا۔

مولانا رحیم بخش دہلوی کا بیان ہے کہ:

"ہفتہ میں دو بار منگل اور جمعہ کو کوچہ چیلان (دہلی) میں مجلس وعظ منعقد ہوتی تھی جس میں خواص عوام مورد ملخ سے زیادہ جمع ہوتے تھے۔ آپ کی معجزانہ تقریر میں وہ اثر ہوتا کہ مخالفین گھروں سے اعتراض کا ارادہ کرکے چلتے لیکن وہاں بجز سکوت و تسلیم کے کسی کو دم مارنے کی گنجائش نہ ہوتی۔ آپ کا طرز بیان ایسا عجیب تھا کہ ہر مذہب و ملت کا آدمی مجلس سے خوش ہوکر اٹھتا تھا اور آپ کی کوئی بات کسی پہ گراں نہیں گزرتی تھی۔ آپ کو خلق خدا کی خدمت کا خیال ہر وقت رہتا تھا۔ انتہا یہ کہ زیادتی مرض کے زمانہ میں جب

وعظ کا دن آیا تو آپ نے دوسروں کے سہارے بیٹھ کر وعظ شروع کیا۔ تقریر شروع ہوئی تو آپ نے سہارا دینے والوں کو بھی الگ کر دیا اور حسب معمول تقریر فرماتے رہے۔ لب و لہجہ سے کمزوری اور ناتوانی کے آثار نمایاں تھے۔ مگر استقلال ایسے ہی اپنا رنگ جمائے ہوئے تھا۔

حیات ولی ص۱۰۰

موذی امراض

حضرت شاہ عبدالعزیز محدث رحمۃ اللہ علیہ ابھی ۲۵ برس ہی کے ہوئے تھے کہ آپ کو متعدد اذیت رساں امراض نے گھیر لیا۔ جن کے سبب آپ جذام، برص میں مبتلا ہوئے اور بصارت بھی جاتی رہی۔ ملفوظات میں ہے کہ شاہ صاحب کو بائیس قسم کے خوفناک امراض لاحق تھے۔ مولانا مناظر احسن گیلانیؒ نے امیر شاہ خاں صاحب سے نقل کیا ہے کہ:

"دو دفعہ روافض نے شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کو زہر دیا اور چھپکلی کا ابٹن ملوایا تھا جس سے شاہ صاحب کو برص کا مرض ہو گیا تھا۔"

تذکرہ حضرت شاہ ولی اللہ ص۲۶۵

انھیں امراض موذیہ میں عدم اشتہار کا مرض اس حد تک بڑھ گیا کہ کئی کئی روز کسی چیز کے چکھنے کی بھی نوبت نہ آتی اور بخار کی طرح اس کی بھی باری آتی تھی۔ شاہ صاحبؒ نے خود "مناقب حیدریہ" کی تقریظ میں لکھا ہے کہ

"اس تقریظ میں کوتاہی کے لئے معذرت خواہ ہوں جو اعذار اور امراض کے سبب ہوئی جن کی وجہ سے بھوک بالکل ختم ہو گئی ہے اور

کھانے کی نوبت باری کے بخار کی طرح آتی ہے۔ ایسا غالباً پت کے غلبہ کے سبب ہے۔ قویٰ مضمحل ہو گئے، حواس میں فرق آگیا اعضاء کمزور پڑ گئے، ہڈیاں اور ڈاڑھیں بھی کمزور ہو گئیں۔"

امیر حیدر بن نور الحسنین بلگرامی صاحب کو حضرت نے جو خط تحریر فرمایا ہے اس میں رقمطراز ہیں۔

"اگر آپ اپنے محب کا حال پوچھتے ہیں تو وہ بہت خراب ہے۔ اور صبح و شام اس میں اضافہ ہی ہوتا رہتا ہے۔ اور اسے ظاہری و باطنی آلام گھیرے ہوئے ہیں قرار و سکون چھن گیا ہے۔ اور قلق و اضطراب بڑھ گیا ہے۔ اور یہ سب ایسے امراض کے سبب ہے جس میں سے ایک مرض بھی آدمی کو پریشان اور غمزدہ کرنے کے لئے کافی ہے۔ جیسے بواسیر، معدہ اور آنتوں میں ریاح کا رکنا، اس حد تک فقدان اشتہار کہ کئی کئی رات دن کھانا چکھنے کی بھی نوبت نہیں آتی۔ بخارات، جب قلب کی طرف چڑھتے ہیں تو دم گھٹنے کی کیفیت ہو جاتی ہے۔ یہ جب دماغ کی جانب پہونچتے ہیں تو تکلیف دہ درد سر شروع ہو جاتا ہے جو ہاون دستہ کے ضرب کی طرح محسوس ہوتا ہے۔ والی اللہ المشتکیٰ وھو المستعان یہ حالت ایک لفظ بھی بولنے کی اجازت نہیں دیتی۔ چہ جائیکہ کوئی کتاب، املا کرا سکے یا کوئی پیغام لکھوا سکے۔"

تاریخ دعوت و عزیمت ص ۲۵۰

ذوق، شاہ صاحب کی مجلس وعظ میں

شاہ عبدالعزیز محدث ان "خوفناک امراض" میں مبتلا ہونے کے باوجود

دینی و علمی محفلوں میں برابر شریک ہوتے اور علمی، فقہی، تفسیری اور ادبی گتھیوں کو سلجھاتے۔ شاہ صاحب کی مجلس وعظ میں نہ صرف دینی طبقہ ہی شامل ہوتا تھا بلکہ بڑے بڑے شعراء اور ادیب بھی شریک ہو کر زبان اور محاورے سیکھتے تھے۔

ناصر نذیر صاحب فراق نے اپنی کتاب "لال قلعہ کی ایک جھلک" میں لکھا ہے

"کون نہیں جانتا کہ حضرت شاہ نصیر صاحب دہلوی، اکبر شاہ ثانی اور ابو ظفر بہادر شاہ اور شیخ ابراہیم ذوق کے استاذ تھے۔ جب شاہ نصیر صاحب کا ذوق سے دل کھٹا ہو گیا اور انھوں نے اصلاح موقوف کر دی تو ذوق ہر جمعہ کو مولانا حضرت شاہ عبدالعزیز رحمتہ اللہ علیہ کے وعظ میں جانے لگے۔ اور وعظ بہت غور سے سننے لگے۔ کسی دوست نے اس کا سبب پوچھا تو ذوق نے کہا استاذ مجھ گناہگار سے ناخوش ہو گئے۔ شعر و سخن میں اصلاح ملتی نہیں اس کا بدل میں نے یہ نکالا ہے کیونکہ شاہ عبدالعزیز صاحب اردو زبان دانی میں شاہ نصیر صاحب سے کسی طرح کم نہیں۔ ان کے بیان اور گفتگو کو سنتا ہوں اور اردو کے محاورے روزمرہ یاد کرتا ہوں"

حاضر جوابی

شاہ عبدالعزیز صاحب بڑے باغ و بہار، خوش طبع، خوش گفتار، ہشاش بشاش اور حاضر جواب انسان تھے۔ شیخ محمد اکرام نے شاہ صاحب کا ایک بڑا ہی دلچسپ واقعہ لکھا ہے کہ

"ایک دفعہ ایک پادری صاحب شاہ صاحب کی خدمت میں آئے اور سوال کیا کہ آپ کے پیغمبر حبیب اللہ ہیں؟ آپ نے فرمایا ہاں، وہ کہنے لگے تو پھر انھوں نے بوقت قتل امام حسین فریاد نہ کی۔ یا یہ فریاد سنی نہ گئی؟ شاہ صاحب نے کہا کہ نبی صاحب نے فریاد تو کی۔ لیکن انھیں جواب آیا کہ تمہارے نواسے کو قوم نے ظلم سے شہید کیا ہے لیکن ہمیں اس وقت اپنے بیٹے عیسیٰؑ کا صلیب پر چڑھنا یاد آرہا ہے"۔

رودِ کوثر ص ۵۹۰

ذہانت و ذکاوت

شاہ عبدالعزیز صاحب اپنی ذہانت و ذکاوت اور عبقریت میں فرد یگانہ تھے۔ آپ کی تبحر علمی اور عبقریت کے بے شمار واقعات ہیں ان تمام واقعات کا ذکر یہاں ممکن نہیں ہے۔ البتہ ایک واقعہ نقل کیا جاتا ہے جس کو حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی نور اللہ مرقدہ نے بیان فرمایا ہے۔ حضرت تھانوی بیان فرماتے ہیں کہ

"مولانا فضل حق خیر آبادیؒ اور مولانا صدر الدین صاحبؒ جو علوم عقلیات، فلسفہ، منطق وغیرہ کے بڑے امام مانے جاتے تھے اور دونوں عربی ادب کے بھی ماہر ادیب تھے۔ ایک مرتبہ ان دونوں نے ارادہ کیا کہ شاہ عبدالعزیز دہلویؒ کے علم و فضل کا بڑا چرچا ہے۔ چلو ذرا امتحان کریں۔ کتنا اور کیسا علم رکھتے ہیں۔ راستے میں دونوں نے عربی زبان میں دو قصیدے لکھے اور آزمائش کے لئے آپس میں یہ قصیدے باہم بدل لئے ایک

کا قصیدہ دوسرے نے لے لیا۔

حضرت شاہ صاحب کی خدمت میں حاضر ہو کر کہنے لگے حضرت ہم نے کچھ لکھا ہے ذرا اس کو سن لیجئے۔ حضرت نے فرمایا سُنائیے۔ دونوں نے یہ دو قصیدے پڑھ کر سُنائے حضرت شاہ صاحب خاموش بیٹھے سنتے رہے۔ ان دونوں نے آپس میں ایک دوسرے کو اشارے کئے کہ بڑے میاں کچھ سمجھے ہی نہیں، بولتے کیا۔ پھر عرض کیا کہ حضرت آپ نے ان قصیدوں کے متعلق کچھ فرمایا ہی نہیں۔

حضرت شاہ صاحب نے فرمایا کہ کچھ کہہ دوں گا مگر پہلے تو یہ بتلاؤ کہ قصیدوں میں تبدیلی کہاں اور کیوں ہوئی اب تو انھوں نے حیرت سے سوال کیا کہ آپ کو کیسے معلوم ہوا؟ فرمایا کہ میں نے آپ دونوں کی گفتگو اور طرز کلام سے دونوں کے مزاج و مذاق کا جو اندازہ لگایا تھا ان قصیدوں کو اس سے مختلف پایا اس سے اندازہ ہوا کہ ان میں تبدیلی ہوگئی ہے اس کے بعد قصیدوں کے ایک ایک شعر پر اصلاح کے لئے فرمانا شروع کیا تو کوئی شعر بغیر اصلاح کے نہیں چھوڑا۔

مجالس حکیم الامت صـ۱۶۶

شاہ صاحب کا استغنا اور بزرگانہ رعب

حضرت شاہ عبدالعزیز بڑے غیور الشان تھے۔ آپ کی جلالت شان اور قدرتی ہیبت کی بنا پر بڑے بڑے امراء و سلاطین بھی مرعوب رہتے تھے۔

تاریخ شاہد ہے کہ خاندان ولی اللہی نے کبھی کوئی شاہی منصب یا جاگیر منظور نہیں کی البتہ خاندان ولی اللہی نے اپنے عہد کے امراء و سلاطین کو خیر خواہانہ اور مخلصانہ مشورہ ضرور دیئے ہیں۔

حضرت شاہ عبدالرحیم اور شاہ ولی اللہ نے اپنے عہد کے بے راہرو بادشاہوں اور وزیروں کو متنبہ کیا تھا اور شاہ عبدالعزیز صاحب نے بھی اس ولی اللہی سنت کو قائم رکھا۔ شاہ عبدالعزیز صاحب کی عظمت کا یہ عالم تھا کہ شاہزادے آپ کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے اور پاؤں دبانے کو اپنی سعادت سمجھتے تھے۔ ملفوظات عزیزی میں ہے کہ اگر برسر راہ نوابوں اور امراء میں سے کوئی مل جاتا تو وہ خود سواری سے اتر کر مصافحہ اور مزاج پرسی کرنے کو اپنی سعادت جانتا تھا۔ اور کہیں اتفاقاً بادشاہ سے بھی ملاقات ہو جاتی تو وہ بھی پورے احترام کے ساتھ مصافحہ کرتے۔

دوسری طرف شاہ عبدالعزیز صاحب دہلوی کی سیر چشمی و قناعت کا یہ عالم تھا کہ کسی شاہی عطیہ کا قبول کرنا تو درکنار بادشاہوں اور امراء کی ہمت نہیں پڑتی تھی کہ وہ کچھ پیش کریں کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ ہماری پیش کش نظر حقارت سے مسترد کر دی جائے گی۔ ؎

چوں طمع خواہد زمن سلطان دیں
خاک بر فرق قناعت بعد ازیں

ایسٹ انڈیا کمپنی اور شاہ عبدالعزیز کا انتباہ

انگریز ہندوستان میں تاجر کی حیثیت سے داخل ہوئے تھے۔ ۱۱ جنوری ۱۶۱۳ء میں جہانگیر نے فرمان شاہی کے ذریعہ انھیں گجرات میں تجارتی مراکز قائم کرنے کی اجازت دی۔ شاہجہاں نے بھی ان کے ساتھ رعایت کا

ہی معاملہ روا رکھا۔ البتہ اورنگ زیب عالمگیر نے محسوس کیا کہ ان کا قیام یہاں ملک کے لئے ضرر رساں ہے۔ چنانچہ انھوں نے اپنے عہد حکومت میں ان کی آمد ورفت پر پابندی عائد کی۔ عالمگیر کی وفات کے بعد نالائق اور نااہل حکمرانوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ اور انھوں نے خانہ جنگی شروع کر دی بداندیش مسلم حکمرانوں کی آپسی خلفشار وخانہ جنگی سے فائدہ اٹھا کر انگریزوں نے پھر دوبارہ ہندوستان میں آمد ورفت کا سلسلہ شروع کر دیا۔ اب کون تھا جو ان پر پابندی عائد کرتا۔

لہذا اس چھوٹ سے انگریزوں کو ہندوستان میں قدم جمانیکا موقع مل گیا۔ اور انھوں نے ایسٹ انڈیا کمپنی کے نام سے ایک تجارتی ادارہ کی بنیاد ڈالی اور اس کی آڑ میں ملک کے مختلف حصوں پر اپنی حکومتیں قائم کرنی شروع کر دی اور رفتہ رفتہ پورے ملک پر قبضہ کر لیا اور اس کے ساتھ عیسائیت کی ترویج بھی شروع کر دی اور دوسری طرف دینی مدارس کو تباہ وبرباد کرنے کی مہم تیز کر کے اپنے مشنری اسکول قائم کرنے شروع کر دیئے۔ جو نام کیلئے تو علوم عصریہ کے اسکول تھے مگر درحقیقت وہ تبلیغ عیسائیت کے مراکز اور تعلیمات اسلامی کو مٹانے کے اڈے تھے اور اس کا واضح ثبوت یہ ہے کہ ان اسکولوں میں اس قسم کے سوالات پوچھے جاتے تھے کہ تمہاری شفاعت کون کرے گا؟ اس کا صحیح جواب بھی متعین ہوتا کہ عیسیٰ ابن مریم اگر جواب ذرا مختلف ہوا تو نمبر صفر ہوتا۔

اسی طرح پوچھا جاتا کہ تمہارا خدا کون ہے؟ اور اس کا جواب بھی متعین ہوتا، یسوع مسیحؑ! ادھر بدقسمتی سے شاہ عالم بھی انگریزوں کا وظیفہ خوار بن چکا تھا اور اس کی حکومت برائے نام رہ گئی تھی اور یہ نعرہ انگریزوں کی طرف سے برسرعام بلند ہونے لگا کہ

"حکومت شاہ عالم از دہلی تا پالم اور ملک بادشاہ سلامت کا، حکم کمپنی بہادر کا۔"

تو امام انقلاب سراج الہند حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی نے اس کے خلاف شاہجہانی جامع مسجد دہلی سے آواز بلند کی کہ:

"آج سے یہ ملک دارالحرب ہو گیا۔ ان غاصبوں کے خلاف جہاد کرنا ہمارا فریضہ ہے۔

شاہ عبدالعزیز کا فتویٰ

فتویٰ کی عبارت یہ ہے۔

دریں شہر حکم امام المسلمین اصلا جاری نیست حکم روسار نصاریٰ بے دغدغہ جاری است زیرا کہ مساجد را بے تکلف ہدم می نمایند و ہیچ مسلمان یا ذمی بغیر استیمان ایشاں دریں شہر و در نواح آں نمی تواند آمد۔ و ازیں شہر تا کلکتہ عمل نصاریٰ ممتد است[۱]۔	اس شہر (دہلی) میں مسلمانوں کے امام کا حکم بالکل جاری نہیں بلکہ عیسائی سرداروں کا حکم بے تکلف جاری ہے۔ اس لئے کہ مساجد کو بے جھجک منہدم کر دیتے ہیں اور کوئی مسلم یا غیر مسلم ان کی اجازت اور پناہ کے بغیر اس شہر میں اور اس کے اطراف میں آ نہیں سکتا، اور اس شہر سے کلکتہ تک نصاریٰ کی حکومت پھیلی ہوئی ہے۔

[۱] فتاویٰ عزیزی ج ۱ ص۱۶۱ مطبوعہ مجتبائی دہلی۔

اپنے اس فتویٰ میں حضرت شاہ صاحبؒ نے ہندوستان کے "دارالحرب"

ہونے کی دلیل بھی نقل فرمائی ہے :۔

در کافی می نویسد	”کافی“ میں ہے کہ دارالاسلام
المراد بدارالاسلام بلاد	سے مراد وہ ملک ہے جس میں
یجری فیہا حکم امام	امام المسلمین کا حکم جاری ہوتا
المسلمین و یکون تحت	ہو اور جو اس کے ماتحت ہو۔
قہرہ۔ و بدارالحرب	اور ”دارالحرب“ سے مراد وہ آبادی
بلاد یجری فیہا امر	ہے جس پر اس شہر کے (غیر مسلم)
عظیمہا و تکون تحت	حکمراں کا حکم جاری ہو اور اس
قہرہٖ الخ	کے غلبہ و تسلط میں ہو۔

پھر حضرت شاہ صاحب نے کفار کے احکام کے جاری ہونے کا مفہوم بیان فرمایا ہے اور اسے ہندوستان پر منطبق کیا ہے۔ تحریر فرماتے ہیں :۔

و از روے احادیث و تتبع	احادیث اور سیرت صحابہؓ اور
سیرت صحابہ کرامؓ و خلفاء عظامؓ	اور خلفاء عظامؓ کے تتبع سے
ہمی مفہوم می شود زیرا کہ	یہی مفہوم ہوتا ہے اس لئے
در عہد صدیق اکبرؓ ملک	کہ حضرت صدیق اکبرؓ کے عہد
بنی یربوع را حکم دارالحرب	میں ملک بنی یربوع کو دارالحرب
دادند حالانکہ جمعہ و عیدین و اذان	کا حکم دیا گیا، حالانکہ وہاں
در آنجا جاری بود۔	جمعہ، عیدین اور اذان تھی۔

فتاویٰ عزیزی ج ۱ ص ۱۷

شاہ عبدالعزیز صاحب انگریزوں کی فتنہ پردازیوں، شورشوں اور توسیع پسندیوں سے کس قدر پریشان اور مضطرب تھے اس کا اندازہ کرنے کے لئے حضرت کا یہ شعر کافی ہے۔ ؎

وانی آری الافرنج أصحاب ثروۃ
لقد أفسدوا مابین دھلی وکابل

میں فرنگیوں کو جو دولت کے مالک ہیں دیکھتا ہوں کہ انھوں نے دہلی اور کابل کے درمیان فساد برپا کر رکھا ہے۔

اسی کرب و اضطراب کا اثر تھا کہ شاہ صاحب اس فتویٰ کے ذریعہ مسلمانوں کو بیدار کرنے اور انگریزوں کے خلاف صف آرا کرنے پر مجبور ہوئے تاکہ مسلمان صف بستہ ہو کر اپنے وطن عزیز کو آزاد کرائیں اور ہندوستان کی تمام قوموں اور خصوصاً مسلمانوں کے شعائر کو تباہی سے بچائیں، مگر انگریز قوم چونکہ انتہائی چالاک اور عیار ہے۔ اس نے اس فتوی کو بے اثر کرنے کے لئے پروپیگنڈہ شروع کیا کہ یہ فتوی جہاد کا فتویٰ ہے اور جہاد تمام کافروں کے خلاف جنگ کرنے کا نام ہے۔ لہذا اس فتویٰ کی زد جس طرح انگریزوں پر پڑیگی اس سے زیادہ اس فتوی سے ہندوستان کے غیر مسلم متاثر ہوں گے۔ اور اس پروپیگنڈے سے کچھ بھولے بھالے برادران وطن متاثر بھی ہوئے اور آج کے آزاد ہندوستان میں تو وطن دشمن طاقتیں اس پروپیگنڈے کو خوب ہوا دے رہی ہیں حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ اول تو اس وقت بھی حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کا فتویٰ صرف انگریزوں کے خلاف تھا۔ ہندوؤں اور سکھوں سے اس کا کوئی تعلق ہی نہیں تھا۔ جیسا کہ میرے کرم فرما پروفیسر خواجہ احمد فاروقی صاحب صراحت کے ساتھ تحریر فرماتے ہیں کہ

"انھوں (شاہ عبدالعزیز صاحب) نے کسی مرحلہ پر نہ ہندوؤں کے خلاف کوئی لفظ کہا اور نہ سکھوں کے خلاف۔ ان کا روئے سخن قطعاً انگریزوں کے خلاف تھا۔ ان کے پوتے حضرت

شاہ اسماعیل شہیدؒ نے کلکتہ میں دس ہزار انگریزوں کے سامنے قرآن پاک کی چند آیات کی تفسیر بیان کی اور ایک لفظ ہندوستان کی اکثریت کے خلاف نہیں کہا۔ یہی بات بہادر شاہ ظفر نے بھی کہی تھی کہ

"ہمارا جہاد انگریزوں کے خلاف ہے۔ ہندوؤں کے خلاف نہیں"

ماہنامہ ذکر و فکر رحمت اللہ کیرانوی نمبر ص۱۰

آزاد ہندوستان دار الامن ہے

ہندوستان علماء کے فتویٰ کے مطابق دار الامن ہے اور دار الامن میں جہاد جائز نہیں ہوتا بلکہ تمام برادران وطن کے ساتھ امن و آشتی کے ساتھ رہنا مسلمانوں کا فریضہ ہے۔ البتہ اگر کوئی بدامنی پھیلانا چاہے یا کوئی غنڈہ کسی پر حملہ آور ہو تو اس کا دفاع بلا لحاظ اختلاف مذہب و ملت ہر ہندوستانی کا اخلاقی و مذہبی فریضہ ہے۔ اور پھر یہ لحاظ کرنا بھی جرم ہے کہ یہ تخریب پسند اور غنڈہ کسی مذہب اور ملت سے تعلق رکھتا ہے۔ غنڈہ غنڈہ ہے اور تخریب پسند دشمن وطن ہے۔ چاہے اس کا نام عبد اللہ، عبد الرحمن ہو یا رام لال اور رام سنگھ ہو

شاہ عبد العزیزؒ اور انگریزی تعلیم

انگریزوں کے سیاسی چالوں کے ذیل میں اس کا تذکرہ بھی بجا تصور کیا جائے گا کہ مسلم عوام کو ان مجاہد علماء سے دور کرنے کے لئے یہ پروپیگنڈہ بھی بڑے زور و شور سے کیا جاتا ہے کہ علماء کرام انگریزی

تعلیم کو جو کہ اس زمانہ میں دنیادی ترقی کا ذریعہ ہے۔ اس کو حرام قرار دیتے ہیں اور یہ پروپیگنڈہ اس شدت کے ساتھ کیا جاتا ہے کہ بہت سے بھولے بھالے مسلمان اسے متاثر ہو کر علمار کرام کو برا بھلا کہنے لگتے ہیں حالانکہ واقعہ اس کے بالکل برخلاف ہے اور تاریخ شاہد ہے کہ ہر دور میں علمار کرام نے علوم و فنون کی سرپرستی کی ہے۔ زبان و ادب کے سلسلہ میں ان کا رویہ ہمیشہ رواداری کا رہا ہے۔

انگریزی اور دوسری اجنبی زبانوں کے سیکھنے میں خود علمار نے کبھی بخل اور تنگ نظری سے کام نہیں لیا اور عوام الناس کو بھی اس کی طرف برابر متوجہ کیا ہے۔ دہلی میں جب انگریزی تعلیم کا انتظام ہوا تو مسلمانوں نے کالجوں میں تعلیم حاصل کرنے کے متعلق شاہ عبدالعزیز صاحب سے فتوی طلب کیا تو آپ نے واضح لفظوں میں جائز قرار دیا چنانچہ سرسید احمد خاں لکھتے ہیں

"شاہ عبدالعزیز صاحب جو تمام ہندوستان میں نامی مولوی تھے مسلمانوں نے ان سے فتوی پوچھا تو انھوں نے جواب دیا کہ کالج انگریزی میں جانا اور پڑھنا اور انگریزی زبان کا سیکھنا بموجب مذہب کے درست ہے"

اسباب بغاوت ہند ص۲۸

تصنیفات و تالیفات

سراج الہند حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی نے تصنیف و تالیف کے ذریعہ علوم حدیث کی بیش بہا خدمات انجام دیا ہے شاہ عبدالعزیز صاحب صاحب تصانیف کثیرہ بزرگ تھے۔ آپ کی گراں قدر تصنیفات

حسب ذیل ہیں۔

۱۔ فتح العزیز (معروف بہ تفسیر عزیزی)

شاہ صاحب نے اس کو شدت مرض اور ضعف کی حالت میں املا کرایا تھا۔ یہ کئی جلدوں میں تھی جس کا بڑا حصہ ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ میں ضائع ہوگیا اور شروع اور آخیر کی دو جلدیں بچ گئیں اور یہ تفسیر عزیزی جامعہ رحیمیہ کی لائبریری میں موجود ہے۔

۲۔ تحفہ اثنا عشریہ (فارسی)

شاہ صاحب کی شاہکار تصنیف ہے۔ مذہب شیعہ کی تنقید و تردید میں ہے۔ زبان و بیان کے اعتبار سے اہل زبان کی سی روانی و برجستگی اور فصاحت و بلاغت ہے۔ اصلاً فارسی میں ہے اب اردو میں ترجمہ ہو چکا ہے۔

۳۔ بستان المحدثین (عربی)

شاہ صاحب کی اہم تصنیف ہے جو کتب حدیث اور محدثین کی تفصیلی فہرست و تذکرہ اور تعارف ہے۔

۴۔ العجالة النافعة (فارسی)

اصول حدیث میں اہم فارسی رسالہ ہے۔

۵۔ میزان البلاغة (عربی)

علم بلاغت کا ایک جاندار و شاندار مختصر متن ہے۔

۶۔ السر الجلیل فی مسئلة التفضیل

شاہ صاحب نے اس رسالہ میں خلفاء راشدین کے فرق مراتب پر نہایت محققانہ گفتگو کی ہے۔

۷۔ میزان الکلام (عربی)

علم کلام میں ایک مختصر رسالہ ہے۔ جو نہایت ہی جامع ومانع ہے۔

۸۔ سر الشہادتین (عربی)

ذکر حضرت حسنین ؓ میں ایک شاندار عربی رسالہ ہے۔

۹۔ مجموعہ فتاویٰ (فارسی)

یہ آپ کے مختلف فتاوے کا مجموعہ ہے۔

۱۰۔ عزیز الاقتباس فی فضائل اخیار الناس (عربی)

۱۱۔ تقریر دلپذیر فی شرح عدیم النظیر (فارسی)

۱۲۔ ھدایۃ المؤمنین بر حاشیہ سوالات عشرہ محرم (اردو)

۱۳۔ حواشی بدیع المیزان (عربی)

۱۴۔ حواشی شرح عقائد (عربی)

۱۵۔ تعلیقات علی المسوی من احادیث الموطأ (عربی)

۱۶۔ رسالہ تعبیر الرویاء

۱۷۔ میر زاھد رسالہ پر حاشیہ (عربی)

۱۸۔ میرزاھد ملا جلال پر حاشیہ (عربی)

۱۹۔ میرزاھد شرح مواقف پر حاشیہ (عربی)

۲۰۔ حاشیہ ملا کوسج حاشیہ بنام عزیزیہ (عربی)

۲۱۔ شرح ھدایۃ الحکمۃ پر حاشیہ

۲۲۔ ارجوزۃ اصمعی کی شرح بھی لکھی ہے۔

وفات

حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کی وفات ۸۰ سال کی عمر میں بروز یکشنبہ بتاریخ ۷ رشوال ۱۲۳۹ھ مطابق ۱۷ رجولائی ۱۸۲۳ء کو ہوئی اور

قبرستان مہندیان میں اپنے والد بزرگوار کے پہلو میں دفن ہوئے۔
حکیم مومن خاں مومن نے تاریخ وفات کہی ہے۔ ؎

جانب ملک عدم تشریف فرما کیوں ہوئے
آگیا تھا کیا کہیں مردوں کے ایمان میں خلل
دست بیداد اجل سے بے سر و پا ہو گئے
فقر و دین، فضل و ہنر، لطف و کرم، علم و عمل
۱۲۳۹ھ

لوح مزار پر یہ عبارت مرقوم ہے۔

مرقد

حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی ابن حجۃ الاسلام حضرت مولانا امام شاہ ولی اللہ محدث دہلوی
سن پیدائش ۱۱۵۹ھ
تاریخ وفات ۷ شوال المکرم ۱۲۳۹ھ بروز یکشنبہ بعمر ۸۰ سال رحلت نمود (عہد اکبر شاہ ثانی)

شاہ رفیع الدین محدث

ولادت اور تعلیم

مفسر قرآن حضرت امام شاہ رفیع الدین دہلوی، حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے دوسرے باکمال فرزند تھے۔ آپ ۱۱۶۳ھ ۔ ۱۷۴۹ء میں دہلی پیدا ہوئے صغر سنی میں سایہ پدری سے محروم ہوگئے۔ آپ کی تعلیم و تربیت کا تمام تر نظم و نسق آپ کے برادر بزرگوار حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ کے ذمہ رہا۔ جس کو آپ نے بحسن خوبی نباہا اور باپ کی کمی بالکل محسوس نہ ہونے دیا۔

شاہ رفیع الدینؒ نے تمام علوم نقلیہ مثلاً فقہ، حدیث، تفسیر اور جملہ علوم عقلیہ اپنے برادر معظم شاہ عبدالعزیز صاحبؒ سے حاصل کر کے ان تمام علوم ظاہری میں کمال حاصل کیا اور باطنی علوم کی تکمیل حضرت شاہ صاحب نے حضرت محمد عاشق پھلتیؒ سے کی اور ایک باکمال صاحب دل، عارف باللہ شیخ بن گئے۔ اور موصوف اپنی فطری صلاحیتوں کی بنا پر بہت ہی جلد ظاہری اور باطنی علوم و معارف سے بہرہ ور ہو کر صرف ۲۰ برس کی عمر میں مرجع خلائق بن چکے تھے۔

درس و تدریس

شاہ عبدالعزیز صاحب آخر عمر میں جب کثرت امراض کی بنا پر درس و تدریس سے معذور ہو گئے تو اپنی جگہ شاہ رفیع الدین صاحب کو مامور فرمایا اور حضرت شاہ رفیع الدین صاحب نے بھی شاہ عبدالرحیم، شاہ ولی اللہ اور شاہ عبدالعزیزؒ کی مسند درس کی نہ صرف لاج رکھی بلکہ اپنے آباو اجداد کے علمی وقار کو دوبالا فرمایا اور آغاز ہی سے درس و تدریس، قضاء و افتاء اور تصنیف و تالیف کا ایسا پر وقار انداز اختیار فرمایا جو ولی اللہی خانوادہ کے شایان شان ہو سکتا تھا جس کا اعتراف شاہ عبدالعزیز بڑے زوردار الفاظ میں فرمایا کرتے تھے لہذا اپنے ایک مکتوب بنام شیخ احمد بن محمد شیروانیؒ میں تحریر فرماتے ہیں کہ:-

> "اب برادر یگانہ اور خلیق زمانہ کا وقت ہے، جو نسباً میرے حقیقی بھائی ہیں اور فنون علم و ادب میں (جن کا لوگ مجھ سے انتساب کرتے ہیں) میرے شریک ہیں وہ عمر میں مجھ سے کچھ ہی چھوٹے ہیں مگر فن و حکمت میں میرے برابر ہیں، اللہ تعالیٰ نے اپنی مہربانی سے ان کی پرورش میرے ہاتھوں کی اور ان کی تکمیل کا مجھے ذریعہ بنا کر مجھ پر احسان کیا۔"

تاریخ دعوت و عزیمت ص۳۸۲

سرسید مرحوم کا اعتراف کمال

اور سرسید احمد خان مرحوم بانی مسلم یونیورسٹی علیگڑھ جو شاہ ولی اللہ اور خاندان ولی اللہی کے بڑے مداح و قدردان تھے خصوصاً شاہ عبدالعزیز محدث اور شاہ رفیع الدین دہلوی سے بڑی عقیدت و ارادت رکھتے تھے۔ وہ شاہ رفیع الدین

دہلویؒ کے متعلق "آثار الصنادید" میں تحریر فرماتے ہیں کہ

" دیار ہندوستان کے جمیع فضلار کے نامی انھیں حضرت فیض موہبت کے مستفیضوں میں سے ہیں۔ ہر فن کے ساتھ اس طرح کی مناسبت تھی کہ ایک وقت میں فنون متبائنہ اور علوم مختلفہ درس فرماتے تھے ۔ جب ایک کی تعلیم سے دوسرے کی تعلیم کی طرف متوجہ ہوتے، حضار خدمت کو یہ معلوم ہوتا تھا کہ گویا اسی فن میں جامۂ یکتائی ان کے قامت استعداد پر قطع ہوا ہے۔ باوجود ان کمالات کے افاضۂ فیض باطن کا یہ حال تھا کہ جنید بغدادیؒ اور حسن بصریؒ کہ اگر ان کے وقت میں ہوتے تو بیشک ولاریب اس میں اپنے تئیں کمترین مستفیدان تصور کرتے۔"

آثار الصنادید ص۵۴۳

علم ریاضی میں مہارت

حضرت شاہ رفیع الدین دہلوی صاحب تفسیر قرآن، حدیث، فقہ منطق، فلسفہ اور عربی زبان و ادب میں مہارت تامہ کے ساتھ ساتھ علم ریاضی میں بھی حیرت انگیز دستگاہ رکھتے تھے۔ آپ کو تو اس مشکل فن میں "موجد" ہونے کی حیثیت حاصل تھی۔ آپ کے معاصرین نے آپ کے اس وہبی کمال کا کھلے لفظوں میں اعتراف کیا ہے خود شاہ عبدالعزیز صاحب نے لکھا ہے کہ

" مولوی رفیع الدین در ریاضیات چنداں ترقی کردہ اند کہ شاید موجد آن بودہ باشد۔ مولوی رفیع الدین نے ریاضیات میں اس قدر ترقی کی کہ اس فن کے موجد نے بھی اس سے زیادہ نہ کی ہوگی۔"

ملفوظات شاہ عبدالعزیز ص۴۲ و کمالات عزیزی ص۵۶

ایک دوسری جگہ فرماتے ہیں

" در فن ریاضی مولوی رفیع در ہند و ولایت نخواہد بود "

مولوی رفیع الدین کا فن ریاضی میں ہند اور ولایت میں مثل نہ تھا۔

کمالات عزیزی ص۳

قرآن مجید کا اردو ترجمہ

شیخ الاسلام حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے ترجمہ کلام پاک کی جو انقلابی تحریک چلائی اسے آپ کے جلیل القدر صاحبزادگان نے آگے بڑھایا۔ شاہ صاحب کے بعد سب سے پہلے حضرت شاہ عبدالقادر دہلوی نے قرآن مجید کا با محاورہ اردو ترجمہ کیا۔ ان کے بعد حضرت شاہ رفیع الدین دہلوی نے تحت اللفظ اردو ترجمہ فرمایا۔

شاہ عبدالقادر محدث دہلوی اور شاہ رفیع الدین کے ترجموں میں جو واضح فرق ہے اس کو بڑی حد تک ظاہر کرتے ہوئے بابائے اردو مولوی عبدالحق مرحوم لکھتے ہیں:۔

" یوں تو دونوں ترجمے لفظی ہیں لیکن شاہ رفیع الدین نے ترجمے میں عربی جملے کی ترکیب اور ساخت کی بہت زیادہ پابندی کی ہے۔ ایک حرف ادھر سے ادھر نہیں ہونے پایا۔ ہر عربی لفظ بلکہ ہر حرف کا ترجمہ خواہ اردو زبان کے محاورے میں کھپے یا نہ کھپے انھیں کرنا ضروری ہے

شاہ عبدالقادر کے ترجمے میں اس قدر پابندی نہیں کی گئی ہے بلکہ وہ مفہوم کی صحت اور اصل لفظ کے حسن کو برقرار رکھنے کے علاوہ اردو زبان کے روزمرے اور محاورے کا بھی خیال رکھتے ہیں۔ دوسری

خوبی ان کے ترجمے میں ایجاز کی ہے۔ یعنی وہ ہمیشہ اس بات کو مدنظر رکھتے ہیں کہ جہاں تک ممکن ہو کم سے کم الفاظ میں پورا مفہوم صحت کے ساتھ ادا ہو جائے۔"

مولوی عبدالحق صاحب کی بات میں ذرا بھی شبہہ نہیں کہ شاہ رفیع الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے زیادہ تر لفظی ترجمہ کا اہتمام کیا ہے لیکن اس کا یہ معنی نہیں کہ بامحاورہ ترجمہ بالکل ہی نہیں کیا ہے۔ بلکہ کہیں کہیں بامحاورہ ترجمہ بھی کیا ہے اور بڑا ہی دلچسپ کیا ہے۔

شاہ عبدالعزیز محدث شاہ رفیع الدین کے تفسیری ذوق کے متعلق شیخ احمد بن محمد شیروانی کو خط میں لکھتے ہیں کہ :

"وہ (شاہ رفیع الدین صاحب) چند دنوں کے سفر کے بعد واپس آئے تو مجھے ایک مختصر مگر قیمتی رسالہ کا تحفہ دیا۔ جو ایسے لطائف و نکات پر مشتمل ہے، جن میں وہ منفرد ہیں اور ان سے پہلے انھیں کسی نے نہیں لکھا ان کی یہ انفرادیت آیت نور کی تفسیر اور اس کے اندر پوشیدہ معانی کی رونمائی کے سلسلہ میں ہے۔ پورے یقین کے ساتھ کہتا ہوں کہ اس باب میں ان کے بیانات ایسے حیرت انگیز ہیں جن کے ذریعہ انھوں نے مغز سخن کو ظاہر کر دیا اور دلوں کے چراغ روشن کر دیئے اور اپنے اسلوب کی انفرادیت سے سعید روحوں کو تازہ دم کر دیا ہے۔"

تصنیف و تالیف

شاہ رفیع الدین رحمۃ اللہ علیہ کثیر التصانیف عالم دین اور شیخ طریقت تھے۔ آپ کی گرانقدر تصانیف و تالیفات حسب ذیل ہیں۔

اردو ترجمہ قرآن مجید، مقدمہ العلم، تکمیل الاذہان، اسرار المحبۃ، قیامت نامہ دمغ الباطل، اثبات شق القمر، تحقیق الوان، حجاب، برہان تمانع، عقد انامل رسالہ میر زاہد پر حاشیہ، اور تکمیل الصناعۃ وغیرہ۔

حضرت شاہ رفیع الدین رحمۃ اللہ علیہ کی اکثر کتابیں اس دور میں کم یاب ہی نہیں بلکہ نایاب بھی ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اس دور میں ایسی علمی اور تحقیقی کتابوں کی کھپت نہیں۔ مکتبہ والے بھی ان کتابوں کی اشاعت و ترویج کی طرف توجہ نہیں دیتے۔

شیخ محسن بن یحییٰ ترہتیؒ "الیانع الجنی" میں شاہ رفیع الدین صاحب کے کمالات علمیہ اور تصانیف انیقہ پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں کہ

> "ان مروجہ علوم کے علاوہ شاہ صاحب کو علوم اوائل میں بھی مہارت تامہ حاصل تھی، جو ان کی طرح بہت کم اہل علم کے حصہ میں آتی ہے ان کی تصانیف بہت عمدہ اور مرصع ہیں.......... میں نے بعض کتابیں دیکھیں تو آپ کی علمی و فنی عبارتوں میں ایسے اسرار و رموز نظر آئے جن کے رمز آشنا کم ہی ہوتے ہیں، تھوڑے سے لفظوں میں آپ بہت سے مسائل جمع کر دیتے ہیں، جس سے آپ کی علمی گہرائی اور دقت فہم کا اندازہ ہوتا ہے"

بحوالہ تاریخ دعوت و عزیمت ص ۲۸۲

شعر و شاعری

شاہ رفیع الدین دہلویؒ عربی کے بلند پایہ شاعر اور ادیب تھے اور جس طرح نثر لکھنے میں ملکہ راسخہ رکھتے تھے اسی طرح شعر و شاعری میں بھی اعلیٰ قابلیتوں کے حامل اور بے پایاں خصوصیات کے مالک تھے۔ آپ کے اشعار

وقصائد میں سلاست، روانی، شوکت الفاظ، بلندی تخیل اور شگفتگی بدرجہ اتم موجود ہے۔ دلآویز ترکیبیں، عمدہ اور نادر تشبیہات، عجیب وغریب استعارات آپ کے اشعار کا اہم جزء ہیں۔ نمونے کے طور پر چند اشعار پیش ہیں

یا احمد المختار یا زین الوریٰ	یا خاتما للرسل ما اعلاکا
یا کاشف الضرّاء من مستنجد	یا منجیا فی الحشر من والاکا
هل کان غیرک فی الأنام من استوٰی	فوق البراق و جاوز الأفلاکا
واستمسک الروح الامین رکابه	فی سیره و استخدم الأفلاکا

وفات

شاہ رفیع الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کی زندگی میں ۶ رشوال ۱۲۳۳ھ ـ ۱۸۱۷ء میں انتقال فرمایا اور اپنے والد ماجد شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے قریب پائنتی کی طرف دفن ہوئے۔

شاہ عبدالعزیز کی کیفیت

شاہ رفیع الدین رحمۃ اللہ علیہ جیسے جلیل القدر شیخ طریقت اور امام وقت کو جب لوگ دفن کرکے فارغ ہوئے تو اس وقت شاہ عبدالعزیز محدث پر عجیب وغریب کیفیت طاری تھی اور بڑے سوز ودرد کے ساتھ ارشاد فرمایا۔

"رفیع الدین سے میرا چار طرح کا رشتہ تھا۔ ایک تو حقیقی بھائی تھے۔ دوسرے یہ کہ قبلہ گاہی (والد ماجد) نے ایک تقریب میں انھیں میرے سپرد کرکے کہا کہ یہ تمہارا لڑکا ہے۔ تیسرے ہم نے اور انھوں نے ایک ہی دائی کا دودھ پیا تھا۔ چوتھے وہ میرے شاگرد تھے۔"

کسی نے اسی سلسلہ میں ان سے عرض کیا کہ "شاہ رفیع الدین" سے اس خاندان کی بڑی علمی عزت تھی۔ شاہ عبدالعزیز صاحب نے اس وقت برجستہ فرمایا اور حقیقت یہ ہے ایک سچی اور خالص محبت کی اس سے اچھی تعبیر نہیں ہو سکتی۔
"اگر وہ جاہل بھی ہوتے تو مجھے ان کا اسی قدر درد ہوتا"
تذکرہ حضرت شاہ ولی اللہؒ ص ۲۸۳

اولاد

شاہ رفیع الدین محدث دہلوی کے چار صاحبزادے تھے۔ مولوی محمد موسیٰ مولوی عیسیٰ، مولوی مخصوص اللہ اور مولوی حسن جان رحمہم اللہ اور یہ چاروں صاحبزدگان بھی فضل و کمال میں ولی اللہی خاندان کی یادگار تھے۔

لوح مزار ملاحظہ ہو۔

مرقد

حضرت مولانا شاہ رفیع الدین محدث دہلویؒ ابن حجۃ الاسلام حضرت مولانا امام شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ
وفات ۱۲۳۳ھ بزمانہ اکبر شاہ ثانی بعمر ۷۰ سال رحلت نمود

شاہ عبدالقادر محدث

ولادت باسعادت

امام المفسرین حضرت شاہ عبدالقادر محدث دہلویؒ کی ولادت باسعادت ۱۱۶۷ھ میں دہلی میں ہوئی۔ آپ ۹ برس کے تھے کہ سایہ پدری سے محروم ہو گئے۔ اور حسب وصیت والد ماجدؒ حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ کی سرپرستی میں آئے۔

شاہ عبدالعزیز صاحب نے اس بار امانت کی خوب خوب آبیاری کی اور والد محترم کی وصیت کو کما حقہ، ادا کرنے میں کوئی دریغ نہیں کیا۔ اور اس انمول موتی کی خوب نگاہ داشت فرمائی، لہذا علوم ظاہری کی ذمہ داری خود سنبھالی اور طریقت کی تعلیم کے لئے مولانا عبدالعدل دہلویؒ کے سپرد فرمایا۔ لہذا کتب متداولہ کی تکمیل شاہ عبدالعزیز صاحب سے کی اور علوم طریقت شاہ عبدالعدل دہلویؒ سے حاصل کئے۔

علمی مقام

امام المفسرین حضرت شاہ عبدالقادر دہلویؒ ہندوستان کے عظیم مفسر قرآن، جلیل القدر محدث اور فخر روزگار ولی اللہی عالم دین تھے۔
آپ نہ صرف قرآن وحدیث بلکہ جملہ علوم وفنون میں ملکۂ راسخہ رکھتے اور تقریباً تمام معاصرین آپ کو جملہ علوم میں سند کی حیثیت دیتے تھے۔ آپ کی علمی عظمت وشہرت نے جغرافیائی حدود پار کر کے عالمگیر حیثیت حاصل کر لی تھی اور ہر شخص برملا۔ آپ کے فضل وکمال کا اعتراف کرنے پر مجبور تھا۔ لہٰذا سرسید احمد خاں مرحوم لکھتے ہیں

"آپ کے علم وفضل کا بیان کرنا ایسا ہے کہ کوئی آفتاب کی تعریف فروغ اور فلک کی مدح بلندی کے ساتھ کرے۔ زبان کو کیا طاقت کہ ایک حرف حضرت کی صفات سے لکھ سکے۔ اور قلم کی کیا مجال کہ آپ کی مدائح سے ایک ذرہ لکھ سکے۔"

آثار الصنادید ص۵۴۶

خاندان ولی اللہی کا اردو سے گہرا تعلق

حضرت شاہ عبدالقادر دہلویؒ علوم حدیث وقرآن دیگر علوم عقلیہ ونقلیہ میں مہارت تامہ کے ساتھ عربی فارسی اور اردو کے مایہ ناز ادیب اور بہترین انشاء پرداز بھی تھے۔ موصوف تینوں زبانوں میں برجستہ بولنے اور لکھنے پر قدرت تامہ رکھتے تھے۔
آپ کی اردو زبان نہایت شگفتہ، شستہ اور سادہ ہوتی تھی۔ آپ کا شمار بلاشبہ اردو زبان وادب کے اولیں معماروں میں کیا جانا چاہیئے۔ اور

تاریخ اردو زبان وادب کا بڑا ظلم ہے کہ شاہ رفیع الدین اور شاہ عبدالقادر جیسے معماران اردو کو اس نے فراموش کر دیا ہے۔ حالانکہ پورے خاندان ولی اللہی خصوصاً شاہ رفیع الدین اور شاہ عبدالقادر رحمہما اللہ کا اردو زبان وادب پر بڑا احسان ہے حتی کہ ہندوستان کے مشہور شاعر حکیم مومن خاں مومن کو بھی شاہ عبدالقادر دہلوی سے شرف تلمذ حاصل ہے جیساکہ عرش گیاوی نے "مطالعہ مومن" میں مومن کے بارے میں تحریر فرمایا ہے

"تعلیم ان کی اسی مدرسہ (مدرسہ شاہ عبدالعزیز) میں ہوئی کچھ کتابیں تبرکاً شاہ عبدالعزیز صاحبؒ سے اور بقیہ شاہ عبدالقادر صاحب سے پڑھیں اور یہیں عربی، فارسی، حدیث فقہ، منطق اور معانی وغیرہ کی بھی تکمیل ہوئی۔"

مطالعہ مومن ص۲۲

شاہ عبدالقادر اور خواجہ میر درد

ناصر نذیر صاحب فراق بھی اپنی مشہور کتاب "لال قلعہ کی ایک جھلک" میں لکھتے ہیں کہ:-

"مولانا ولی اللہ رحمتہ اللہ علیہ اپنے بچوں سے کہا کرتے تھے جس طرح اصول حدیث اور اصول فقہ فن ہے۔ اسی طرح حصول زبان بھی فن ہے۔ اردو زبان کے موجد و مجتہد خواجہ میر درد صاحب ہیں ان کی صحبت اس فن کے واسطے غنیمت سمجھو کیونکہ خواجہ صاحب یکے یان ہیں، چنانچہ شاہ عبدالقادر رحمتہ اللہ علیہ خاص طور پر خواجہ میر درد صاحب کے شاگرد تھے۔"

مطالعہ مومن ص۲۳

خواجہ میر دردؔ ہندوستان کے عظیم صوفی شاعر تھے۔ آپ کا ولی اللہی خانوادہ سے گہرا تعلق تھا۔ اردو اور دو زبان و ادب کے معاملہ میں خواجہ میر دردؔ سند کی حیثیت رکھتے تھے یہی وجہ ہے کہ شاہ عبد القادر صاحبؒ آپ کی ادبی مجلس میں تشریف لیجایا کرتے اور اردو کے محاورے سیکھتے، زبان و ادب کے ساتھ یہ لگاؤ اور تعلق اس خاندان ولی اللہی کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ ہر زمانہ کے تقریباً تمام ہی علماء زبان و ادب کی خدمت میں فراخ حوصلہ رہے ہیں بلکہ اگر تعصب کی عینک ہٹا کر علماء اسلام کی زندگیوں کا گہرا مطالعہ کیا جائے تو علماء کا قدم اس میدان میں بھی کسی سے پیچھے نظر نہیں آئیگا بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ اس وقت بجا طور پر کہا جا سکتا ہے۔ آزاد ہندوستان میں اردو کا وجود ہی ان علماء اسلام اور مدارس اسلامیہ کا رہین منت ہے۔ لیکن بڑی ستم ظریفی یہ ہے کہ طبقہ علماء ہی کو اردو ادب کی دنیا سے خارج کر دیا گیا۔ اور جو لوگ اپنے بچوں تک کو اردو اسکولوں میں بھیجنا بھی گوارا نہیں کرتے جس کے نتیجہ میں ان کے گھروں سے اردو بالکل خارج ہوتی جا رہی ہے۔ وہ اردو کے ٹھیکیدار بنے ہوئے ہیں یہ ظلم نہیں تو کیا ہے۔

درس وتدریس

حضرت شاہ عبد القادرؒ نے تصنیف و تالیف اور عبادت و ریاضت کے ساتھ درس و تدریس کا مشغلہ بھی ہمیشہ جاری رکھا۔ اس لئے آپ نے دہلی کی اکبرآبادی مسجد کا انتخاب فرمایا۔ آپ اس تاریخی مسجد میں ایک عرصہ تک بیٹھ کر ظاہری و باطنی علوم و معارف کے دریا بہائے اور طالبانِ علم و معرفت کو سیراب کرتے رہے۔ آپ کی اس ایمانی و روحانی درسگاہ سے فیض یاب ہوتے والوں میں دنیائے اسلام کی مشہور و مقتدر شخصیتیں شامل

ہیں۔ مولانا عبدالحئی بن ہبتہ اللہ بڑھانویؒ، مولانا محمد اسماعیل شہیدؒ بن شاہ عبدالغنی دہلوی، مولانا فضل حق بن مولانا فضل امام خیرآبادیؒ، مرزا حسن علی شافعی لکھنویؒ، شاہ اسحاق محدث دہلویؒ، مولانا سید محبوب علی جعفری، مولانا سید اسحاق بن عرفان رائے بریلوی جیسی شہرہ آفاق شخصیتیں خاص طور پر قابل ذکر ہیں جو حضرت کے فیضان علم کی بدولت دین اسلام کے صحیح مبلغ اور مکتب ولی اللہی کے امین بنکر افق عالم پر چمکے اور پورے عالم کو علوم ولی اللہی سے منور کر دیا۔

زہد و ورع

حضرت شاہ عبدالقادر دہلوی خاندان ولی اللہی میں مسلم الثبوت صوفی اور ولی اللہ تھے۔ آپ زہد و ورع اور اخلاص و للہیت میں اپنے بھائیوں میں بھی ممتاز و منفرد حیثیت کے مالک تھے۔

حضرت شاہ فضل رحمان گنج مراد آبادی رحمتہ اللہ فرماتے تھے کہ "شاہ صاحب کے صاحبزادوں میں 'صاحب نسبت' بزرگ شاہ عبدالقادر تھے اور صاحب نسبت ہونیکی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ صاحب نسبت وہ ہے کہ جس بات کا ارادہ کرلے خدا تعالیٰ اسے پورا فرمائے"

مقالات پروفیسر خلیق نظامی

اس کے ساتھ ساتھ آپ کا شمار زبردست صاحب کشف بزرگوں میں ہوتا تھا جس کے معتقد آپ کے برادر محترم اور استاذ و مربی اور صاحب کشف و کرامات بزرگ شاہ عبدالعزیز صاحب رحمتہ اللہ علیہ بھی تھے جیسا کہ مولانا امیر شاہ خاں تحریر فرماتے ہیں کہ اس کا پتہ چلانے کے لئے کہ عید کا چاند تیس کا ہوگا

یا انتیس کا ہمیشہ حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب رحمۃ اللہ علیہ رمضان کی پہلی تاریخ کو آدمی بھیجکر دریافت کراتے۔

"میاں عبدالقادر نے آج کتنے سپارے پڑھے ہیں؟ اگر آدمی آکر یہ کہتا کہ آج دو پڑھے ہیں تو شاہ صاحب فرماتے کہ عید کا چاند تو انتیس ہی کا ہوگا۔ یہ بات دوسری ہے کہ ابر وغیرہ کی وجہ سے دکھائی نہ دے اور صحت شرعی نہ ہونے کی وجہ سے ہم رویت کا حکم نہ لگا سکیں۔

امیرالروایات ص۱۰۵

کیونکہ شاہ عبدالقادر صاحب کو رمضان کا چاند ہوتے ہی اپنے کشف صادق سے پتہ چل جاتا تھا کہ یہ رمضان ۲۹ دن کا ہوگا یا ۳۰ دن کا اور پہلی شب میں آپ اسی اعتبار سے تراویح میں قرآن پڑھتے اور آپ کا یہ مکاشفہ زبان زد خاص و عام تھا۔ حتیٰ کہ دہلی کے دھوبی اور درزی بھی حضرت کی پہلی تراویح کو اپنے کام کے نظم کی بنیاد قرار دیتے۔

شاہ صاحب کے کشف و کرامات کا اعتراف کرتے ہوئے سرسید احمد خاں مرحوم لکھتے ہیں کہ:

"بارہا ثقات کی زبان سے سنا گیا کہ جس امر میں کچھ فرمایا ویسا ہی کم و کاست ظہور میں آیا۔

آثار الصنادید ص۵۴

شاہ صاحب کی کشف و کرامات بیان کیا جائے تو ایک مستقل کتاب تیار ہو جائے گی ایک مختصر واقعہ مولانا امیر شاہ خاں کے لفظوں میں ملاحظہ فرمایئے جس سے اندازہ ہو جائیگا کہ شاہ عبدالقادر کس قدر صاحب کشف بزرگ تھے۔ امیر شاہ خاں بیان فرماتے ہیں کہ:

"سلام کرنیوالے کے سلام سے ہی آپ پر منکشف ہو جاتا کہ سلام

کرنے والا شخص شیعہ ہے یا سنی لہٰذا جب بھی آپ کو کوئی سلام
کرتا تو آپ زبانی جواب کے ساتھ ساتھ شیعہ صاحبان کو
بائیں ہاتھ اور سنی صاحبان کو دائیں ہاتھ سے اشارہ فرماتے اور اکثر
شیعہ صاحبان بطور آزمائش آپ کو سلام کرتے اور بعض شیعہ
صاحبان نے تو اس آزمائش پر ہی اپنے عقیدے سے توبہ کر کے
سنی بن گئے تھے۔"

جلالتِ شان

اگرچہ آپ بے پناہ متواضع و منکسر المزاج تھے مگر آپ کی جلالت
شان اور قدرتی رعب کا یہ عالم تھا کہ بڑے بڑے امراء اور روساء بھی آپ
کی جلالت شان کے آگے مرعوب ہوئے بغیر نہیں رہتے تھے۔ اور استغنا
بھی اتنا تھا کہ امراء اور اغنیاء آپ کی زیارت کو آتے اور تحفے و تحائف
پیش کرتے تو آپ باوجود تہی دست ہونے کے نہ صرف یہ کہ ان کا ہدیہ
قبول نہیں کرتے تھے بلکہ ان امراء کی مدارات اس طرح فرماتے کہ ان کو
آپکے تہی دست ہونے کا احساس بھی نہیں ہوتا۔ جیسا کہ آثار الصنادید میں
سر سید احمد خاں لکھتے ہیں :-

"باوجود اس کے کہ بسبب کثرت اخلاق کےکسی کے حق میں کچھ
ارشاد نہ کرتے اور کسی کو نہ فرماتے کہ اِدھر بیٹھ یا اُدھر لیکن
منجانب اللہ لوگوں کے دل میں آپ کا ایسا رعب چھایا ہوا تھا
کہ روسائے شہر جب آپ کی خدمت میں حاضر ہوتے بسبب
ادب کے دور دور خاموش بیٹھتے اور بدون آپ کی تحریک کے
مجال سخن نہ پاتے اور ایک یا دو بات کے سوا یارا نہ دیکھتے کہ

کچھ اور کلام کریں "
آثار الصنادید صہ٥٤٧

ترجمہ قرآن اور اردو زبان

حضرت شاہ عبدالقادر محدث دہلوی اٹھارویں صدی عیسوی کے جلیل القدر ترجمان القرآن اور عالم دین تھے۔

ہندوستان میں شاہ ولی اللہ کے بعد سب سے پہلا شخص جس نے نوعمر اور نوزائیدہ اردو زبان میں بامحاورہ ترجمہ قرآن مجید کیا وہ عظیم شخصیت شاہ عبدالقادرؒ کی ہے۔

شاہ صاحب نے مسلسل ۴۰ برس تک مسجد اکبر آبادی میں اعتکاف کر کے ترجمہ قرآن مجید مکمل کیا۔ آپ نے اپنی تمام علمی، روحانی اور کشفی صلاحیت و قابلیت کو ترجمہ قرآن مجید کے لئے وقف کر دیا تھا۔ علماء نے لکھا ہے کہ شاہ صاحب کا ترجمہ قرآن نہ صرف قدیم اردوئے معلیٰ کا نمونہ ہے بلکہ مراد خداوندی کو صحیح صحیح ادا کرنے کے لحاظ سے بھی یہ ترجمہ اپنے مصنف کی الہامی بصیرت کا شاہکار ہے اور اسی بناء پر شاہ صاحب کے تفسیری فوائد بھی نہایت عجیب و غریب حکیمانہ نکات پر مشتمل ہیں۔

لہذا شاہ صاحب کے ترجمہ اور فوائد پر تبصرہ کرتے ہوئے مولانا سید انور شاہ کشمیریؒ شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند فرماتے ہیں کہ:

> "ترجمہ کی طرح شاہ صاحب کے تفسیری اجتہادات میں بھی الہامی بصیرت کی روشنی نظر آتی ہے۔ بڑی بڑی تفسیریں ان علمی نکات و لطائف سے خالی ہیں جنھیں حضرت شاہ صاحبؒ

نے مختصر مختصر جملوں میں بیان کیا ہے۔

(تقریر ترمذی)

اور آپ کے ترجمہ پر تبصرہ کرتے ہوئے حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب رح مہتمم دارالعلوم دیوبند تحریر فرماتے ہیں کہ :۔

"حضرت شاہ عبدالقادر صاحب رحمتہ اللہ علیہ کا ترجمہ یوم آغاز سے اب تک تسلسل کے ساتھ بلا انقطاع مقبولیت کی اعلیٰ سطح پر پہنچا ہوا ہے جس میں خاندان ولی اللہی کے فکر کی جھلکیاں غلبہ کے ساتھ صاف طور پر نمایاں ہیں ترجمہ تحت اللفظ ہونے کے باوجود معنی خیز اور قرآن کے حقیقی مفہوم کی پوری پوری ترجمانی پر مشتمل ہے۔ حضرت ممدوح ترجمہ میں کہیں بھی کوئی ایسا زائد لفظ استعمال نہیں فرماتے جو قرآن کے اصل مفہوم سے زائد یا کم ہو۔ اس ترجمہ کی وہ بلاغت ہے جس کے بارے میں میں نے اپنے بزرگوں سے حضرت اقدس مولانا محمد قاسم رحمتہ اللہ علیہ کا یہ مقولہ سنا ہے کہ اگر اردو میں قرآن نازل ہوتا تو شاید اس کی تعبیرات وہی یا اس کے قریب قریب ہوتیں جو اس ترجمہ کی ہیں"

محاسن موضح قرآن ص ۱۷

حتی کہ گلزار دہلوی جو ایک غیر مسلم شاعر ہیں مگر علوم اسلامیہ اور زبان پر بصیرت رکھتے ہیں۔ انھوں نے اردو بازار جامع مسجد دہلی میں ایک تاریخی مشاعرہ میں یہ شعر پڑھا ؎

احمدؐ پاک کی خاطر تھی خدا کو بھی منظور\
ورنہ قرآن بھی اترتا بزبانِ دِلی

اور مشاعرہ کے اختتام پر جب محترم علی محمد شیر میواتی صاحب متولی درگاہ

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے ان سے دریافت فرمایا کہ اس شعر سے آپ کی مراد دلی کے کس شاعر اور ادیب کی زبان ہے تو گلزار صاحب نے برجستہ جواب دیا کہ میری مراد شاہ عبد القادر کی زبان ہے۔ یہ واقعہ مجھے جناب علی محمد شیر میوات صاحب نے سنایا تھا۔ اسکے بعد اتفاق سے مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی سیمینار میں گلزار صاحب دہلوی سے ملاقات ہوئی۔ راقم الحروف نے اس واقعہ کی تصدیق چاہی تو گلزار صاحب دہلوی نے نہ صرف یہ کہ تصدیق کی بلکہ خاندان ولی اللہی سے غیر معمولی عقیدت کا اظہار کیا۔

اور شاہ صاحب کو خود بھی اپنے ترجمہ اور تفسیر پر بڑا اعتماد تھا جس کا اظہار حضرت مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی کے ان الفاظ سے ہوتا ہے۔ مولانا تحریر فرماتے ہیں کہ:

میں نے بعض بزرگوں سے سنا ہے کہ مولانا شاہ عبد القادر موضح قرآن لکھ چکے تو فارسی کا یہ شعر تھوڑے سے تصرف کے ساتھ پڑھتے تھے۔

روز قیامت ہر کسے با خویش دارد نامۂ
من نیز حاضر می شوم تفسیر قرآن در بغل

انتقال پُر ملال

شاہ عبد القادر دہلویؒ مسجد اکبر آبادی (ایڈورڈ پارک، موجودہ نیتا جی سبھاش چندر بوس پارک میں واقع تھی) میں معتکف ہو گئے تھے۔ جہاں سے آپ بالکل باہر نہیں نکلتے تھے۔ آپ ہمہ وقت درس و تدریس، تصنیف و تالیف اور کلام کے ترجمہ اور تفسیر لکھنے میں منہمک اور مشغول رہتے تھے اور یہ بھی آپ کی کرامت ہی کہی جاسکتی ہے کہ ادھر

ترجمہ کلام پاک اور تفسیری فوائد مکمل ہوئے ادھر پیغام اجل آپہونچا۔ یہ آفتاب علم وعمل جو ۶۳ سال تک پورے عالم کو علوم نبوت سے منور کرتا رہا وہ آخرکار ۱۲۳۰ھ میں دار فانی سے دار جاویداں کی طرف سفر کیا۔

لوگوں کا بیان ہے کہ آپ کو مسجد سے باہر اسی وقت دیکھا گیا جب کہ آپ کا جنازہ آخری سفر کے لئے قبرستان مہندیان میں لایا گیا۔ جہاں آپ آج اپنے والد بزرگوار اور بھائیوں کے پہلو بہ پہلو آرام فرما ہیں۔

رحمۃ اللہ رحمۃ واسعۃ الیٰ یوم القرار

لوح مزار ملاحظہ ہو

مرقد

حضرت مولانا شاہ عبدالقادر محدث دہلویؒ ابن حجۃ الاسلام حضرت مولانا امام شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ

سن پیدائش ۱۱۶۷ھ

سن وفات ۱۲۳۰ھ بزمانۂ اکبر شاہ ثانی بعمر ۶۳ سال رحلت نمود

شاہ عبدالغنی محدث

حضرت شاہ عبدالغنی محدث دہلوی، حضرت شاہ ولی اللہ کے چوتھے فرزند ارجمند تھے۔ آپ معروف روایات کے مطابق ۱۱۷۱ھ ۵۸-۱۷۵۷ء میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ حضرت شاہ ولی اللہ کی وفات کے وقت پانچ سال کی عمر تھی۔ شاہ عبدالغنیؒ نے اگرچہ درسیات کی تمام کتابیں اپنے بھائیوں سے پڑھیں تھیں مگر حدیث مسلسل بالاولیہ کی اجازت اور سند خود حضرت شاہ ولی اللہ صاحب سے حاصل کی تھی۔

شاہ ولی اللہ کے اجداد گرامی ص۱۳۰

زہد و ورع

حضرت شاہ عبدالغنی محدث دہلوی ذہانت، فطانت اور زہد و ورع اور صبر و قناعت میں بے نظیر تھے۔ اتباع سنت میں آپ کا قدم بہت آگے بڑھا ہوا تھا۔ وضع، قطع اور لباس، پوشاک میں اپنے والد بزرگوار حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے بے حد مشابہ تھے۔ آپ میں بہت سے اخلاق ایسے تھے جو کہ دوسروں میں بہت کم پائے جاتے ہیں۔

علم وکمال

شاہ عبدالغنی صاحب علم وفضل میں فخر روزگار ہونے کے ساتھ ساتھ باطنی فیض میں بھی شہرت عام رکھتے تھے۔ آپ اکثر اوقات درس وتدریس دعوت وارشاد اور طلبہ کی تربیت میں مصروف رہتے تھے۔

مفتی الٰہی بخش کاندھلویؒ کا شرف تلمذ و اجازتِ حدیث

حضرت مفتی الٰہی بخش نے جو ہندوستان کے جلیل القدر عالم دین اور فقیہہ تھے۔ شاہ رفیع الدینؒ اور شاہ عبدالقادر کے رفیق وہم درس تھے۔ انھوں نے حضرت شاہ عبدالغنی سے بھی مسلسل بالا ولیہ کی اجازت حاصل کی تھی جیساکہ مفتی صاحب کی بیاض میں یادداشت تحریر ہے۔

"حدیث مسلسل بالا ولیہ: وھو اول ماسمعتہ من الحدیث حدثنا الشیخ عبدالغنی رحمۃ اللہ عن ابیہ الشاہ ولی اللہ المحدث وھو اوّل ماسمعت منہ وھو یروی (عن) السید عمر بن الشیخ عبداللہ البصری المکی"

حضرت شاہ ولی اللہ کے اجداد گرامی اور اخلاف کرام ص ۱۳۰

ازدواج ونکاح

شاہ عبدالغنی صاحب محدث دہلوی کا نکاح، مولوی علاء الدین پھلتیؒ کی صاحبزادی بی بی فضیلت سے ہوا تھا، جن سے دو صاحبزادیاں رقیہ اور ام کلثوم اور ایک بلند اقبال وفخر زمانہ فرزند حضرت شاہ محمد اسماعیل شہیدؒ تھے۔

شیخ محمد اکرام لکھتے ہیں کہ :-

"شاہ ولی اللہ کے چوتھے بیٹے شاہ عبدالغنی تھے۔ ان کے حالات بہت کم ملتے ہیں لیکن اگر وہ باقی بھائیوں کی طرح مشہور نہیں ہوئے تو ان کی کمی ان کے صاحبزادے شاہ محمد اسماعیلؒ نے پوری کر دی جنھوں نے شاہ عبدالعزیز سے شاہ ولی اللہ کا علم وفضل سیکھ کر جمہور میں عام کیا اور ہندوستانی مسلمانوں کی مذہبی تاریخ میں ایک نئے دور کا آغاز کر دیا۔"

رود کوثر ص۵۹۷

شاہ عبدالغنی محدث دہلویؒ، شاہ عبدالعزیز، شاہ رفیع الدین اور شاہ عبدالقادرؒ ہی کی طرح محدث، مفسر، فقیہہ، معلم اور روحانی شیخ تھے۔ لیکن افسوس آپ کی عمر نے زیادہ وفا نہیں کی اور آپ ۱۶ر رجب ۱۲۰۳ ھ ـ ۱۲ ر اپریل ۱۷۸۹ء کو ۲۸ برس کی عمر میں اس جہاں فانی سے رخصت ہو گئے۔ حضرت شاہ ولی اللہ کے قریب ہی آسودہ راحت ہیں۔

صاحبزادوں کی وفات میں عجیب ترتیب

یہ عجیب بات ہے کہ ان چاروں بھائیوں کی وفات عجیب ترتیب سے ہوئی ہے۔ جس کے بارے میں شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی خود فرماتے ہیں کہ :

ترتیب معکوس در رحلت	الٹی ترتیب بھائیوں کی وفات
برادران واقع شد یعنی اول	میں واقع ہوئی اول مولوی
مولوی عبدالغنی کہ خورد ترین	عبدالغنی کہ سب سے چھوٹے
ہمہ بودند بعد ازاں مولوی	تھے اس کے بعد مولوی عبدالقادر

عبدالقادر از اوشاں بعد مولوی
رفیع الدین کلاں سال از اوشاں
اکنوں باری ماست۔"

اور ان کے بعد مولوی رفیع الدین
سب سے بڑا میں ہوں۔ اب
میری باری ہے۔"
تذکرہ حضرت شاہ ولی اللہ ص ۲۸۳

تربت پر یہ کتبہ لگا ہوا ہے۔

مرقد

حضرت مولانا شاہ عبدالغنی محدث دہلویؒ ابن حجۃ الاسلام حضرت مولانا امام
شاہ ولی اللہ محدث دہلوی

وفات ۱۲۲۷ھ (بزمانہ اکبر شاہ ثانی) بعمر ۵۷ سال رحلت یافت

مومن خان مومنؔ

حکیم مومن خاں مومن کی پیدائش ۱۲۱۵ھ - ۱۸۰۰ء میں محلہ کوچہ چیلان میں ہوئی۔ والد کا نام حکیم غلام نبی خان اور دادا کا نام حکیم نامدار خاں تھا۔

حکیم نامدار خاں اور حکیم کامدار خاں دو بھائی شاہ عالم کے دور اقتدار میں کشمیر سے دلی میں تشریف لائے اور اپنی مہارت و حذاقت کی وجہ سے قبولیت عامہ حاصل کر لی۔ یہاں تک کہ شاہ عالم نے اپنے خاص شاہی طبیبوں میں شامل کر لیا۔ حکیم مومن خاں مومنؔ کے والد حکیم غلام نبی خاں کو سراج الہند حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ سے بے پناہ عقیدت و ارادت تھی مومن خان جب پیدا ہوئے تو حکیم غلام نبی خاں نے شاہ صاحب کو تکلیف دی کہ نومولود کے کان میں آذان دیں اور نام تجویز کریں۔ گھر والے اگرچہ حبیب اللہ تجویز کر چکے تھے۔ مگر شاہ صاحب نے محمد مومن پسند کیا تو سب نے اپنے پسندیدہ نام کو ترک کر کے محمد مومن ہی نام رکھا۔ اور پھر آپ مومن خان ہی سے مشہور ہوئے

تعلیم و تربیت

حکیم مومن خاں مومن کی ابتدائی تعلیم رواج زمانہ کے مطابق گھر میں ہی ہوئی مگر جب مکتب کی تعلیم مکمل ہو چکی اور آپ نے اعلیٰ تعلیم کی جانب قدم بڑھایا تو امام المفسرین حضرت شاہ عبدالقادر دہلوی کی خدمت میں بھیجد یئے گئے اور باضابطہ طور پر حضرت شاہ صاحب کے حلقہ درس میں شامل ہو گئے اور ان سے علوم قرآن و حدیث کی تحصیل شروع کر دی۔ ......

حضرت شاہ عبدالقادر کی جوہر شناس نگاہ نے تاڑ لیا کہ یہ بچہ بے انتہا صلاحیتوں کا مالک ہے۔ لہذا شاہ صاحب نے مومن خان پر خصوصی توجہات مبذول فرمائیں اور آپ کی توجہات ہی کا اثر تھا کہ مومن خاں در نایاب اور جوہر آبدار بن کر چمکے۔

دوسری جانب بچپن ہی سے وہ اکثر سراج الہند حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کی مجالس وعظ میں حاضر ہوتے تھے اور حافظہ اس غضب کا پایا تھا کہ گھر آکر مواعظ لفظ بہ لفظ سنا دیتے تھے! اس طرح شاہ عبدالعزیز کے فیضان صحبت نے آپ کی صلاحیتوں کو اور زیادہ نکھار دیا۔ اسی کی طرف پروفیسر ظہیر احمد صدیقی نے اپنے مضمون میں اشارہ فرمایا ہے۔

آپ تحریر فرماتے ہیں کہ :-

”مومن کے کان میں سب سے پہلے جو آواز پڑی تھی وہ ایک مذہبی اعلان تھا۔ اور جس شخص کی آواز تھی اس کے تقدس کی قسم ملائکہ بھی کھا سکتے ہیں مگر اس مذہبی کردار کی تشکیل کا آغاز حضرت شاہ عبدالعزیز کی مجلس وعظ اور حضرت شاہ عبدالقادر کے مدرسہ سے ہوتا ہے“

بہر حال جب آپ نے علوم نقلیہ و عقلیہ میں مہارت تامہ حاصل کر لی تو آپ اپنے آبائی علم و فن کی طرف متوجہ ہوئے اور اس بارے میں آپ کو تائید غیبی حاصل تھی کیونکہ یہ فن تو آپ کا خاندانی تھا۔ اس لئے آپکو تحصیل طب کی خاطر کہیں باہر نہیں جانا پڑا اور آپ نے اپنے والد حکیم غلام نبی خان چچا حکیم غلام حیدر خاں اور حکیم حسن خاں سے طب کی جملہ کتابیں پڑھیں اور علم طب میں بھی بہت جلد کمال حاصل کر لیا اور اپنے آبائی مطب میں نسخہ نویسی شروع فرمادی اور تھوڑے ہی عرصہ میں حکیم مومن خاں مومن کا شمار حاذق اطباء اور بڑے پایہ کے حکماء میں ہونے لگا۔ اور آپ کا فنی کمال مشہور عام ہو گیا اور بڑے بڑے تذکرہ نگار آپ کا تذکرہ باعث فخر محسوس کرنے لگے چنانچہ "تذکرہ طور کلیم" میں مذکور ہے کہ :

"حکیم مومن خاں مومن فرزند حکیم غلام نبی خاں دہلوی در طب یدطولی داشت"

بعض تذکرہ نویسوں نے آپ کو "مسیحا نفس" اور "معجز بیان حکیم" کے معزز القاب و خطابات سے یاد کیا ہے۔

علم نجوم

ان تمام علوم کے ساتھ آپ علم نجوم میں کافی دستگاہ رکھتے تھے اور آپ کا شمار ہندوستان کے ممتاز ماہرین نجوم میں ہوتا تھا اور اس کی وجہ یہ تھی کہ آپ کو علم نجوم سے طبعی لگاؤ تھا اور آپ فن نجوم پر اس قدر حاوی ہو گئے تھے کہ آپ کے فنی کمال سے بڑے بڑے اہل فن حیران و ششدر رہ جاتے تھے۔

مولانا محمد حسین آزاد نے "آب حیات" میں لکھا ہے کہ :-

" (مومن خاں نے) اس کو (نجوم کو) اہل کمال سے حاصل کیا اور مہارت تامہ بہم پہنچائی۔ ان کو نجوم سے قدرتی مناسبت تھی۔ ایسا ملکہ بہم پہنچایا تھا کہ انکے انکشافات سے بڑے بڑے منجم حیران رہ جاتے تھے۔

سال بھر میں ایک بار تقویم دیکھتے تھے پھر برس دن تک ستاروں کے مقام اور ان کی حرکات کی کیفیت ذہن میں رہتی تھی جب کوئی سوال پیش کرتا تو نہ زائچہ کھینچتے نہ تقویم دیکھتے"
علم نجوم میں غیر معمولی عبور و کمال کے ان گنت واقعات آپکی طرف منسوب ہیں یہاں صرف دو واقعے کا ذکر کیا جاتا ہے۔
" بیان کیا جاتا ہے کہ ابتدائی دور میں مومن خان مومن ایک حکیم سکھانند راقم کے ساتھ شطرنج کھیل رہے تھے، کھیل کے درمیان کہنے لگے کہ سامنے کی دیوار پر چھپکلی ہے اس کا جوڑا جب پورب سے آئے گا اس وقت میں آپ کو مات دیدونگا۔ تھوڑی دیر میں ایک کپڑا بیچنے والا آیا اور اپنا کپڑا دکھانے لگا۔ اس گھڑی میں سے ایک چھپکلی نکلی اور دیوار پر پہنچ گئی۔ دریافت کرنے پر بزاز نے بتایا کہ وہ پورب سے آئی ہے۔
اسی طرح بیان کیا جاتا ہے کہ ایک برہمن نے مومن خاں سے فریاد کی کہ اسکے گھر سے زیورات چوری ہو گئے ہیں اپنے نجوم سے چور کی شناخت میں مدد کریں۔
" مومن خان نے بتایا کہ وہ چوری نہیں گئے ہیں بلکہ اس کے گھر میں کہیں موجود ہیں۔ چنانچہ اسی کے ساتھ گھر کا نقشہ اور کمرہ کا جائے وقوع بتایا جس کی پہچان پر زیور رکھا تھا"

مومن اور ان کا عہد ص ۱۹

حکیم مومن خان مومنؔ کو رمل، جفر، ریاضی اور موسیقی میں بھی بڑی مہارت اور قدرت حاصل تھی۔ حکیم مومن خاں مومنؔ ان تمام غیر مذہبی امور میں مہارت کے باوجود بڑے پختہ عقیدہ کے مسلمان تھے۔ چنانچہ پروفیسر ظہیر احمد صدیقی لکھتے ہیں کہ :

" یہاں یہ بات دلچسپی سے خالی نہ ہوگی کہ مومن خاں کو علم نجوم میں غیر معمولی درک حاصل تھا۔ مگر علم نجوم پر اعتقاد نہیں تھا اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں۔ افسوس کہ مومنؔ لاتتحرک ذرۃ الا باذن اللہ کے اعتقاد کے باوجود ستارہ پرست ہے اور دنیا سے اتنی بے تعلقی کے باوجود صبح سے شام تک اصطرلاب کا علاقہ ہاتھ میں لئے رہتا ہے "

حکیم مومن خاں مومنؔ کی مشہور غزل کا ایک شعر ہے جس کو ایک دفعہ حضرت الاستاذ مولانا سید انظر شاہ کشمیری نے سنایا تھا اور مومنؔ کے اس شاندار شعر کو بڑی داد دی تھی۔ اس شعر سے بھی آپ کی اس وابستگی کا اندازہ کیا جا سکتا ہے جو آپ کو علم نجوم کے ساتھ تھی شعر ملاحظہ فرمائیں ؎

ان نصیبوں پر کیا اختر شناس
آسمان بھی ہے ستم ایجاد کیا

اخلاق و کردار

حکیم مومن خان مومن بڑے غیور و خوددار تھے، آپ کے اندر اخلاق و شرافت، علوئے نفس بدرجہ اتم موجود تھا۔ طبیعت میں استغنار و خودداری کی شان نمایاں تھی، چنانچہ انھوں نے کبھی کسی امیر یا رئیس کی تعریف نہیں کی۔ بعض تذکرہ نویسوں نے یہاں تک لکھا ہے کہ امراء و

رؤسا تو در کنار اساتذہ سلف کی تعریف کرنا اور سننا بھی پسند نہیں کرتے تھے ۔

حکیم مومن خاں نے اپنی پوری زندگی میں صرف دو قصیدے کہے ہیں ایک قصیدہ نواب لوٹ تک سے معذرت اور دوسرا قصیدہ شکریہ راجا جیت سنگھ سے متعلق ہے وہ بھی کسی صلہ کی توقع میں نہیں ....

ایک مرتبہ راجہ کپور تھلہ نے انھیں ساڑھے تین سو روپئے مشاہرہ مقرر کر کے اور ایک ہزار روپیہ سفر خرچ بھیجا تو انھوں نے محض اس وجہ سے انکار کر دیا کہ وہاں ایک گویئے کی بھی یہی تنخواہ ہے ۔

شعر و شاعری

رئیس المتغزلین حکیم مومن خاں مومنؔ اردو کے ان چند باکمال شاعروں میں شمار کیے جاتے ہیں جن کی بدولت اردو شاعری کو عزت و شہرت نصیب ہوئی اور حکیم محمد مومن خاں مومنؔ نے اس صنف کو ایسا عروج بخشا اور اپنے استاذانہ جوہر دکھائے کہ کوئی بھی ان کی ہمسری نہ کر سکا۔ غزل، مومن خاں مومنؔ کا سرمایہ زندگی ہے جس نے ان کو شعراء اردو کی صف اول میں جگہ دی اور ایک امتیازی شان بخشی ۔ ؎

نمونہ کلام

وہ جو ہم میں تم میں قرار تھا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
وہی یعنی وعدہ نباہ کا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
وہ جو لطف مجھ پہ تھے بیشتر وہ کرم کہ تھا مرے حال پر
مجھے سب ہے یاد ذرا ذرا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

وہ نئے گلے وہ شکایتیں، وہ مزے مزے کی حکایتیں
وہ ہر ایک بات پر روٹھنا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
ہوئے اتفاق سے گر بہم تو وفا جتانے کو دم بدم
گلۂ ملامت اقربا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
کوئی بات ایسی اگر ہوئی کہ تمہارے جی کو بری لگی
تو بیاں سے پہلے ہی بھولنا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
کبھی ہم میں تم میں بھی چاہ تھی کبھی ہم سے تم سے بھی راہ تھی
کبھی ہم بھی تم بھی تھے آشنا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
سنو ذکر ہے کئی سال کا کہ کیا اِک آپ نے وعدہ تھا
سو نباہنے کا تو ذکر کیا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
جسے آپ گنتے تھے آشنا جسے آپ کہتے تھے باوفا
میں وہی ہوں مومنؔ مبتلا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

مذہب

حکیم مومن خان مومن اپنے عقائد میں بہت ہی پختہ انسان تھے۔ صوم وصلوٰۃ کے بڑے پابند تھے۔ خاندان ولی اللہی سے قلبی و روحانی لگاؤ نے آپ کو مومن کامل اور مسیحا بنادیا تھا۔ البتہ عہد جوانی میں آزاد اور لا ابالی ضرور رہے تھے۔ مومنؔ کہتے ہیں کہ: ؎

لو اے بتو! سنو کہ وہ مومنؔ خدا پرست
مسجد میں آج جا کے مسلمان ہو گیا

مومن خاں مومنؔ مرحوم دوسرے شعر میں کہتے ہیں ؎

اللہ رے گمرہی بت و بت خانہ چھوڑ کر
مومنؔ چلا ہے کعبہ کو ایک پارسا کے ساتھ

حکیم مومن خان مومنؔ ابتداء ہی سے بزرگوں کی صحبت میں رہے تھے اور ان صلحاء کی صحبت نے آپ پر گہرا اثر ڈالا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ مومن خاں مومنؔ اپنی عہد جوانی کی معمولی آزاد خیالی اور لہو ولعب میں انہماک پر تا زندگی پشیماں اور نادم رہے جس کا اظہار مومن خاں مومنؔ بڑے کرب اور اضطراب کے ساتھ اس شعر میں فرماتے ہیں۔ ؎

عمر ساری تو کٹی عشق بتاں میں مومنؔ
آخری وقت میں کیا خاک مسلماں ہوں گے

مجاہد آزادی

حکیم مومن خاں مومنؔ ولی اللہی تحریک حریت کے ممتاز مجاہد اور رہنما تھے۔ آپ کا خانوادہ ولی اللہی سے گہرا تعلق تھا۔ آپ نہ صرف امام المفسرین شاہ عبدالقادرؒ کے تلمیذ رشید اور سراج الہند حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ کے صحبت یافتہ تھے۔ بلکہ وہ ہندوستان کے جلیل القدر مجاہد اور روحانی قائد حضرت مولانا سید احمد شہید کے مرید خاص اور مولانا اسماعیل شہیدؒ کے ہم سبق بھی تھے۔

حکیم مومن خاں مومنؔ پر ولی اللہی تحریک کا گہرا اثر تھا۔ وہ اس تحریک کی نصرت و حمایت میں ہمیشہ کوشاں رہا کرتے تھے۔ ہندوستان رفتہ رفتہ انگریزوں کے قبضہ میں جارہا تھا۔ یہ دیکھ کر مومنؔ کا حساس وخوددار دل دُکھتا تھا۔ دہلی میں کوئی ایسا نہ تھا جس سے وہ اپنا دردِ دل کہتے۔ سارا غبار شعر کہہ کر نکالتے۔ ؎

مومنؔ حسد سے کرتے ہیں ساماں جہاد کا
ترسا صنم کو دیکھ کر نصرانیوں میں ہم

ایک موقع پر کہتے ہیں۔

شوق بزم احمدؒ ذوق شہادت ہے مجھے
جلد مومنؔ لے پہنچ اس "مہدی دوراں" تلک

مومن خاں مومنؔ اگرچہ عملی حیثیت سے تحریک جہاد میں شرکت نہ کر سکے لیکن دلی جذبات کی ترجمانی زبان برابر کرتی رہی۔ چنانچہ ملاحظہ فرمائیں۔ آپ کہتے ہیں۔ ؎

تو اپنی عنایت سے توفیق دے
عروج شہدار اور صدیق دے
یہ دعوت ہو مقبول درگاہ میں
مری جان فدا ہو تیری راہ میں

شاہ اسماعیل شہیدؒ اور مولانا سید احمد شہید کی صحبتیں ایسی نہ تھیں جو صدا بصحرا ثابت ہوتیں لہٰذا ان کا اثر ہوا اور پورے شد و مد کے ساتھ ہوا جیسا کہ ان کے اشعار سے ظاہر ہوتا رہا ہے۔

شادی و اولاد

حکیم مومن خاں مومنؔ کی پہلی شادی ۱۸۲۳ء میں ایک زمیندار خاندان میں ہوئی تھی اور دوسری شادی خواجہ میر دردؔ کے خاندان میں ہوئی، مومن کے خسر خواجہ محمد نصیر تھے۔ مومن خاں مومنؔ کی اہلیہ کا نام انجمن النساء بیگم تھا۔ مومن کی اولاد میں صرف ایک لڑکا احمد نصیر خاں اور ایک لڑکی محمدی بیگم بقید حیات رہے اور ان سے ہی خاندان کا سلسلہ چلا۔ ......

وفات و دفن

حکیم مومن خان مومن ۱۲۶۸ھ - ۱۸۵۱ء ایک دن اپنی چھت کی مرمت کرا رہے تھے کہ اچانک پاؤں پھسلا اور نیچے گر پڑے "دست و بازو" میں شدید چوٹ آئی صدمہ سے بے ہوش ہو گئے جب ہوش آیا تو کہنے لگے کہ میرا علم کہتا ہے کہ پانچ ماہ یا پانچ دن میں مر جاؤں گا چنانچہ ایسا ہی ہوا پانچ ماہ کے بعد انتقال ہو گیا۔ اور "دست و بازو بشکست" سے تاریخ وفات نکال دی۔

مومن فتاد از بام گفتم چہ رفت گفتا
خود باخروش گفتم بشکست دست و بازو
گفتم کہ بایدت گفت تاریخ ایں مصیبت
گفتا خموش گفتہ بشکست دست و بازو

مومن خاں مومن کے انتقال کے بعد مرزا غالب نبی بخش حقیر کو ایک خط میں مومن سے اپنے گھر سے قدیم روابط و مراسم کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

"سنا ہو گا تم نے کہ مومن خان مومن مر گئے۔ آج ان کو مرے ہوئے دسواں دن ہے۔ دیکھو بھائی ہمارے بچے مرے جاتے ہیں۔ ہمارے ہم عصر مرے جاتے ہیں، قافلہ چلا جاتا ہے۔ اور ہم پا بہ رکاب بیٹھے ہیں۔ مومن خاں میرا ہم عصر تھا اور یار بھی تھا۔ بیالیس، تینتالیس برس ہوئے یعنی چودہ چودہ، پندرہ پندرہ برس کی میری اور مرحوم کی عمر تھی کہ مجھ میں اور ان میں ربط پیدا ہوا، اس عرصہ میں کبھی بھی کسی طرح کا رنج و ملال درمیان میں نہیں آیا۔

حضرت چالیس چالیس برس کا دشمن بھی پیدا نہیں ہوتا۔ دوست تو کہاں ہاتھ آتا ہے۔"

غالب نے جب مومن خاں کا یہ شعر سنا۔ ؎

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

تو پھڑک اٹھے۔ اور اس شعر کے بدلے میں اپنا پورا دیوان دینے کیلئے تیار ہو گئے۔ مومن خاں کو ان کی وصیت کے مطابق مہندیان میں دفن کیا گیا۔ مومن خاں کی قبر خاندان ولی اللہی کے مزارات کے تقریباً ایک میٹر کے فاصلے پر مغربی سمت میں واقع ہے۔ مدرسہ کی مسجد سے بالکل متصل ہے۔

تصنیفات

مومن خاں مومن کی یادگار "اردو کلیات" کے علاوہ ایک "انشائے فارسی" اور "دیوان فارسی" بھی ہے، جنھیں حکیم احسن خاں نے مرتب کیا تھا، مومن کا اردو کلیات نواب مصطفٰے خاں شیفتہ نے مرتب کیا۔

مشہور ادیب نیاز فتحپوری نے دیوان مومن خاں مومن کے متعلق لکھا ہے کہ:

> "اگر میرے سامنے اردو کے تمام شعرا متقدمین و متاخرین کا کلام رکھ کر (با استثنائے میر) مجھ کو صرف ایک دیوان حاصل کرنے کی اجازت دی جائے تو میں بلا تامل کہہ دوں گا کہ 'مجھے کلیات مومن دیدو اور باقی سب اٹھا لے جاؤ'"

مطالعۂ مومن ص ۲۱

مولانا مملوک علی نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ

ولادت اور تعلیم و تکمیل

استاذ الکل حضرت مولانا مملوک علی نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ غیر منقسم ہندوستان کے کبار علماء و مشائخ میں ممتاز و منفرد حیثیت کے مالک تھے۔

آپ ضلع سہارنپور کے مشہور مردم خیز قصبہ "نانوتہ" میں پیدا ہوئے آپ نے مکتبی تعلیم اپنے وطن نانوتہ میں حاصل کی اور جب کچھ ہوش سنبھالا تو تحصیل علم کے جذبہ نے آپ کو دارالسلطنت دہلی پہنچا دیا۔ حسن اتفاق سے یہاں آپ کو سراج الہند حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کے تلمیذ رشید مولانا رشید الدین دہلوی سے شرف نیاز حاصل ہوا۔

مولانا رشید الدین دہلوی رحمۃ اللہ علیہ ایک نہایت جید الاستعداد اور کامل الفن عالم دین تھے۔ مولانا مملوک علی نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نے تمام درسی کتابیں مولانا رشید الدین دہلوی سے پڑھیں۔ مولانا مملوک علی نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ پر ان کے استاذ محترم مولانا رشید الدین دہلوی کا گہرا رنگ تھا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ موصوف رشید الفکر والذہن ہو کر رہ گئے تھے۔ مولانا مملوک علی نانوتوی کو صرف استاذ محترم کی ذات گرامی ہی سے عقیدت و محبت نہیں تھی بلکہ

استاذ محترم کی اجڑی دلی سے بھی محبت ہوگئی جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ آپ دہلی ہی کے ہو کر رہ گئے۔

ذہانت وذکاوت

استاذ الکل مولانا مملوک علی نانوتوی خلقتاً کوئی زیادہ ذہین نہیں تھے اور نہ آپ کو ابتداءً درسی کتابوں سے کوئی خاص مناسبت ہی تھی۔ حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کی کرامت کہیئے کہ آپ کو درسی کتابوں سے مناسبت پیدا ہوگئی۔ ورنہ تو آپ بالکل مایوس ہو چکے تھے۔ اور اس کا ظہور اس طرح ہوا کہ:

"مولانا مملوک علی نانوتویؒ جب تحصیل علم کے لئے دہلی تشریف لے گئے تو یہ صورت پیش آئی کہ جس استاذ سے پڑھنا شروع کرتے وہ انکی علوم سے قلت مناسبت محسوس کر کے ایک سبق کے بعد دوسرا سبق نہ پڑھاتے تھے۔ اس صورت حال سے مولانا سخت ملول اور غمگین تھے۔ ایک روز اسی پریشانی میں حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ:

تحصیل علم کے شوق میں وطن چھوڑ کر آیا ہوں اور کیفیت یہ ہے کہ جس استاذ سے پڑھنا شروع کرتا ہوں وہ ایک سبق کے بعد پڑھانے کا نام نہیں لیتا۔

شاہ صاحب نے فرمایا کہ

اچھا کل آنا۔

مولانا اگلے روز حاضر ہوتے۔ شاہ صاحب نے ہدایۃ النحو کا ایک سبق پڑھا دیا اور فرمایا کہ:-

جاؤ اب جس استاذ سے پڑھو گے وہ انکار نہیں کریگا۔ چنانچہ پھر ایسی مناسبت ہوئی اور ایسے چلے کہ بڑے بڑے علما ان کے شاگرد ہوئے۔"

ارواح ثلاثہ بحوالہ روایات الطیب حکایت ص ۱۸۵

غرض یہ کہ حضرت شاہ صاحب کے سبق پڑھانے کے بعد یہ کیفیت ہو گئی کہ جیسے بند کھول دیا گیا ہو اور آپ نے اتنی ترقی کی کہ آپ کو عربک کالج میں نہ صرف استاذ بلکہ پرنسپل مقرر کر دیا گیا۔ اور آپ نے اپنی علمی مہارت اور تنظیمی صلاحیت سے اس کالج کو بام عروج پر پہونچایا۔ اور حقیقت یہ ہے کہ عربک کالج کی جو عالمی شہرت ہوئی ہے وہ دراصل آپ ہی جیسے مخلص اساتذہ کی رہین منت ہے۔ مگر افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ عربک کالج دہلی کی نئی نسل مولانا مملوک علی نانوتوی جیسے مخلص معماروں کو بالکل بھول گئی ہے۔ اور نہیں جانتی کہ مولانا مملوک علی نانوتوی کون تھے اور ان سے ہمارا علمی رشتہ کیا ہے۔ ڈاکٹر صلاح الدین صاحب استاد عربک کالج دہلی جیسے ایماندار اور اکابر شناس اہل قلم پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ ان قدیم معماروں اور روایتوں کو اس نئی نسل سے متعارف کرائیں تاکہ نئی نسل اپنے بزرگوں سے آشنا ہو سکے۔

بے لوث خدمت

مولانا مملوک علی نانوتوی نے عربک کالج کی بڑی مخلصانہ خدمت کی ہے۔ آپ کی تنخواہ بھی آپ کے علم و فضل کے اعتبار سے کوئی حیثیت نہیں رکھتی تھی۔ آپ قناعت پسندی میں اپنے بزرگوں کی روایت پر قائم تھے مولوی کریم الدین اپنی کتاب طبقات الشعراء ہند میں لکھتے ہیں کہ:-

"مدرس اول مدرسہ دہلی عالم بے بدل اور متقی بے مثل اور فاضل کامل ہیں۔ عہدہ میر مولوی، بمشاہرہ سو روپیہ ماہواری مدرسہ میں مقرر ہیں حق یہ ہے کہ اس فاضل کی جیسی قدر چاہیئے ویسی نہیں کیونکہ ایسے عمدہ فاضل بے بدل بہت کم ہوتے ہیں اور واقع میں بنائے مدرسہ عربی ان کی ذات سے مستحکم ہے۔"

طبقات الشعراء ہند ص ۱۴۸

مولانا مملوک علی نانوتوی درس و تدریس کے مرد میدان تھے، آپ کے افہام و تفہیم کا انداز بڑا دلچسپ تھا۔ آپ ہر فن میں کتاب کے بجائے اصل فن پڑھاتے اور طالب علم کو فن پر حاوی کرنے کی سعی فرماتے۔ اس طرح طلبہ کے اندر فنی کمال پیدا کر دیتے تھے۔ اسی لئے آپ کی ذات گرامی مرجع طلبہ بن گئی تھی اور ملک کے گوشے گوشے سے طلبہ آپ کی خدمت میں پہونچکر علمی استفادہ کرنے میں فخر محسوس کرتے تھے۔

کالج کے علاوہ فارغ اوقات میں بھی آپ کے گھر پر طلبہ کا ہجوم رہتا تھا۔ لہذا تھوڑے ہی عرصہ میں مولانا مرحوم کے اس تدریسی ذوق و مذاق کی بدولت دیگر معاصر علماء و اساتذہ کی مجالس درس ماند ہوگئیں اور آپ کے گرد تشنگان علوم کا جم غفیر جمع رہنے لگا۔ جیسا کہ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی کا ارشاد گرامی ہے کہ:

"ابتداءً ہم دہلی میں دوسرے اساتذہ سے پڑھتے تھے لیکن تسکین نہیں ہوتی تھی۔ کبھی سبق تھوڑا ہوتا تھا اور کبھی شبہات کا جواب نہ ملتا تھا۔ مگر جب مولانا مملوک علی نانوتوی کی خدمت میں پہنچے تو اطمینان ہوگیا اور بہت تھوڑے عرصے میں کتابیں ختم کرلیں۔ گویا استاد نے گھول کر پلا دیا۔ اس زمانے میں اچھے

اچھے استاذ دہلی میں موجود تھے، مگر ایسے استاذ کہ مطلب پوری طرح ان کے قابو میں ہو اور انواع مختلفہ سے تقریر کر کے شاگرد کے ذہن نشین کر دیں۔ ایک ہمارے استاذ مولانا مملوک علی اور دوسرے ہمارے استاذ مفتی صدر الدین تھے۔ رحمۃ اللہ علیہما"

بحوالہ تذکرۃ الرشید ص۱۸

حضرت مولانا مملوک علی نانوتوی کو یہ امتیازی شان حاصل ہے کہ آپ کے عہد کے اہل علم اور صاحب دل علماء و مشائخ نے آپ کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا۔ اور آپ ہی سے درسیات کی تکمیل کی۔

مولانا سید عبدالحئ صاحب "نزہتہ الخواطر" میں لکھتے ہیں کہ:

فدرس وافاد مدۃ عمرہ	انھوں نے تمام عمر درس و تدریس
وافنیٰ قواہ فی ذالک حتی	وافادۂ علمی کی خدمت انجام دی
ظھر تقدمہ فی العلماء	اپنے قویٰ اسی میں کمزور کئے حتی کہ
اخذ عنہ خلق کثیر	علماء کے درمیان ان کا تفوق و
لایحصون بحد وعد د	برتری ظاہر ہوئی۔ ان سے ایک
نزہتہ الخواطر جلد ۷	لاتعداد مخلوق خدا نے استفادہ کیا۔

تلامذہ

مولانا مملوک علی نانوتوی کے تلامذہ کی فہرست خاصی طویل ہے۔ ان میں چند نامور تلامذہ حسب ذیل ہیں۔

حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ، بانی دارالعلوم دیوبند، سرسید احمد خاں بانی مسلم یونیورسٹی علی گڈھ، مولانا رشید احمد گنگوہی، مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی، مولانا محمد مظہر نانوتوی، مولانا احمد علی سہارنپوری، حضرت مولانا

شیخ محمد تھانوی، حضرت مولانا ذوالفقار علی دیوبندی والد ماجد حضرت شیخ الہند مولانا فضل الرحمٰن عثمانی دیوبندی، مولانا محمد منیر نانوتوی، مولانا جمال الدین مدارالمہام بھوپال، مولوی کریم الدین پانی پتی مولف تذکرۂ طبقات الشعراء، شمس العلماء ڈاکٹر ضیاء الدین ایل۔ایل۔ڈی، مولانا عالم علی مرادآبادی، مولوی سمیع اللہ دہلوی، مرزا فرحت اللہ بیگ، مولانا عبدالرحمٰن پانی پتی وغیرہ ...

ادبی ذوق

مولانا مملوک علی نانوتوی بڑا صاف ستھرا ادبی ذوق رکھتے تھے۔ اردو فارسی اور عربی تینوں زبانوں پر قادر تھے۔ تینوں زبانوں میں برجستہ لکھتے تھے۔ آپ شعر تو نہیں کہتے تھے لیکن اشعار کی پرکھ میں امتیاز رکھتے تھے۔

مشہور ادیب مرزا فرحت اللہ بیگ مرحوم لکھتے ہیں کہ:

"مولانا مملوک علیؒ خود شعر نہیں کہتے مگر سمجھتے ایسا ہیں کہ ان کا کسی شعر کی تعریف کر دینا گویا اس کو دوام کی سند دینا ہے۔"

دہلی کی آخری شمع ص ۳۶

تصنیف و تالیف

مولانا مملوک علی نانوتوی اصلاً درس و تدریس کے آدمی تھے۔ میدان تصنیف و تالیف کے شہسوار نہیں تھے آپکو تدریسی مصروفیات کی بنا پر تصنیف و تالیف کا موقع بہت کم ہی ملتا تھا۔ پھر بھی آپ کی چند اہم تصانیف ہیں۔

بابائے اردو مولوی عبدالحق مرحوم لکھتے ہیں کہ:

مولانا مملوک علی صاحب بہت ذہین، ذکی، تیز فہم اور محقق و

مدقق ہیں۔ تحریر اقلیدس کا ترجمہ اردو میں چار مقالہ اول کا اور دو مقالوں آخر گیارھویں اور بارھویں کا کیا ہے۔ حق یہ ہے کہ علم ہندسہ کو پانی کی طرح بہا دیا ہے۔ مولوی صاحب نے سنن ترمذی کا ترجمہ بھی اردو میں کیا تھا۔"

مرحوم دلی کالج ص ۱۴۹

انگریزوں سے نفرت

حضرت مولانا مملوک علی صاحب ولی اللہی فکر کے عالم دین تھے اللہ تعالیٰ نے آپ کے اندر جہاد اور راہ حق میں قربانی دینے کا جذبہ بھی عطا فرمایا تھا۔ آپ اپنے دیش میں انگریزوں کا غلبہ و تسلط دیکھ کر تڑپ جاتے تھے۔ آپ کو انگریزوں سے اس قدر نفرت تھی کہ آپ ان سے ملنا بھی پسند نہیں کرتے تھے۔

مرزا فرحت اللہ بیگ مرحوم لکھتے ہیں کہ:-

"سرکاری درسگاہ میں سالہا سال ملازم رہنے کے باوجود انگریز سے نفرت کا یہ عالم تھا کہ ایک مرتبہ ریذیڈنٹ بہادر مدرسہ کے معائنہ کو آئے اور آپ کے علم و رتبہ کے خیال سے ہاتھ ملایا جب تک صاحب بہادر رہے تو مولانا نے ہاتھ کو جسم سے اس طرح دور رکھا جیسے کوئی نجس چیز کو دور رکھتا ہے۔ صاحب کے جاتے ہی بہت احتیاط سے ہاتھ کئی بار دھویا۔ کسی نے جاکر صاحب سے یہ بات لگا دی۔ ان کو بہت غصہ آیا کہ ہم نے تو ہاتھ ملا کر ان کی عزت افزائی کی انھوں نے اس طرح ہماری توہین کی۔ غرض بڑی مشکل سے یہ معاملہ رفع دفع ہوا۔"

دہلی کی آخری شمع ص ۳۷

بزرگانِ دیوبند اور سرسید احمد خاں

سرسید احمد خاں بانی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ استاذ الکل حضرت مولانا مملوک علی نانوتویؒ کے تلمیذ رشید اور رحمۃ الاسلام فی الارض مولانا محمد قاسم نانوتویؒ بانی دارالعلوم دیوبند کے مخلص رفیق تھے۔ اس لئے سرسید احمد خان اور بزرگانِ دیوبند کے درمیان جو مخلصانہ تعلقات و روابط رہے اس کا اندازہ سرسید احمد صاحب کے ایک خط سے ہوتا ہے جو انھوں نے مولانا مملوک علی نانوتوی کے نواسے مولانا عبداللہ انصاری ناظم دینیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی درخواست ملازمت پر لکھا۔ فرماتے ہیں:-

"مولوی عبداللہ صاحب فرزند ہیں مولوی انصار علی صاحب کے نواسے ہیں مولوی مملوک علی صاحب کے داماد ہیں مولوی محمد قاسم صاحب کے اور ان کے سب بزرگوں سے مجھے ذاتی واقفیت تھی۔ اور امید ہے کہ ان بزرگوں کی صحبت سے مولوی عبداللہ صاحب کی بھی ایسی ہی طبیعت ہوگی کہ دینی کاموں کو بہ لحاظ دین اور بہ محبت اسلام انجام دینگے اور اس لحاظ سے میں ان کا مدرسے میں تشریف لانا اور رہنا باعث خیر و برکت سمجھتا ہوں۔"

موج کوثر ص ۱۹۴

اولاد

حضرت مولانا مملوک علی نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کی اولاد میں ایک صاحبزادے حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی صدر المدرسین دارالعلوم دیوبند تھے۔ جو اپنے والد ماجد کی طرح جامع العلوم والفنون تھے۔ مولانا محمد یعقوب

صاحب نانوتوی تقویٰ وطہارت اور تزکیۂ باطن میں اپنے معاصرین میں ممتاز تھے۔ مولانا مملوک علی صاحب کی دو صاحبزادیاں تھیں۔ ایک صاحبزادی حضرت مولانا انصار علی مرحوم سے منسوب تھیں۔ دوسری صاحبزادی شاہ مجید علی والد ماجد مولانا خلیل احمد سہارنپوری سے وابستہ تھیں۔ یہ دونوں صاحبزادیاں دینداری، عزت وجمعیت، صبر وشکر، زہد وتقویٰ میں اپنے والد ماجد اور بھائی کے نقش پا پر تھیں۔

انتقال پُر ملال

استاذ الکل حضرت مولانا مملوک علیؒ کا انتقال ۱۱ ذی الحجہ ۱۲۶۷ھ کو یرقان کے مہلک مرض میں ہوا۔ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے قبرستان مہندیان میں مکی مسجد کے صحن سے تقریباً ۲ میٹر کے فاصلے پر مدفون ہیں۔ آپ کی قبر کے چھ میٹر جانب شمال میں حضرت شیخ عبدالعزیز شکر بارؒ کی قبر واقع ہے۔

مولانا محمد حسین فقیرؔ دہلویؒ

تاریخ ولادت

مولانا محمد حسین فقیرؔ دہلوی کا شمار ہند و پاک کے ممتاز مشائخ چشت میں ہوتا ہے۔ وہ ۱۲۴۳ھ میں اتر پردیش کے مردم خیز ضلع مظفر نگر کے ایک قریہ "پھلت" میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد ماجد کا اسم گرامی مولوی منشی محمد اسماعیل ذبیحؔ نقشبندیؒ تھا۔ وہ سلسلۂ چشتیہ اور نقشبندیہ کے جلیل القدر بزرگ تھے۔

مولانا محمد اسماعیل ذبیحؔ کے دوسرے صاحبزادے احمد حسین مرحوم تھے جنھوں نے برطانیہ میں اعلیٰ تعلیم حاصل کی تھی اور برطانوی دورِ اقتدار میں اعلیٰ و ارفع منصب پر فائز تھے۔ لیکن مولانا محمد حسین فقیرؔ مرحوم اپنے برادرِ اکبر کے خلاف انگریزوں کے شدید مخالف اور جہادِ آزادی کے علمبرداروں میں تھے۔

شجرہ نسب

مولانا محمد حسین فقیؔر دہلوی رحمۃ اللہ علیہ اولیاء کرام اور اتقیاء عظام کے خانوادہ سے تعلق رکھتے تھے۔

آپکے فخر روزگار اسلاف یہ ہیں۔

"مولانا محمد حسین فقیؔر دہلوی بن مولوی منشی محمد اسماعیل ذبیحؔ دہلوی نقشبندی بن محمد انور شہید سامانہ بن منشی محمد احمد بن محمد حیدر بن محمد معظم بن محمد اکرم بن طاہر بن محمد باقر بن ناظر بن محمد قاسم بن محمد ہاشم محمد حیدر بن محمد حسن بن زاہد بن مہدی ابوالحسن بن ابوالطیب بن عبدالمالک بن ابوالقاسم بن عبدالرحمن بن احمد ابوالحسن بن یونس بن ابوالاعلیٰ بن موسیٰ بن فصص بن حیان المعری الیمنی رح۔"

اسطرح مولانا محمد حسین فقیر دہلوی کا سلسلہ نسب کئی پشتوں کے بعد علامہ حیان المعری الیمنی رح سے جا ملتا ہے۔ علامہ حیان المعری الیمنی رحمۃ اللہ علیہ اپنے عہد کے بالغ نظر عالم دین اور محدث کبیر تھے۔

تعلیم و تکمیل

مولانا محمد حسین فقیؔر دہلوی نے ابتدائی تعلیم اپنے والد ماجد منشی محمد اسماعیل ذبیحؔ دہلوی سے حاصل کی اور فقہ، تفسیر اور حدیث کی کتابیں مولانا مملوک علی نانوتوی رح، مولانا محمد قاسم نانوتوی رح، محدث کبیر مولانا احمد علی سہارنپوری محشی الصحیح البخاری جیسی عبقری شخصیتوں سے پڑھیں۔

موصوف نے اپنی غیر معمولی ذہانت و ذکاوت اور عبقریت کی بناپر بہت ہی جلد ان تمام مروجہ علوم و فنون میں حیرت انگیز عبور و کمال پیدا فرمالیا۔

اور آپ کا شمار دلی کے صفِ اول کے علمار و فضلار میں ہونے لگا۔

شعر وشاعری

مولانا فقیرؔ جس طرح نحو، صرف، منطق، فلسفہ، علم بلاغت، فقہ، تفسیر اور حدیث میں مہارت تامہ اور ملکہ راسخہ رکھتے تھے اسی طرح شعر وشاعری میں بھی اعلیٰ قابلیتوں اور صلاحیتوں کے حامل تھے۔

آپ اردو، فارسی، اور عربی تینوں زبانوں کے قادرالکلام شاعر تھے۔
پروفیسر زبیر قریشی مرحوم لکھتے ہیں کہ:

"فارغ التحصیل ہونے کے بعد جبکہ جوانی کا زمانہ تھا اور شیخ محمد ابراہیم ذوقؔ کا دور دورہ تھا۔ غالبؔ اور مومنؔ عروج پر تھے۔ . . . . اعلیٰ حضرت سراج الدین ابوظفر بہادر شاہ آخری تاجدار دہلی قلعہ معلّیٰ کے مشاعروں کی صدارت فرمایا کرتے تھے۔ اس وقت فتح الملک مرزا داغؔ دہلوی مرحوم اور مولانا محمد حسین فقیرؔ دہلوی مرحوم ذوقؔ کے ارشد تلامذہ میں شمار کئے جاتے تھے۔

مولانا فقیرؔ کا اس زمانہ کا کلام عاشقانہ تھا۔ خاص کر آپ کی ایک واسوخت تھی جس کا ذکر اکثر مولانا راسخؔ مرحوم فرمایا کرتے تھے۔ لیکن حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی علیہ الرحمہ کی صحبت و قربت کی وجہ سے وہ واسوخت نذر آتش کر دی گئی اور اس وقت سے اسلامی اور دینی رنگ میں کہنا شروع کر دیا۔"

دلی نمبر ص ۲۳۹ ۔ دلی کالج میگزین

مولانا فقیرؔ مرحوم کا وہ کلام بطور نمونہ پیش ہے جو آپ نے اپنے رب کے

حضور کعبہ سے لپٹ کر پیش کیا ہے اس میں جہاں غضب کا سوز و گداز ہے وہیں فن شاعری کا اعلیٰ نمونہ بھی ہے۔

شکرِ حق ہے کہ وہی دور سے لایا ہم کو
اور یہ اپنا حرمِ پاک دکھایا ہم کو
رات دن رہتی تھی جس نور کی آنکھوں کو تلاش
اب تو مولیٰ نے وہی نور دکھایا ہم کو
ہم گنہگار چلے آئے ہیں تیرے در پر
پاک کر اب تو گناہوں سے خدارا ہم کو
شکر کر شکر فقیرا پنے نصیب اچھے تھے
ڈھونڈھتے تھے جسے مدت سے وہ پایا ہم کو

اسی طرح نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے روضۂ اطہر کے سامنے کھڑے ہو کر بھی بڑے درد و سوز کے ساتھ کہتے ہیں۔

یہ کس کا درد ہے دل میں فقیرِ خستہ دل کہہ دو
جو ہر دم ہاتھ رکھ کر آپ سینہ دیکھ لیتے ہیں
فقیر اپنا نصیب اب تو سکندر سے بھی بہتر ہے
رہا محروم وہ ہم کو ملا پانی مدینے کا
میں نے جب دور سے وہ گنبدِ خضرا دیکھا
چشمِ حیراں کو جو دیکھا تو بہت تر دیکھا
کیونکر دل سیر ہو حضرت کی زیارت سے فقیر
عمر بھر دیکھا تو گویا انھیں دم بھر دیکھا

فارسی کا کلام ملاحظہ ہو۔

چنانم کن تو یا غفار مشتاقِ رسول اللہ
کہ باہم خفتہ و بیدار مشتاقِ رسول اللہ
بدانستم کہ ہستی اے فقیر دلِ حزین عاشق
کہ می خواند چنیں اشعار مشتاقِ رسول اللہ

عربی کلام ملاحظہ فرمایئے!

افتح الابواب لی یا ربنا من رحمتک
آت مطلویا لمملوک فقیر یا ملک
اھدنی ربی الی البیت و دار مرسلک
ثم ادخلنی الٰھی مصرہ من بلدتک

عربی زبان وادب

مولانا محمد حسین فقیر دہلوی کو اردو و فارسی کی طرح عربی زبان وادب پر بڑا عبور و درک حاصل تھا۔ آپ وقائع عرب اور قدما کے اچھوتے اسالیب اور عمدہ تراکیب سے خوب واقف تھے۔ موصوف نہایت ہی سادہ و شگفتہ زبان لکھتے اور بولتے تھے۔

آپ کی عربی تحریر و تقریر میں "عجمیت" بالکل نظر نہیں آتی تھی۔ آپ ۱۲۹۴ھ میں قسطنطنیہ بھی گئے تھے۔ قسطنطنیہ ہی میں آپ کو شیخ محمد ظافر الشاذلیؒ سے شرف نیاز حاصل ہوا۔ شیخ محمد ظافر الشاذلیؒ ایک صاحب دل بزرگ تھے۔ آپ مسلسل دو سال تک ان کی خدمت میں رہے اور ان کے روحانی فیوض و برکات سے مستفیض ہوتے رہے۔ دو سال کے بعد قسطنطنیہ سے ہندوستان واپس آگئے۔

آپ قسطنطنیہ کے علاوہ مصر، یمن اور ترکی بھی تشریف لے گئے تھے ان

تمام کمالات سے بڑھ کر مولانا کے اندر استغنار اعلیٰ درجہ کا تھا جس نے مولانا فقیرؔ کو عزیز الخلائق اور محبوب خلائق بنا دیا تھا۔ جیساکہ پروفیسر زبیر قریشی تحریر فرماتے ہیں کہ :

"مولانا فقیرؔ دنیا اور دنیا داروں سے بہت دور رہتے تھے آپ کی امانتداری اور دیانتداری شہرۂ آفاق تھی۔ ریاست بھوپال کی شاہجہانی بیگم ترکی روسی جنگ (جنگ کریمیا) کے وقت دو لاکھ روپے سلطان رُوم کو بھیجنا چاہتی تھیں تو انھوں نے اس ذمہ داری کے کام کے لیئے مولانا فقیرؔ کو ہی منتخب کیا ......
چنانچہ آپ نے استنبول پہنچکر وہ امانت سلطان روم کے حوالہ کردی۔ وہاں آپ سلطان کے پیر و مرشد شیخ الاسلام حضرت سلیمان آفندیؒ کے مہمان ہوئے، ایک روز شیخ الاسلام سلیمان آفندیؒ نے آپ کو بتایا کہ حضور سلطانی میں باریابی حاصل ہوگی۔ تو آپ نے موصوف کو جواب دیا کہ اے شیخ! فقیر اور بادشاہ کا کیا جوڑ؟ بادشاہ سے ملاقی ہو کر مجھے طمع دنیا ہوگی اور اس دنیا میں تیاری آخرت کے لیئے ہی ہونی چاہیئے۔ چنانچہ مولانا فقیرؔ مرحوم اسی رات استنبول سے مصر روانہ ہوگئے اور وہاں پہنچکر شیخ سلیمان آفندی کو لکھدیا کہ دو لاکھ کی رسید مجھے یہاں بھیجدیں، چنانچہ رسید مل گئی اور آپ نے واپس پہنچکر وہ رسید بیگم بھوپال کے حوالہ کردی اور دہلی واپس آگئے۔"

دلی کالج میگزین کا خصوصی شمارہ دلی نمبر ص ۲۳۷

بیعت وارشاد

مولانا محمد حسین فقیرؔ دہلوی بڑے متقی، پرہیز گار اور درویش صفت انسان تھے۔ آپ مولانا مفتی مظفر حسین کاندھلوی کے روحانی مجاز و خلیفہ تھے اور مولانا رشید احمد گنگوہی رحمتہ اللہ علیہ سے بھی آخر میں بیعت ہو گئے تھے۔ مولانا فقیرؔ پر ان بزرگوں کا گہرا اثر تھا۔ وہ زہد و ورع میں اسلاف متقدمین کی یادگار تھے۔

مجالس وعظ

مولانا محمد حسین فقیرؔ دہلوی اپنے عہد کے عظیم مصلح، ریفارمر اور ممتاز واعظ تھے۔ آپ دلی کی ٹکسالی زبان میں بہت ہی موثر وعظ فرماتے تھے۔ آپ کی مجالس وعظ میں لوگوں کا بڑا مجمع اکٹھا ہوتا تھا۔ آپ مختلف دینی موضوعات پر وعظ فرماتے تھے۔ لیکن آپ کا اصل موضوع "توحید" تھا۔ اور ان مواعظ کا مرکز مدرسہ حسین بخش تھا۔ مگر آپ طبعاً شر و فساد اور پارٹی بازی سے گریزاں رہتے تھے۔ چنانچہ ایک مرتبہ حسب معمول مدرسہ حسین بخش میں وعظ فرما رہے تھے بعض اہل ہوی نے شور و غل مچا کر زبردست ہنگامہ کھڑا کر دیا ادھر آپ کے معتقدین اور منتسبین بھی مقابلہ آرائی کے لئے تیار ہو گئے لیکن آپ نے بڑی دانشمندی سے اس ہنگامہ کو فرو کیا اور خاموشی سے اس مرکز کو تبدیل فرما کر کٹرہ گوکل شاہ میں اپنے مواعظ کا مرکز بنا لیا اور وہیں آپ اور آپ کے عالی مقام صاحبزادوں نے مسجد اور مدرسہ بھی قائم کر دیا۔ اور اس مدرسہ کا نام حسینیہ حنفیہ تجویز فرمایا جس کی تعمیر ۱۳۱۶ء میں شروع ہو کر ۱۳۲۳ھ میں تکمیل کو پہنچی آپ نے دونوں موقعوں کے لئے قطعات تاریخ کہے ہیں۔ ملاحظہ فرمادیں۔

قطعہ تاریخ ابتدائے تعمیر

این مدرسہ از شان عطائے تو خدایا
مرفوع شد این قصر ہدایت فلک الحمد
در شکر غنی قول فقیر آمدہ تاریخ
این جا شدہ محراب عبادت فلک الحمد

۱۳۱۶ھ

قطعہ تاریخ تکمیل تعمیر

آئین اہل دین حق درس و نماز و وعظ میں
یہ عبادت گاہ خاص و عام مسجد بن گئی
لکھ جناب مصطفےٰ کا سال ہجرت اے فقیر
خوب و زیبا رونق اسلام مسجد بن گئی

۱۳۲۲ھ

اس طرح مولانائے فقیر مدرسہ حسین بخش کے بجائے مدرسہ حسینیہ حنفیہ کٹڑہ گوکل شاہ میں وعظ فرمانے لگے۔ اور اسی مدرسہ میں تاحین حیات وعظ فرماتے رہے۔ آپ کے انتقال کے بعد آپ کے بلند اقبال صاحبزادوں نے اس مفید سلسلہ کو جاری رکھا۔ الحمدللہ آج اسی تاریخی مدرسہ میں مولانا آزاد اکیڈمی قائم ہے۔ مولانا آزاد اکیڈمی میں کالج اور یونیورسٹی کے طالب علموں کے لئے شبینہ تعلیم کا نظم کیا گیا ہے۔

تحریک ولی اللہی

مولانا محمد حسین فقیر دہلوی ولی اللہی تحریک و مشن کے سرگرم رکن تھے۔ آپ نے زندگی بھر حضرت امام شاہ ولی اللہ کے افکار و نظریات کو دلی کی

ٹکسالی زبان میں دلی والوں کے سامنے بیان فرمایا۔ مولانا فقیرؔ اور ان کا خاندان ولی اللہی فکر کا علمبردار رہا ہے۔

تصانیف

مولانا محمد حسین فقیرؔ دہلویؒ کو تصنیف و تالیف کا بڑا اصاف ستھرا مذاق تھا۔ آپ نے اگرچہ بہت کم لکھا ہے لیکن جو کچھ لکھا ہے اس سے آپ کا عالمانہ وقار قائم ہو جاتا ہے۔ آپ کی زیادہ تر تصانیف عربی میں ہیں۔ آپ کی چند اہم تصنیفات یہ ہیں۔

الحیار لجماعۃ النسار۔ راحۃ ارواح المومنین فی مآثر الخلفاء الراشدین ناصر دین مصطفیٰ۔

موصوف نے اپنے کلام کو بھی مختلف عنوانوں سے معنون فرما کر ان کو اور زیادہ مفید بنا دیا ہے۔ لہٰذا آپ کے کلام کے مجموعے ان ناموں سے شائع ہوئے ہیں۔

تیغ فقیرؔ۔ کلیات فقیرؔ۔ دیوان فقیرؔ۔ مناجات فقیرؔ۔ مثنوی نالۂ فقیرؔ دیوان نصیحت اور شاخ پر میوہ وغیرہ۔

وفات

مولانا محمد حسین فقیرؔ دہلوی نے ۲۷ رمضان المبارک ۱۳۲۴ھ کو بعمر اکیاسی سال داعی اجل کو لبیک کہا اور قبرستان ولی اللہی میں سپرد خاک کئے گئے۔ آپ کی قبر جامعہ رحیمیہ کی مسجد کے صحن سے تقریباً ۱۰ میٹر کے فاصلے پر بجانب پورب واقع ہے۔

مولوی عبدالاحدؒ

تاریخ پیدائش اور نشو ونما

مولوی حافظ عبدالاحد رضوی مالک مجتبائی پریس ۱۸۵۰ء میں بنارس میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد ماجد کا نام حافظ سید غلام محمد تھا۔ آپ ابھی شیر خوار ہی تھے کہ آپ کے والد محترم کا وصال ہو گیا۔ سید غلام محمدؒ کی بیوہ ایک نیک اور پاکباز خاتون تھیں وہ کسی سے عقد کرنا چاہتی تھیں لیکن برادری کے جاہلانہ اور غیر اسلامی رسم و رواج نکاح ثانی میں رکاوٹ بنے ہوئے تھے۔ حالانکہ شریعت اسلامیہ تو عموماً نکاح بیوگان کی اجازت دیتی ہے اور اس پاکبازہ خاتون کے جو حالات تھے یعنی عمر کی کمی اور بچہ کی پرورش کی ذمہ داری ان حالات میں تو شریعت اسلامی نکاح ثانی کی نہ صرف یہ کہ حوصلہ افزائی کرتی ہے بلکہ نکاح نہ کرنے کو معیوب گردانتی ہے۔ مگر مسئلہ یہ تھا کہ اس بیوہ سے جو ایک شیر خوار بچہ کی ماں بھی تھی کوئی اللہ والا ہی نکاح کے لئے تیار ہو سکتا تھا۔ ورنہ ہر کس و ناکس کا اس

مجاہدہ کے لئے تیار ہونا آسان نہ تھا۔ لہذا اس کو حسن اتفاق ہی کہا جاسکتا ہے کہ اس زمانہ میں مولانا احسن نانوتوی تلمیذ رشید مولانا مملوک علی نانوتوی بنارس ہی میں مقیم تھے اور مولانا کو اس نیک خاتون کے حالات اور مجبوری کا پتہ چلا تو مولانا احسن نانوتوی نے معصوم بچہ اور بے یار و مددگار بیوہ کی دستگیری کی نیت سے منشاء شریعت کے مطابق بیوہ سے عقد کرلیا اور شرعی طور پر نکاح کرکے اس بیوہ اور یتیم کی کفالت کا بوجھ اپنے ذمہ لیا اور ان کے کفیل و سرپرست بن گئے۔

مولانا عبدالاحد صاحب کو مولانا محمد احسن نانوتوی جیسی برگزیدہ اور متبحر عالم دین شخصیت کا سایہ نصیب ہوگیا۔

تعلیم و تکمیل

مولوی عبدالاحد صاحب ابتداء ہی سے علم کے شیدا تھے، لہذا آپ نے چودہ سال کی عمر میں قرآن مجید حفظ کرنے کے ساتھ فارسی اور عربی کی اکثر کتابیں مولانا محمد احسن نانوتوی سے پڑھ لی تھیں اور صرف انیس[19] سال کی عمر میں علوم دینیہ و دیگر علوم و فنون کی تکمیل بھی کرلی اور گورنمنٹ کالج بریلی میں داخل ہوکر ۱۸۶۹ء میں پٹنہ یونیورسٹی کا امتحان بھی پاس کرلیا اور مارچ ۱۸۷۰ء میں گورنمنٹ اسکول بدایوں میں ٹیچر مقرر ہوگئے اور اس ملازمت کے دوران وکالت کے کورس کی تیاری کرکے ۱۲ر جولائی ۱۸۷۵ء کو الہ آباد میں وکالت کا امتحان بھی دیدیا اور اول پوزیشن سے ڈپلوما حاصل کیا لیکن انھوں نے اس کو پیشہ نہیں بنایا۔ اور تعلیمی ملازمت ہی کو پسند کیا اور آخر کار ترقی کرکے ہیڈ ماسٹر بنادیئے گئے اور ایک عرصہ تک اسی حیثیت سے ایک اسکول کی خدمت کرتے رہے اس کے بعد انھوں نے قانونی پیشہ اختیار کیا۔ اور میرٹھ ضلع میں کافی کامیابی کے ساتھ

وکالت کی۔ لیکن چونکہ ان کو یہ پیشہ پسند نہیں تھا۔ اس لئے زیادہ عرصہ اس کو نہ اپنا سکے۔ اور دو سال بعد اس پیشہ کو خیر آباد کہکر تجارت کو اپنا لیا اور انھوں نے اپنی بے انتہا قابلیت اور تجارتی شعور کی بنا پر بہت جلد ایک کامیاب ترین تاجر ہو گئے۔

مجتبائی پریس سے مولانا عبدالاحد کا تعلق

مطبع مجتبائی ہندوستان کا قدیم و تاریخی مطبع تھا جس کو منشی ممتاز علیؒ نے ابتدا میرٹھ میں قائم کیا تھا۔ اسی مطبع سے ۱۸۶۹ء میں ———— مولانا محمد قاسم نانوتوی کے تعلق کا ذکر سوانح قاسمی میں ملتا ہے۔ کچھ ہی عرصہ کے بعد منشی ممتاز علی مرحوم نے اس مطبع کو میرٹھ کے بجائے دہلی منتقل فرمایا۔ اس کے بعد جب ۱۸۸۶ء میں منشی ممتاز علی مرحوم ہجرت کر کے مکہ مکرمہ جانے لگے تو اپنا یہ مطبع مولوی عبدالاحد کو پانچ سو روپے میں فروخت کر دیا۔

مولوی عبدالاحد صاحب رضوی مرحوم ایک ایماندار کاروباری آدمی تھے لہٰذا ان کی صلاحیت اور ذاتی محنت و لگن سے اس مطبع نے ہندوستان گیر پیمانہ پر اعتماد اور شہرت حاصل کر لی اور یہ مطبع طباعت کی عمدگی اور صحت کے لحاظ سے پورے ہندوستان میں بڑی قدر و منزلت کی نگاہوں سے دیکھا جانے لگا۔

جب مولانا عبدالاحد صاحب کا خاندان تقسیم ہوا تو یہ تاریخی مطبع بھی بھائیوں میں تقسیم ہو گیا۔ اور تقسیم ملک کے بعد جب خاندان کے افراد پاکستان منتقل ہو گئے تو یہ مطبع وہاں منتقل ہو گیا اور اب "یہ مطبع مجتبائی" اسی نام کے ساتھ لاہور میں قائم ہے۔ یہ تاریخی مطبع دہلی میں چوڑی والان میں قائم تھا۔ لیکن اب ہندوستان میں تو زوال پذیر ہو چکا ہے۔

خدا کرے پاکستان میں پھر بام عروج پر پہونچکر مولانا مرحوم کی یاد کو زندہ کردے۔ آمین!

سید محبوب رضوی مرحوم لکھتے ہیں :-

"مطبع مجتبائی دہلی سے عربی، فارسی اور اردو کی ہزاروں کتابیں طبع ہوکر شائع ہوئیں۔ درس نظامی کی تقریباً سبھی کتابیں اس مطبع میں چھپتی تھیں۔ غرض کہ اس مطبع نے اسلامی علوم و فنون کی بڑی خدمت انجام دی۔

مطبع مجتبائی میں جید اور مستند علماء تصحیح و تالیف اور حواشی کا کام انجام دیتے تھے۔ مولانا محمد احسن نانوتویؒ، مولانا محمد منیر نانوتویؒ مولانا نظام الدین کیرانویؒ، مولوی خلیل الرحمٰن برہانپوری، مولوی محمد اسحاق اور مولوی محمد بیگ کے نام قابل ذکر ہیں۔"

تاریخ دارالعلوم دیوبند ص۱۱۱

یوسف بخاری دہلوی نے لکھا ہے کہ :

" مطبع نول کشور لکھنؤ کے بعد اگر کسی مطبع نے لازوال شہرت پائی تو وہ واحد مطبع مجتبائی دہلی تھا۔ سیکڑوں، مذہبی، تاریخی اور ادبی کتابوں کے درجنوں ایڈیشن اور لاکھوں نسخے چھاپ ڈالے یہ ایسا عظیم کارنامہ ہے کہ آج ہمارے کتب خانے مختلف علوم و فنون کی کتابوں سے معمور نظر آتے ہیں۔

یہ دلی ہے ص۱۰۳

عادات و خصائل

مولوی عبدالاحد مرحوم بڑے با اخلاق، ملنسار، فراخ دل، غریب پرور

دوست نواز اور قوم و ملت کے خیر خواہ تھے۔

آپ قومی و ملی کاموں میں بہت زیادہ دلچسپی لیتے تھے اور اپنی جیب خاص سے بڑی بھاری رقم قومی و ملکی کاموں پر صرف کرتے تھے اور دینی مدارس کے طلبا کو بھی وظائف دیتے تھے۔ آپ کی بڑی خواہش تھی کہ مسلمان گھرانوں میں دینی تعلیم کے ساتھ ساتھ جدید تعلیم کا رواج ہو۔ آپ چونکہ جدید و قدیم علوم سے آگاہ تھے اس وجہ سے جدید اور قدیم تعلیم کی اہمیت و افادیت پر زور ڈالتے تھے۔

اوصاف و کمالات

حافظ عبدالاحد رضوی مرحوم بے پناہ صلاحیتوں و قابلیتوں کے مالک تھے۔ موصوف اپنی ذاتی قابلیت اور انتظامی صلاحیت کی بنا پر اپنے عہد کے مشہور دانشور، مفکر اور منتظم لوگوں میں شمار ہوتے تھے اور حکومت برطانیہ کی نگاہ میں بھی آپ کی بڑی قدر و منزلت تھی۔ آپ کی اپنی بے پناہ علمی و تنظیمی صلاحیت کی بنا پر ارباب حل و عقد آپ سے بے حد متاثر تھے اور آپ کی علمی و تنظیمی صلاحیتوں کی بنا پر ہی آپ کو "خان بہادر" کا معزز خطاب بھی ملا تھا۔ یہ خطاب دراصل آپ کے فضل و کمال کا اعتراف تھا۔

اولاد

آپ کثیر الاولاد تھے۔ آپ کی نرینہ اولاد میں نو(۹) صاحبزادے تھے جو سب ہی تعلیم یافتہ اور مولانا کی طرح نیک طبع اور باحوصلہ انسان تھے۔ ان میں سے بعض حضرات نے مطبع کے نظم و نسق کو سنبھال لیا تھا اور بعض سرکاری اعلیٰ منصبوں اور عہدوں پر فائز تھے۔

وفات

مولوی حافظ عبدالاحد صاحب کا انتقال ۱۹۲۰ء - ۱۳۳۹ھ میں ہوا۔ انگریزوں سے قریب رہنے کے جرم میں مرحوم پر کفر کا فتویٰ بھی لگا تھا۔

آپ کا جنازہ ابتداء احاطہ خواجہ باقی باللہ میں گیا۔ وہاں کے لوگوں نے وہاں دفن کرنے سے منع کردیا تو پھر وہاں سے کسی طرح جنازہ احاطہ شاہ ولی اللہ میں لایا گیا۔ اور شاہ ولی اللہ اور ان کے خانوادہ کے قریب ہی دفن کر دیئے گئے۔

دراصل مولوی عبدالاحد صاحب نے ولی اللہی خاندان کی تصنیفات کی جو گراں قدر اشاعت کی تھیں اس کی وجہ سے مرحوم اس اعزاز و اکرام کے مستحق ہوئے۔ لوح مزار پر تاریخ وفات درج ہے۔

پاک طینت مولوی عبدالاحد
چوں ازیں دنیائے دوں فطرت برفت
دل فگار و خستہ و غمگین نثار
سال ہجری گفت درجنت برفت
۱۳۳۹ھ

سمیع اللہ خان

سر سید احمد خاں، محسن الملک، مولوی سید مہدی علی خان، وقار الملک مولوی مشتاق حسین، شمس العلماء مولانا شبلی نعمانی، خواجہ الطاف حسین حالی، مولوی ذکاء اللہ دہلوی، شمس العلماء ڈپٹی نذیر احمد، مولوی چراغ علی، مولوی زین العابدین مولوی وحید الدین سلیم، جسٹس سید محمود اور مولوی سمیع اللہ خان سی ایم جی مسلم یونیورسٹی علی گڈھ کے قدیم موسسوں اور معماروں میں تھے۔ اللہ تعالیٰ ان تمام بانیان یونیورسٹی کی روحوں کو خوش رکھے۔

ولادت اور تعلیم و تکمیل

مولوی سمیع اللہ خان دہلی کے ایک علمی مذہبی خانوادے کے چشم و چراغ تھے۔ وہ ۱۸۳۴ء — ۱۲۵۰ھ میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد ماجد کا نام نواب منشی عزیز اللہ خان تھا۔ جن کا شمار دلی کے شرفاء و رؤساء میں ہوتا تھا۔ مولوی سمیع اللہ خان نواب منشی عزیز اللہ خان کے فرزند اکبر تھے۔ نواب صاحب نے اس دور کے عام شرفاء و رؤساء کے برعکس

اپنے فرزند کی تعلیم و تربیت کی طرف خصوصی توجہ منعطف کی۔

مولوی سمیع اللہ کی تعلیم کا آغاز باضابطہ قرآن مجید سے ہوا، موصوف نے اپنی بے پناہ ذہانت و ذکاوت کی وجہ سے بہت جلد ہی جملہ مروجہ دینی علوم و فنون میں کمال پیدا کر لیا۔

آپ کے اساتذہ میں استاذ الکل مولانا مملوک علی نانوتویؒ اور مفتی صدرالدین آزردہؒ جیسے صاحب علم و فضل بزرگ شامل تھے۔ مولوی صاحب علوم اسلامیہ کی تکمیل کے بعد علم قانون کی طرف متوجہ ہوئے اور جلد ہی علم قانون میں مہارت حاصل کر لی۔

ملازمت

مولوی سمیع اللہ خان رسمی تعلیم سے فراغت کے بعد بڑے بڑے سرکاری عہدوں اور منصبوں پر فائز رہے اور اپنی خداداد صلاحیتوں اور قابلیتوں کی بنا پر ان تمام اہم ذمہ داریوں سے بحسن خوبی عہدہ براہوئے۔

شیخ محمد اکرام لکھتے ہیں:-

"۱۸۵۸ء میں منصف ہوئے۔ ۱۸۶۲ء میں تخفیف میں آکر ہائی کورٹ کے وکیل ہوئے پھر ۱۸۷۳ء میں سب جج ہو گئے، رائے بریلی میں ڈسٹرکٹ جج اور سیشن جج رہے۔ نومبر ۱۸۹۲ء میں پنشن لے لی ۱۹۰۱ء میں حج کیا۔

حاشیہ موج کوثر صہ ۸۹

خطاب

مولوی سمیع اللہ خان اردو، انگریزی اور عربی زبان و ادب کے مایۂ ناز

ادیب و انشاء پرداز تھے۔ خصوصاً عربی میں برجستہ بولنے اور لکھنے میں کامل دستگاہ رکھتے تھے۔ برطانوی دور حکومت میں سرکاری وفد کے ساتھ بحیثیت مشیر اور عربی ترجمان مصر بھی گئے تھے۔ اس وقت ہندوستان کی طرح مصر میں بھی گوروں کو اچھی نظر سے نہیں دیکھا جاتا تھا۔ وہاں کے علماء خاص طور پر مشہور مفکر شیخ جمال الدین افغانی انگریزوں کے خلاف زبردست مہم چلائے ہوئے تھے۔ شیخ جمال الدین افغانی نے مولوی صاحب کے خلاف بھی قلمی جہاد چھیڑ دیا۔ یہ موقع بڑا ہی نازک تھا۔ مگر مولوی صاحب نے نہایت ہی دانشمندی سے اپنے مقاصد سفر کو بیان فرمایا جس سے وہاں کے علماء خاص طور پر شیخ افغانی مطمئن ہوئے اور ادھر حکومت وقت نے بھی مولوی صاحب کے دانشمندانہ اقدام کو بنظر تحسین دیکھا اور سی، ایم، جی کے خطاب سے نوازا۔

مولوی سمیع اللہ خان اخلاق و مروت، مہر و محبت کا حسین پیکر تھے۔ آپ کے اندر انسانی ہمدردی اور رفاہِ عام کا بے پناہ جذبہ تھا۔ آپ نے ۱۸۵۷ء کے پرآشوب دور میں مصائب زدہ ہندوستانیوں کی بڑی خدمت کی ان گنت بے قصور اور بے گناہ انسانوں کو اسیر فرنگ ہونے سے بچایا۔ ایک نواب زادے کو بڑی جد و جہد کر کے پھانسی سے نجات دلائی خود ان کے استاذ مولوی صدر الدین آزردہ داخل زندان ہو گئے تھے۔ ان کی رہائی کے لئے مولوی صاحب نے جان لڑا دی تھی۔ اسی طرح ایک ہندو وکیل کی اس وقت تک مدد کی جب تک وہ جیل سے رہا نہ ہو گئے۔ مولوی صاحب نے یہ جو کچھ کیا محض انسانی ہمدردی کی بنیاد پر کیا اور بلا تفریق مذہب و ملت کیا۔

مدرسۃ العلوم کا قیام

مولوی سمیع اللہ خان، سرسید احمد خان کی طرح شروع ہی سے اپنے قلب و جگر

ہیں قوم کا درد رکھتے تھے اور مسلم قوم کو جدید علوم وفنون سے واقف کرانے والے دردمندوں میں ان کی آواز سب سے پہلے سنائی دیتی ہے۔

مدرستہ العلوم جو آگے چل کر محمڈن کالج ہوا اس کے بانی اور موسس مولوی سمیع اللہ خان ہی تھے۔ مولوی صاحب نے اس وقت مدرستہ العلوم کی بنیاد رکھی جبکہ سرسید احمد خان بنارس میں ملازم تھے۔ اور مولوی صاحب نے سب سے پہلے اپنے ہی فرزند ارجمند محمد حمید اللہ خان کا داخلہ کرایا تھا۔

مولوی ذکاء اللہ مرحوم لکھتے ہیں۔

"اس بات کا اظہار اس موقع پر بیجا نہ ہوگا کہ اس وقت (۱۹۰۱ء) تک جس بنگلہ میں کالج کی متعدد کلاسوں کو درس دیا جاتا تھا۔ وہ بوقت قیام مدرسہ مولوی صاحب کے رہنے کی کوٹھی تھی۔ اور قیام مدرسہ کی تجویزیں سوچنے کے لئے روسائے علی گڈھ کی جو سب سے پہلی کمیٹی منعقد کی گئی تھی وہ بھی اسی میں منعقد ہوئی تھی۔

سرسید احمد خان ایک وسیع القلب اور حقیقت پسند انسان تھے۔ انھیں اپنے حریفوں اور دشمنوں کے ذاتی کمالات واوصاف کو بھی تسلیم کرنے میں کبھی تامل نہیں ہوا۔ چہ جائیکہ اپنے مخلص دوستوں اور پرجوش حامیوں کے کارناموں سے انکار کرتے۔ سرسید احمد خان نے مولوی صاحب کی مخلصانہ کوششوں اور محنتوں کا کھلے لفظوں میں اعتراف کیا ہے۔

سرسید احمد خان کے تاثرات ملاحظہ فرمایئے۔

یہ حقیقت میں مولوی صاحب ہی کی کوشش اور توجہ تھی جس سے کمیٹی کو اس کالج کے قائم کرنے میں کامیابی ہوئی۔ اگر مولوی صاحب اس کالج کا انتظام اپنے ذمہ نہ لیتے، اگر مولوی صاحب بورڈنگ ہاؤس کے انتظامی اور تعلیمی امور کی نگرانی نہ کرتے تو کالج کا

اتنی جلدی کھلنا کبھی ممکن نہ ہوتا۔"

سرسید احمد خان ان کے اس کارنامے کا اعلان فخر سے کیا کرتے تھے۔ انھوں نے ۱۸۷۷ء میں کالج کے سالانہ جلسہ میں جو رپورٹ سنائی تھی اس میں انھوں نے مولوی سمیع اللہ خان کے اس احسان کا برملا اعتراف کیا تھا۔ انھوں نے کہا کہ:

"جس کالج کی رپورٹ آپ حضرات کو پڑھ کر سنائی گئی ہے۔ یہ مولوی سمیع اللہ خان صاحب کے مستقل ارادے اور صحیح رائے کی بدولت قائم ہوا ہے۔"

حق گوئی

مولوی سمیع اللہ خان ایک حق گو اور مسلم نواز دانشور تھے۔ آپ کی حق گوئی اور مسلم نوازی مشہور ہے۔ مولوی صاحب نے پوری زندگی قومی و ملی مفاد کو ذاتی مفاد پر مقدم رکھا۔ آپ کی یہ خصوصیت رہی ہے کہ آپ نے اجتماعی مفاد کے خلاف کرنے والے کسی فرد کو کسی قیمت پر معاف نہیں کیا۔

مولوی سمیع اللہ خان اور سرسید احمد خان کے درمیان کس قدر گہرے تعلقات و مراسم تھے لیکن جب سرسید احمد خان نے یورپین اسٹاف کے اختیارات اور جسٹس سید محمود کی نیابت کے متعلق اجتہادی غلطی کا ارتکاب کیا تو مولوی سمیع اللہ خان سے خاموش نہ رہا گیا اور سرسید احمد خان کی شدت سے مخالفت کی لیکن بازاری پن پر کبھی نہیں اترے۔ سرسید احمد خان کے اخلاص میں کوئی شبہ نہیں۔ لیکن وہ کالج کی خاطر کبھی ایسا فیصلہ صادر کرتے تھے جو حقیقتاً قومی و ملی مفاد کے خلاف ہوتا تھا۔ مولانا سید سلیمان ندویؒ نے بڑی اچھی بات لکھی ہے۔

فرماتے ہیں کہ :-

"سر سید مرحوم کے یہ چند خیالات ذاتی نہ تھے بلکہ انگریز ان کے منہ سے زبردستی کہلواتے تھے اور سرسید احمد خان کالج کی محبت میں یہ سب کچھ گوارا کر لیتے تھے۔"

مولانا سید سلیمان ندوی رحمتہ اللہ علیہ ایک اور دوسری جگہ لکھتے ہیں۔

"سرسید میں ساری خوبیوں کے ساتھ ایک بڑی کمزوری یہ تھی کہ وہ اپنے ہمنشینوں سے آمنا وصدقنا کے سوا کوئی اختلاف رائے برداشت نہیں کر سکتے تھے اسی کا نتیجہ ان کی اور مولوی سمیع اللہ خان صاحب کی جو ان کے دلی دوست اور معاون تھے وہ لڑائی ہے جس میں سرسید نے فرانس چل کر ڈوئل تک لڑنے کا چیلنج دے دیا تھا۔ اور بات اتنی تھی کہ مولوی سمیع اللہ صاحب کالج میں مسلمان بچوں کی تربیت کا کام انگریزوں کے ہاتھ میں نہیں دینا چاہتے تھے اور سرسید نے تعلیم و تربیت دونوں انھیں کے سپرد کر دی تھی۔

حیات شبلی ص۲۸۷

کالج سے ذہنی وابستگی

مولوی سمیع اللہ خان اور ان کے رفقاء اگرچہ عملی حیثیت سے کالج کے انتظامی معاملات سے کنارہ کش ہو گئے تھے۔ مگر اس کے باوجود وہ اس کے تعمیر و ترقی کے دل سے خواہاں رہے اس کے طلبہ و اساتذہ سے محبت سے پیش آتے رہے اور وقتاً فوقتاً انھیں اپنے گرانقدر مشوروں سے نوازتے رہے۔ سرسید احمد خان مرحوم کے آخری دور میں کالج کی حالت خراب ہو گئی تو مولوی سمیع اللہ خان بے قرار ہو گئے اور اپنے دوستوں اور عقیدت مندوں کو کالج کے

استحکام و امداد کی خاطر خطوط لکھے۔

مولوی صاحب نواب وقار الملک کو خط لکھتے ہیں۔

"محمڈن کالج کی نسبت ضرور ضرور کچھ سوچیئے۔ سید صاحب کو نرمی کے ساتھ لکھیئے۔"

وفات

مولوی سمیع اللہ خان ۷ار اپریل ۱۹۰۸ء میں انتقال فرما گئے۔ ان کی وصیت کے مطابق قبرستان مہندیان میں دفن ہوئے۔ آپ کی قبر کی مسجد میں سرراہ شیخ عبدالعزیز شکر بارؒ کے مزار کے قریب ہے۔

مولانا عبد العلی قاسمیؒ

حضرت مولانا عبد العلی قاسمیؒ میرٹھی سابق شیخ الحدیث مدرسہ عبد الرب کشمیری دروازہ دلی، حجۃ اللہ فی الارض مولانا محمد قاسم نانوتویؒ، محدث شہیر مولانا احمد علی سہارنپوریؒ اور ادیب لبیب مولانا فیض الحسنؒ سہارنپوری کے ارشد تلامذہ میں تھے۔

جائے پیدائش

مولانا عبد العلی قاسمیؒ ـــــــ میں اپنے وطن عبد اللہ پور ضلع میرٹھ میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد ماجد کا نام نصیب علی میرٹھی تھا۔ آپ کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی اس کے بعد اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لئے دیوبند تشریف لائے اور ۱۲۹۴ھ میں مولانا احمد حسن امروہویؒ کے ساتھ ہی دار العلوم دیوبند سے فراغت حاصل کی اور چونکہ آپ بے حد ذکی طلباء میں شمار ہوتے تھے اور تعلیم بھی بہت محنت سے حاصل کی تھی اس لئے اللہ تعالیٰ نے تمام علوم عقلیہ اور علوم نقلیہ میں مہارت تامہ عطا فرمائی تھی۔ لہٰذا اکابر دار العلوم نے اپنے اس ہونہار شاگرد کو اپنے سے جدا کرنا گوارا نہ فرمایا

اور دارالعلوم ہی کی مسند تدریس پر آپ کو فائز کر دیا جس پر آپ ۱۳۹۷ھ تک فائز رہ کر تشنگان علوم کو سیراب فرماتے رہے۔ اسی دوران جامعہ قاسمیہ مدرسہ شاہی مراد آباد میں صدارت تدریس کے لئے ایک متبحر عالم اور شیخ الحدیث کی ضرورت پیش آئی تو ارباب جامعہ قاسمیہ کے اصرار پر اکابر دارالعلوم دیوبند نے حضرت مولانا کو جامعہ قاسمیہ مدرسہ شاہی مراد آباد بھیجدیا جہاں آپ نے پورے ۹ سال قیام فرماکر ۱۴۰۶ھ تک اپنے علوم سے اہلیانِ مراد آباد کو فیضاب فرمایا۔

پھر جب آپ کے خسر مولانا عبدالرب مرحوم نے مدرسہ عبدالرب (جو دلی کی ایک مشہور و قدیم دینی اور علمی درسگاہ ہے) کی بنیاد ڈالی اور اس کے لئے ایک لائق شیخ الحدیث کی ضرورت پیش آئی تو مولانا عبدالرب سہارنپوری کی نظر انتخاب مولانا عبدالعلی قاسمی پر پڑی اور مولانا کو مدرسہ عبدالرب کی صدارت درس کی مسند سونپ دی۔ جہاں آپ نے بقیہ زندگی گزار کر باشندگان دہلی پر خوب خوب فیضان علم فرمایا۔ اور دہلی والے بھی فیضاب ہوئے۔

زہد و ورع

مولانا عبدالعلی قاسمیؒ بڑے متقی، پرہیزگار اور گوشہ نشین قسم کے بزرگ تھے۔ آپ زہد و ورع میں اپنی نظیر آپ تھے اور لوگ بیان کرتے ہیں۔ آپ کی تہجد کی نماز اور تکبیر اولی ترک نہیں ہوئی۔

آخر عمر میں فالج کی وجہ سے جب معذور ہو گئے تو آپ کے تلامذہ آپ کو جماعت کے وقت اٹھا کر صف اولی میں رکھدیا کرتے تھے۔

مولانا عبدالعلی قاسمی رحمۃ اللہ علیہ کے تلامذہ کا ایک وسیع حلقہ تھا جس

میں حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ، مفتی اعظم مولانا محمد کفایت اللہ دہلویؒ، شیخ الاسلام مولانا محمد انور شاہ کشمیریؒ اور مولانا حسین احمد مدنی جیسی عبقری شخصیتیں شامل تھیں۔

مدرسہ عبدالرب کے سالانہ جلسوں میں حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ اپنے استاد محترم کی وجہ سے بڑی پابندی سے تشریف لے جایا کرتے تھے۔ حضرت تھانویؒ کے سفر سے معذور ہو جانے پر حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیبؒ مہتمم دارالعلوم دیوبند کو پابندی سے بلاتے رہتے تھے۔ اور حضرت مہتمم صاحب بھی اپنے شیخ کے اتباع میں مدرسہ عبدالرب کے جلسے کی شرکت ضروری خیال فرماتے اور ہر حال میں شرکت کی سعی فرماتے۔

عادات و خصائل

مولانا عبدالعلی قاسمی رحمۃ اللہ علیہ بڑے متواضع، منکسر المزاج، بے تکلف، مہمان نواز اور شفیق انسان تھے۔ آپ طالب علموں پر بڑے ہی شفیق اور مہربان تھے۔ آپ ہر ایک کے ساتھ اور خاص طور پر طلبا کے ساتھ بڑی شفقت و محبت سے پیش آتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ آپ کی ذات مرجع خلائق بنی ہوئی تھی۔

مولانا عبدالعلی قاسمیؒ کو مولانا محمد قاسم نانوتویؒ سے خصوصی تعلق اور لگاؤ تھا اور آپ کو حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ سے اس قدر عقیدت تھی کہ آپ اکثر اپنے شاگردوں سے فرمایا کرتے تھے۔

"قاسمی ہو جاؤ بھوکے ننگے نہ رہو گے، مجھ اپاہج کو دیکھو رزق کی بہتات یہ ہے کہ میرا حجرہ ہمہ قسم کی نعمتوں سے ہر وقت بھرپور رہتا ہے۔" مشاہیر علماء دارالعلوم دیوبند ص۳۴۵

حضرت نانوتوی کے علاوہ دیگر علماء ومشائخ سے بھی آپ تعلق رکھتے تھے اور آپ سے بھی ہر طبقہ کے علماء ومشائخ عقیدت ومحبت رکھتے تھے غرضیکہ آپ ایک ہر دلعزیز انسان تھے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کے انتقال کے بعد جنازے میں اس قدر ہجوم تھا کہ گویا پوری دلی امنڈ آئی تھی۔ آپ کا جنازہ مدرسہ عبدالرب ہملٹن روڈ کشمیری گیٹ سے قبرستان مہندیان میں لایا گیا اور شیخ الاسلام شاہ ولی اللہ اور ان کے علمی و روحانی خانوادہ کے بزرگوں کے قریب ہی دفن کر دیئے گئے۔ آپ کا انتقال ۱۳ر جمادی الاول ۱۳۴۷ھ میں ہوا۔

عبدالرزاق انصاریؒ

حکیم عبدالرزاق انصاری قصبہ یوسف پور ضلع غازی پور میں پیدا ہوئے آپ کے والد کا نام عبدالرحمٰن انصاری تھا۔ حکیم صاحب کے بڑے بھائی کا نام حکیم عبدالوہاب نابینا تھا اور سب سے چھوٹے بھائی مشہور قومی رہنما ڈاکٹر مختار احمد انصاری تھے۔

عبدالرحمٰن انصاری ایسٹ انڈیا کمپنی کے عہد میں ضلع بلیا میں صدر امین تھے اور ۱۸۵۷ء کی بغاوت کے دنوں میں دوسرے سرکاری ملازمین کی طرح انگریزوں کا ساتھ دیا تھا۔ لیکن ان کے تینوں صاحبزادگان نے تحریکات آزادی میں حصہ لے کر اس کا کفارہ ادا کر دیا۔

حکیم عبدالوہاب انصاری نابینا سب بھائیوں میں بڑے تھے اور فقیہ الامت مولانا رشید احمد گنگوہی کے مخلص شاگرد اور جاں نثار مرید تھے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

ڈاکٹر مختار احمد انصاری ہندوستان کے ممتاز اور چوٹی کے قومی لیڈروں میں تھے۔ مہاتما گاندھی، جواہر لال نہرو، مولانا محمد علی جوہر، مولانا شوکت علی

مولانا حسرت موہانی، مولانا آزاد اور حضرت شیخ الہند جیسے قائدین آپ کی عظیم الشان کوٹھی میں ٹھہرا کرتے تھے۔ اور کانگریس کی بہت ہی ہنگامہ خیز میٹنگیں اور فیصلہ کن نشستیں آپ ہی کی تاریخی کوٹھی دارالسلام دریا گنج میں ہوتی تھیں یہ بھی زمانہ کی ستم ظریفی ہے کہ آج یہ تاریخی کوٹھی آریہ سماجیوں کے قبضے میں ہے۔ کاش ہماری سرکار اس کوٹھی کو قومی یادگار کے طور پر محفوظ کر دیتی۔

سلسلہ نسب

حکیم عبدالرزاق انصاری کا سلسلہ نسب حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ سے جا ملتا ہے جن کا نام ہر مسلمان جانتا ہے آپ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے جان نثار صحابی اور مدینہ میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے میزبان اول تھے۔

تعلیمی سفر

حکیم عبدالرزاق انصاری نے دارالعلوم دیوبند سے فراغت حاصل کی اور طبابت کا پیشہ اختیار کیا۔ حکیم عبدالرزاق کا شمار ہندوستان کے حاذق اطباء میں ہوتا تھا۔ انھوں نے حیدرآباد میں برسوں طبابت کی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو دست شفاء سے نوازا تھا۔ بیماروں، مریضوں کے ساتھ بڑی ہمدردی اور غمگساری کے ساتھ پیش آتے تھے۔ ڈاکٹر انصاری ہی کی طرح آپ بھی طبعاً شفیق و مہربان تھے۔

بیعت و ارادت

حکیم عبدالرزاق انصاری شیخ الہند مولانا محمود حسن اسیر مالٹا کے مرید خاص اور عاشق زار تھے موصوف ہی کی وجہ سے ڈاکٹر انصاری بھی حضرت شیخ الہند

سے قریب ہوتے تھے۔ ان تینوں بھائیوں کو حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ سے بڑی قربت حاصل تھی۔

ڈاکٹر انصاری بھی حضرت شیخ الہند سے بیعت تھے۔ حکیم عبدالرزاق انصاری کا پورا خاندان حضرت شیخ الہند کا عاشق زار اور فدائی تھا۔ خصوصاً حکیم عبدالرزاق انصاری کو حضرت شیخ الہند سے خصوصی تعلق تھا۔ اور حضرت پر سب کچھ نچھاور کرنیکو ہر وقت تیار رہتے تھے۔ لہذا جب حکیم صاحب کو معلوم ہوا کہ تحریکات کے سلسلہ میں حضرت کی گرفتاری یقینی ہے تو آپ نے ہی حضرت شیخ الہند کو سفر حجاز پر آمادہ کیا اور پھر خود ہی بمبئی جاکر انتہائی رازداری کے ساتھ سفر کی تیاریاں مکمل کیں۔ یہاں تک کہ گورنمنٹ کو بھی حضرت کی روانگی کی اطلاع اس وقت ہوئی جبکہ حضرت کو گرفتار کرنا مشکل ہوگیا اور آخر کار شیخ الہند بخیریت حجاز مقدس پہونچ گئے۔

چنانچہ مولانا مدنیؒ لکھتے ہیں کہ:

"ڈاکٹر انصاری جو اس سفر کے محرک تھے۔ انھوں نے ٹکٹوں کا انتظام بھی کیا۔ ڈاکٹر صاحب کے بڑے بھائی حکیم عبدالرزاق انصاری حضرت سے پہلے ہی بمبئی پہونچ گئے اور فراخدلی سے سفر کی جملہ ضرریات مہیا کر دیں۔"

سفرنامہ اسیر مالٹا ص ۹

ریشمی خطوط کیس میں کون کیا ہے؟ میں لکھا ہے کہ:

"حکیم عبدالرزاق انصاری مولانا محمود حسن کا پکا مرید ہے ان کو ہجرت کے لیئے اکسانے والے خاص لوگوں میں ہے محمود حسن کے سفر عرب کے تمام انتظامات کیئے اور ان کو رخصت کرتے بمبئی تک گیا۔" ریشمی خطوط کیس ص ۳۰

حضرت مولانا حسین احمد مدنی تحریر فرماتے ہیں کہ :
"ڈاکٹر انصاری صاحب اور ان کے بھائی حکیم عبدالرزاق انصاری صاحب رحمہما اللہ کو خیال ہوا کہ حجاز شریف میں گرانی زیادہ ہے حضرت شیخ الہند تنہا نہیں ہیں بلکہ آپ کے ساتھ اور رفقاء بھی ہیں ویسے بھی حضرت موصوف کا حوصلہ فراخ اور دسترخوان وسیع ہے لہذا حضرت کے پاس جو اثاثہ ہوگا وہ ختم ہوگیا ہوگا۔ اب کوئی اور رقم بھیجنی چاہیئے! حج کا زمانہ تھا۔ حجاج جا رہے تھے۔ کسی معتمد حاجی کے ذریعہ رقم بھیجی جا سکتی تھی۔ لیکن ان دونوں رہنماؤں کی غیر معمولی ہمدردی کا فیصلہ یہ ہوا کہ حضرت کے کسی قریبی عزیز کو جو خانگی حالات سے پوری طرح واقف اور خانگی امور میں بے تکلف ہو بھیجا جائے! تاکہ رقم کے ساتھ حضرت کو اپنے متعلقین کے حالات بھی تفصیل سے معلوم ہوجائیں۔ چنانچہ حضرت کے ایک خاص عزیز کو (جن کا نام لینا مناسب نہیں معلوم ہوتا) اس خدمت کے لئے (جو ان کے لئے سراسر سعادت تھی کیونکہ حضرت کی زیارت کے ساتھ حج بیت اللہ کی زیارت کا شرف بھی مفت حاصل ہو رہا تھا۔) نامزد کیا گیا۔ مزید براں تار کے ذریعہ جہاز میں سیٹ بھی متعین کرالی اور روانگی کے لئے ایسا وقت مقرر کیا کہ بمبئی پہونچکر جہاز کا انتظار نہ کرنا پڑے بلکہ فوراً ہی جہاز پر سوار ہوجائیں چنانچہ یہ عزیز دفعتاً دیوبند سے روانہ ہوئے اور بمبئی پہونچتے ہی بندرگاہ پر چلے گئے۔

اس عجلت اور رازداری کا یہ فائدہ تو ضرور ہوا کہ حکومت کو رکاوٹ پیدا کرنے کا موقع نہیں مل سکا۔ یہاں تک کہ عزیز موصوف کی

روانگی کا علم بھی حکومت کو اس وقت ہوا جب جہاز روانہ ہو چکا لیکن اس طرح روانگی سے حکومت کو شبہہ بھی ہو گیا۔ اس لئے حکومت ہند کی طرف سے عدن تار دیا گیا کہ جہاز پر تلاشی لی جائے اور مشتبہہ کاغذات وغیرہ قبضہ میں کر لئے جائیں۔ چنانچہ جہاز جب عدن پہنچا تو پولیس کی جمعیت جہاز پر آئی اور عزیزہ موصوف کی تلاشی پوری سختی کے ساتھ لی۔ مگر کوئی چیز ایسی برآمد نہ ہو سکی جس پر شبہہ کیا جا سکے۔ لہذا عزیزہ موصوف بخیریت جدہ اور پھر مکہ معظمہ پہونچ گئے۔ حضرت کو اہل وعیال کی خیریت معلوم ہوئی تو آپ بہت خوش ہوئے۔ عزیزہ موصوف نے ڈاکٹر انصاری اور عبدالرزاق انصاری کا بھیجا ہوا ایک ہزار روپیہ پیش کر دیا۔

نقشِ حیات ص۲۲۹

تحریکِ شیخ الہند میں مولانا محمد میاں صاحب نے لکھا ہے کہ:

"زمانہ قیام حجاز میں ڈاکٹر مختار احمد انصاری، حکیم عبدالرزاق انصاری مولانا محمد ابراہیم راندیری وغیرہ نے حضرت کی جو خدمت کی وہ ان کے حسنات عالیہ کا گراں بہا حصہ ہے۔"

تحریکِ شیخ الہند ص۴۳

گرفتاریاں

تحریکِ شیخ الہند سے وابستہ لوگوں کی ہندوستان میں گرفتاری شروع ہوئی تو حکیم عبدالرزاق انصاری رحمۃ اللہ علیہ کو بھی بلایا گیا۔ پولیس نے ان سے پوچھ تاچھ کی تو سوائے مالی امداد کے اور کوئی ثبوت حکومت کے پاس نہیں تھا۔

"حکام نے کہا کہ شیخ الہند حکومت کے باغی ہیں اور آپ ان کی اعانت

کرتے ہیں اور یہ جرم ہے تو اس کا جواب ڈاکٹر انصاری نے یہ دیا کہ میں نے
ان کو ایک مذہبی پیشوا اور مرشد ہونے کی بنا پر مالی تعاون دیا ہے اگر
گورنمنٹ ایسا ہی سمجھتی ہے تو میں حاضر ہوں جو چاہے سزا دے۔ اس
صاف گوئی اور بعض اور دوسری مصلحتوں کیوجہ سے ان کی گرفتاری عمل
میں نہیں آئی۔"

تحریک آزادی اور مسلمان ص۱۶۴

وفات

حکیم عبدالرزاق انصاری کی وفات دہلی میں ہوئی، موصوف کی تدفین قبرستان
مہندیان میں ہوئی۔ آپ کی قبر مولانا محمد حسین فقیر دہلوی کی قبر سے قریب تھی لیکن
مرور زمانہ کی وجہ سے قبر بے نشان ہوگئی ہے۔

مولانا محمد عثمان صاحب نبیرہ شیخ الہند اپنے انتقال سے کچھ دن پہلے مہندیان میں
تشریف لائے تھے اور راقم الحروف سے فرمایا کہ مہندیان میں حضرت شیخ الہند
کے جاں نثار حکیم عبدالرزاق انصاری دفن ہیں۔ ان کا میرے خاندان سے بڑا گہرا
تعلق تھا۔ یہ جملہ کہکر زار و قطار رونے لگے۔

مولانا محمد عثمان صاحب مرحوم ہی نے اس جانب کی نشاندہی کی تھی۔ ؎
ترا نشاں نہ رہا اور بے نشاں نہ ہوا

مولانا امین الدینؒ

مولانا امین الدین اورنگ آبادی بانی وموسس مدرسہ امینیہ اسلامیہ کشمیری دروازہ دہلی دارالعلوم دیوبند کے مشاہیر علماء وفضلاء میں منفرد حیثیت کے مالک تھے۔

سن پیدائش

آپ ۱۲۸۷ھ میں اورنگ آباد دکن میں پیدا ہوئے اور ابتدائی تعلیم گھر پر رہ کر اپنے ماں باپ کے زیر سایہ حاصل کی۔ اور ۱۷ سال کی عمر میں درس نظامیہ کی تعلیم کے لئے شمالی ہند کا رخ کیا اور ایشیا کی عظیم اسلامی درسگاہ دارالعلوم دیوبند میں داخل ہو کر اکتساب فیض شروع کیا مگر نہ معلوم وجوہ کی بناء پر یہاں تین سال تعلیم حاصل کرنے کے بعد ۱۳۰۷ھ میں ضلع شاہجہانپور چلے گئے اور مدرسہ اعزازیہ میں داخل ہو گئے۔ حسن اتفاق سے وہاں مولانا نادرالدین جیسا نادرۂ روزگار منطقی وفلسفی استاد ملا۔ ہوسکتا ہے کہ شوق فلسفہ ہی یہاں آمد کا باعث بنا ہو۔

مولانا نادرالدین مشہور خاندانی منطقی وفلسفی شمس العلماء مولانا عبدالحق

خیرآبادیؒ کے خصوصی شاگرد تھے۔ اور منطق و فلسفہ کے امام تسلیم کئے جاتے تھے۔ لہٰذا مولانا امین الدینؒ نے مولانا نادر الدین صاحب مرحوم سے بھرپور استفادہ کیا۔ اور اس بحر ذخّار سے سیراب ہونے کے بعد علوم تفسیر و حدیث و فقہ کی تکمیل کے لئے پھر دیوبند کا رخ کیا اور شاہجہانپور سے دارالعلوم دیوبند آگئے اور اساتذہ دارالعلوم دیوبند جو اس زمانہ کے علماء میں قرآن و حدیث کی مہارت میں امتیازی شان کے مالک تھے۔ ان یگانۂ روزگار ہستیوں سے خوب خوب سیراب ہوئے اور ۱۳۱۴ھ میں دارالعلوم دیوبند سے فراغت حاصل کی۔ اس آٹھ سالہ دور قیام میں شمالی ہند اور خصوصاً دہلی کی علمی اور دینی فضا نے آپ کو بے حد متاثر کیا۔ اور آپ نے قرآن و حدیث کی خدمت کے لئے اسی علاقہ کو اپنا میدان کار تجویز فرمایا۔ اور دہلی قیام کا ارادہ فرمالیا۔ اور چونکہ ۱۸۵۷ء کے بعد دہلی کے ساتھ اس کے دینی مراکز و مدارس بھی اجڑ گئے تھے۔ اس لئے آپ نے ایک مدرسہ کی داغ بیل ڈالنے کا ارادہ فرمایا اور اپنے قدیم رفقاء سے صلاح و مشورے شروع کیا، جس میں سب نے آپ کے جذبہ کو بہت سراہا اور ہر طرح کے تعاون کے لئے آمادگی ظاہر فرمائی۔ لہٰذا بالآخر ۱۳۱۵ھ / ۱۸۹۷ء میں مدرسہ امینیہ اسلامیہ کا قیام عمل میں آیا جس کے اہتمام کی ذمہ داری تو حضرت مولانا نے خود سنبھالی۔ اور صدارت تدریس کے لئے یکتائے زمانہ، فخر روزگار شیخ الاسلام مولانا محمد انور شاہ کشمیریؒ اور مولانا ضیاء الحق دیوبندی کو منتخب فرمایا اور اس طرح یہ تاریخی مدرسہ ان دو عبقری شخصیتوں کے زیر سایہ جاری ہوگیا اور طالبان علم نبوت اطراف و جوانب سے جوق در جوق آنے لگے۔ مگر کچھ عرصہ کے بعد حضرت مولانا انور شاہ کشمیریؒ نے اپنے وطن کشمیر جانیکا ارادہ ظاہر فرمایا تو انہی کے ہم درس عالم دین و محدث کبیر مفتی اعظم حضرت مولانا محمد کفایت اللہ صاحبؒ کو

۱۳۲۷ھ میں شاہجہاںپور سے بلایا اور حضرت کشمیریؒ کشمیر تشریف لیجانے پر ۱۳۳۳ھ میں مسند صدارت حضرت مفتی صاحبؒ کے سپرد فرمادی جس پر حضرت مفتیؒ آخر عمر تک فائز رہے۔

تبحر علمی

مولانا امین الدین موسس مدرسہ امینیہ شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسنؒ کے اجل تلامذہ اور شیخ الاسلام حضرت مولانا محمد انور شاہ کشمیری و مفتی اعظم حضرت مولانا محمد کفایت اللہ دہلوی کے رفیق درس تھے۔

مولانا امین الدین صاحب اپنی فطری ذہانت و ذکاوت کی بناء پر تمام علوم و فنون میں تو ید طولیٰ رکھتے ہی تھے مگر خاص طور پر حدیث، تفسیر اور فقہ میں مہارت تامہ کے حامل تھے۔ یہی وجہ ہے کہ معاصرت کے باوجود مولانا محمد انور شاہ کشمیری، مولانا ضیاء الحق دیوبندی اور مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب دہلوی جیسے صاحب فضل و کمال علماء نے ہمیشہ آپ کی علمی صلاحیت حدیث، تفسیر میں مہارت کا برملا اعتراف کیا ہے۔

زہد و تقویٰ

مولانا امین الدین متبحر عالم دین ہونے کے ساتھ زہد و تقویٰ، عبادت و ریاضت اور اخلاص و للہیت میں یگانہ روزگار تھے۔ آپ پر حضرت شیخ الہندؒ کا روحانی رنگ غالب تھا۔ اور اسی بناء پر دہلی جیسے شہر میں آپ کے ارادتمندوں کا حلقہ بہت وسیع تھا اور دہلی کے بڑے بڑے رؤسا آپ کے سامنے زانوئے ادب طے کرتے تھے۔

عادات واخلاق

مولانا امین الدین صاحب مرحوم بڑے خلیق وملنسار، متواضع منکسر المزاج اور شیرین گفتار تھے۔ آپ سے جو کوئی بھی ایک مرتبہ ملتا وہ آپ کا گرویدہ ہوجاتا۔ اس وجہ سے پورے ملک میں خصوصاً دہلی میں آپ کا حلقۂ احباب بھی بہت وسیع تھا۔ جو ہر وقت آپ کے لئے جان تک دینے کے لئے تیار رہتے تھے۔ مولانا امین صاحب اپنے شاگردوں پر بھی بڑے شفیق ومہربان تھے۔ ان کے ساتھ بڑی شفقت ومحبت سے پیش آتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ یہ طلبہ عزیز ہی مستقبل کے معماران قوم اور مصلحین ملت ہونگے۔ ان کی حوصلہ افزائی ہونی چاہیئے۔

عملیات

مولانا امین الدین اورنگ آبادی ماہر عملیات بھی تھے۔ آپ مخلوق خدا کی راحت رسانی اور فیض رسانی کی غرض سے بلا معاوضہ تعویذات بھی دے دیا کرتے تھے۔ آپ کوئی پیشہ ور عامل نہیں تھے۔ اکابر کی طرح آپ بھی آیات قرآنی اور احادیث نبوی پڑھ کر اور لکھ کر دیا کرتے تھے۔ لوگوں کا اس سے بہت زیادہ فائدہ ہوتا تھا۔

سیاسی مشاغل سے اجتناب

مولانا امین الدین صاحب اس عہد کی پیداوار ہیں جس عہد کے علماء ومشائخ پر سیاسی رنگ غالب تھا اور علماء انگریز دشمنی کو جزء ایمان تصور کرتے تھے۔ حضرت شیخ الہند کی انگریز دشمنی حضرت شیخ الہند کے تلامذہ میں بطور ورثہ کے

آئی تھی۔ مولانا عبید اللہ سندھیؒ، مولانا شبیر احمد عثمانیؒ، مولانا حسین احمد مدنی اور مفتی کفایت اللہ دہلویؒ یہ سبھی اکابر انگریزوں کی مخالفت میں پیش پیش تھے تو یہ کیسے ممکن تھا کہ مولانا امین الدین مرحوم خاموش تماشائی بنے رہتے اور اس میدان کے شہسواروں میں آپ کا حصہ نہ ہوتا مگر چونکہ مولانا طبعاً یکسوں اور ہنگاموں سے گریزاں رہنے کے عادی تھے اس لئے مولانا اگرچہ میدان میں تو کبھی نہ آئے۔ مگر خاموشی کے ساتھ طلبہ کی ایسی فوج تیار کرتے رہے جو آگے چل کر انگریزوں کے لئے زہر قاتل ثابت ہوئے۔ لہٰذا مولانا امین الدینؒ اس حیثیت سے بھی ان بزرگوں سے کسی بھی درجہ کم نہیں رہے۔

نکاح

مولانا امین الدین کی شادی ۱۳۱۸ھ میں سید عابد علی دہلویؒ کی صاحبزادی محمودی بیگم سے ہوئی۔ آپ کی اہلیہ محترمہ بڑی عابدہ، زاہدہ اور شب گزار خاتون تھیں۔ آپکی چھ اولاد تھیں۔ سب سے بڑے صاحبزادے سعید الدین مرحوم تھے جو تقسیم ملک کے بعد کراچی چلے گئے تھے اور وہیں ان کا انتقال ہو گیا۔ موصوف بڑے نیک طبع انسان تھے۔ مولانا محمد الیاس صاحب کاندھلویؒ سے بہت ہی قریب اور تبلیغی جماعت سے وابستہ تھے۔ دوسری اولاد کے حالات معلوم نہیں ہو سکے ہیں۔

وفات

مولانا امین مرحوم ۱۹ رمضان المبارک ۱۳۳۸ھ میں ۶ جون ۱۹۲۰ء میں بعمر اکیاون سال وفات پائی۔

مولانا امین الدین صاحب اور آپ کی اہلیہ وصاحبزادی ام سلمیٰ کی قبریں تھہندیان میں ایک ہی لائن میں ہیں۔ ان تینوں قبروں پر خوبصورت کتبے لگے ہوئے ہیں۔ مگر چونکہ یہ قبریں پس دیوار واقع ہیں اس لئے اکثر زائرین ان پر فاتحہ خوانی سے محروم رہتے ہیں۔

عبدالرحمٰن راسخ

ولادت

مولانا عبدالرحمٰن راسخ دہلوی ۱۲۸۴ھ میں دہلی کے ایک علمی وروحانی خانوادہ میں پیدا ہوئے آپ کے والد ماجد کا نام مولانا محمد حسین فقیر دہلوی تھا جو اپنے وقت کے مشہور زاہد اور درویش انسان تھے۔

مولانا عبدالرحمٰن راسخ نے معقولات ومنقولات کی مروجہ کتابیں اپنے باکمال والد سے پڑھیں اور آپ اپنی خداداد ذہانت اور عبقریت کی بنا پر بہت جلد جملہ علوم وفنون پر حاوی ہوگئے اور آپ کا شمار دلی کے سربرآوردہ علماء اور فضلاء میں ہونے لگا۔

عوامی درس قرآن مجید

مولانا عبدالرحمٰن راسخ ایک بالغ نظر عالم دین، باشعور مفسر قرآن اور شیوا بیان واعظ تھے۔ آپ فارغ التحصیل ہونے کے بعد عوامی درس قرآن مجید

کا آغاز کر دیا۔ آپ کا تحریک ولی اللہی سے گہرا تعلق تھا۔ موصوف نے درس قرآن مجید کے ذریعہ مسلم عوام و خواص کے اندر روحانی انقلاب برپا کرنے کی مخلصانہ جد و جہد کی۔ اور عوام و خواص میں آپ کا شستہ و شگفتہ ترجمہ قرآن بڑا ہی مقبول تھا۔

دلی میں آج جو تفسیری ذوق کسی نہ کسی عنوان سے باقی ہے دراصل یہ مولانا عبدالرحمٰن راسخ جیسے بے لوث و مخلص بزرگوں کا کارنامہ ہے۔

دار الحکومت جلد دوم ص۱۸۹ پر لکھا ہے کہ :

" مولانا راسخ مرحوم گلی نواب قاسم جان کی مسجد میں روزانہ ترجمہ قرآن مجید بیان کرتے تھے اور بازار مچھلی والان کی مسجد میں نماز جمعہ کے بعد وعظ بیان کرتے تھے۔ آپ کا وعظ نہایت دلکش اور دلچسپ ہوتا تھا۔ ایک روز مولانا راسخ نے اپنے وعظ میں ماہ شعبان کی پندرھویں شب کا ذکر کیا چونکہ اس رات کو لوگ عموماً قبرستان جایا کرتے ہیں۔ لہذا اس مناسبت سے آپ نے یہ اشعار پڑھے ؎

تم چلے آؤ کسی دن گیسوئیں کھولے ہوئے
کاش تربت پر کسی دن سائیانِ ابر ہو
آرزو یہ ہے کہ پھٹ جائے زمیں ہم دفن ہوں
فاتحہ جس پر پڑھو تم وہ ہماری قبر ہو

مولانا کا وعظ انتہائی اثر انگیز اور مفید ہوتا تھا۔ چنانچہ بڑے بڑے علماء و فضلاء آپ کے وعظ میں شریک ہو کر اکتساب فیض کرتے تھے اور آپ جو کچھ بیان فرماتے تھے اس کا نقشہ آنکھوں میں پھر جاتا تھا جب آپ جنت و جہنم کا ذکر فرماتے تو معلوم ہوتا کہ جنت اپنی تمام نعمتوں اور

جہنم اپنی تمام ہولناکیوں کے ساتھ سامنے ہے ....

چنانچہ "۱۸۵۷ء کے بعد کی دہلی" کے مصنف مرحوم لکھتے ہیں

"مولانا کے وعظ میں بڑے بڑے علماء و فضلاء شامل ہوتے تھے مولانا کا طرزِ بیان کچھ ایسا تھا کہ جو سماں باندھتے تھے اس کا نقشہ آنکھوں میں کھنچ جاتا تھا۔ ایک مرتبہ وعظ کے دوران میں بیان جزاء و سزا کا تھا یا میدان حشر کا نقشہ کھنچ گیا .... لوگوں میں عام بکار تھی ایک شخص کی چیخ نکلی اور وہ اسی وقت جان بحق ہو گیا۔"

شعر و شاعری

مولانا عبدالرحمٰن راسخ دہلویؒ اپنے والد مولانا فقیرؔ دہلوی کی طرح اردو فارسی اور عربی تینوں زبان کے قادر الکلام شاعر تھے۔ آپ کی طبیعت کی موزونی خداداد تھی۔ صرف طبیعت کی موزونیت کی بنا پر زمانہ طالب علمی سے ہی برجستہ شعر کہنے لگے تھے۔ اور تا زندگی آپ نے کسی سے اصلاح نہیں لی۔

ایک زمانہ میں آپ کا کلام عاشقانہ رنگ لئے ہوئے تھا۔ لیکن آپ کے والد ماجد کی دعاؤں کی وجہ سے جب آپ کی توجہ تصوف کی طرف مائل ہوئی تو وہ رنگ بھی بدل گیا۔ اور آپ عشق مجازی سے عشق حقیقی میں مشغول ہو گئے۔

پروفیسر مولانا زبیر صاحب قریشی لکھتے ہیں کہ:

"ابھی علم دین سے فراغت نہیں پائی تھی کہ ذوق شاعری دامنگیر ہو گیا اور کیوں نہ ہوتا علم دین ہی نہیں بلکہ علم ادب اور شاعری

باپ دادا سے ورثہ میں ملی تھی۔ سنیئے مکتب دین سے
مکتب عشق میں پہنچنے کی کہانی خود مولانا راسخ مرحوم کی زبانی
...... زمانہ طالب علمی میں جہاں دیگر کتابوں کے سبق ہوتے
تھے وہاں بعض رسائل تصوف کے بھی دو ایک ورق ہوتے
تھے۔ مگر وہ زمانہ کم فہمی کا تھا۔۔ تاہم صوفیائے کرام کی باتوں
میں بہت دل لگتا تھا۔ رفتہ رفتہ جب عمر بڑھی، سمجھ بڑھی، شوق
بڑھا تو کمبختی کے دن آگئے۔ یعنی سر پر شاعری کا جنون سوار
ہو گیا۔

ہنوز تعلیم ربانی کا سلسلہ ناتمام تھا کہ شعر گوئی کا شوق مدرسۂ عقل و
نقل سے اٹھا کر مکتب عشق میں لے گیا۔ پیر مغاں سے بیعت
ہوئی۔ اللہ کی رحمت ہوئی دست سبو دعا کے لئے اٹھا۔ ساقی
کی عنبریں زلفوں کا سلسلہ سنداً ملا۔ عشق نے تلوار کے گھاٹ
اتارا۔ اور کسی کافر ادا کی ترچھی نگاہ اور بانکی چتون نے ایک
سیدھے سادے مسلمان کا کام تمام کر دیا۔ خاکسار کو شوق شاعری
کیوں نہ ہوتا۔ مرآۃ الخیال (یعنی دیوان اوّل) اور آئینۂ کمال
یعنی دیوان دوم لکھنا تھا۔ نیز مثنوی مولانا روم کا اردو میں ترجمہ
نظم کرنا تھا۔۔۔ اس شاعری کا ازلی نتیجہ تھا۔ الحمد للہ یہ منصوبہ
پورا ہو گیا"

کتاب مرقوم جلد اول ص ۳۱۲

مولانا عبدالرحمٰن راسخ اعلیٰ درجہ کے فصیح و بلیغ شاعر تھے۔ آپ کے
کلام سے آپ کی شوخی طبع، ظرافت، جدت پسندی، بلند پروازی، بندش مضمون
تلاش الفاظ مانوس، برجستگی کلام اور شستگی زبان کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے۔

کلام راسخؔ ملاحظہ ہو۔

عشقِ راسخؔ سے زمانے میں نہیں ہے بہتر
کوئی مشرب، کوئی ملت، کوئی مذہب یارب

حسینوں کے گلی کوچوں سے میں ہرگز نہیں ٹلتا
کہیں نکلی ہوئی جان ہوں، کہیں آیا ہوا دل ہوں

چین لینے نہ دیا عشق بتاں نے راسخؔ
عمر بھر روگ رہا، عمر بھر آزار رہا

عشق مژگاں نے مجھے خون رُلایا راسخؔ
خار ہیں دل میں مرے لختِ جگر خاروں میں

راسخؔ کی فاقہ مستی سے اللہ کی پناہ.....
کھاتا ہے سوکھے ٹکڑے بھگو کر شراب میں

چھایا ہوا ہے آنکھوں میں راسخؔ خمار سا
گزری ہے میکدے میں مقرر تمام رات

وہ رند ہوں، ہوتی ہیں نمازیں میرے پیچھے
بچھتا ہے شب و روز مصلیٰ میرے آگے

وہ تر دامن ہوں واعظ، پاک دامن جسکو کہتے ہیں
نمازیں پڑھتے رہتے ہیں فرشتے میرے دامن پر

یاالٰہی حشر میں رسوا نہ ہوں
کہتے ہیں راسخ کی شہرت ہے بہت

وہی راسخ تو ہیں کل تک جو بتخانے کے درباں تھے
بنے بیٹھے ہیں حضرت چار دن سے دیں پناہوں میں

بعد مردن مجھ کو رد کر حسرتیں
کہہ رہی ہیں مر چلے کیا کر چلے
سچ تو ہے راسخ سفر تھی زندگی
شکر ہے مرکر ہم اپنے گھر چلے

تلامذہ

مولانا راسخ کے نمایاں شاگرد سحبان الہند مولانا احمد سعید فقیر دہلوی تھے۔ مولانا احمد سعید صاحب فقیر دہلوی مولانا راسخ مرحوم سے اصلاح سخن لیتے تھے اور مولانا احمد سعید صاحب کو مولانا عبدالرحمٰن راسخ کے خاندان سے جذباتی تعلق تھا۔ موصوف اپنی تقریروں اور واعظوں میں بھی مولانا راسخ کے اشعار پڑھتے رہتے تھے۔ مولانا احمد سعید صاحب بھی ایک بہترین شاعر تھے۔

اردو صحافت

مولانا عبدالرحمٰن راسخ صاحب اپنے عہد کے ممتاز عالم دین ہونے کے ساتھ بالغ نظر اور ایماندار صحافی بھی تھے۔ اردو صحافت اپنے محسنوں کو یاد نہیں رکھتی ہے۔ لیکن آج مجھے یہ کہنے میں کوئی تامل نہیں ہے کہ اگر مولانا ابوالکلام آزادؒ مولانا ظفر علی خانؒ، شورش کاشمیریؒ، مولانا عبدالمجید سالکؒ، غلام رسول مہر مولانا محمد علی جوہرؒ، مولانا عثمان فارقلیطؒ، اور مولانا عبدالباقیؒ نے اردو صحافت کو بہت کچھ دیا تو مولانا عبدالرحمٰن راسخ نے بھی ایک نیا رنگ اور نرالہ انداز اور سب سے بڑھ کر ایک مذہبی مزاج دیا تھا۔۔۔۔

آپ "دہلی پنچ" "افضل الاخبار" "مذاق سخن" اور "زبان دہلی" جیسے موقر جرائد و مجلات کے کامیاب مدیر رہے۔ اور مولانا کی ادارت میں یہ تمام جرائد مقبول عوام و خواص رہے۔

وضع و قطع

مولانا راسخ سادہ مزاج، تصنع و تکلف سے کوسوں دور بھاگنے والے انسان تھے۔ آپ بناوٹ اور کر و فر کو ناپسند کرتے تھے اور ہمیشہ معمولی لباس میں ملبوس رہتے تھے۔ اکثر غور و فکر میں ڈوبے رہتے تھے۔ لکھنا، پڑھنا اور غور و فکر کرنا ہی آپ کا شغل خاص تھا۔ آپ نے اگرچہ سیاسی زندگی کبھی اختیار نہیں کی مگر انگریز دشمنی میں آپ ہمیشہ نمایاں اور ممتاز رہے۔

وفات

مولانا راسخ دہلوی ۱۳۲۵ھ میں اکتالیس سال کی عمر میں راہی ملک عدم ہوئے اور اپنے والد ماجد کے قریب ہی مہندیان میں آرام فرما ہیں۔ آپ کی قبر جامعہ رحیمیہ کی مسجد کے صحن سے تقریباً ۱۲ میٹر کے فاصلے پر پورب میں واقع ہے۔

مفتی محمد ابراہیم واعظ

مفتی محمد ابراہیم دہلویؒ کا شمار ہندوستان کے جلیل القدر علماء اور فقہاء میں ہوتا ہے۔وہ اپنے والد ماجد مولانا محمد حسین فقیر دہلویؒ کی طرح جامع العلوم والفنون عالم دین تھے۔

وعظ وارشاد

مفتی محمد ابراہیم دہلویؒ دلی کے مشہور واعظ اور شیوا بیاں خطیب تھے۔ آپ ذکر ووعظ میں بے نظیر تھے جس وقت آپ وعظ فرماتے تھے کیا مجال کہ سامعین میں سے ایک فرد بھی اپنی جگہ سے ہلتا۔بسا اوقات بعض لوگوں کے سر پر بوجھ بھی ہوتا تھا تو بھی سننے کے لئے کھڑے ہو جاتے تھے۔آپ کی مجلس وعظ میں بلا امتیاز غریب و امیر سب ہی شریک ہوتے اور اپنے ایمان و یقین کو مضبوط کرتے۔

مناظرہ

مولانا مفتی محمد ابراہیم ایک باشعور اور باہوش مناظر تھے۔ آپ نے عیسائیوں اور آریہ سماجیوں سے خوب جم کر مناظرہ کیا اور اپنی قوت استدلال اور وسعت معلومات کی بنا پر ان کو متاثر اور مرعوب کیا اور ان کے اوپر اسلام کی حقانیت ثابت کی۔

طب روحانی

مفتی محمد ابراہیم مرحوم ایک بہترین مصنف بھی تھے۔ آپ کی مشہور تصنیف "طب روحانی" ہے جو عوام و خواص میں بہت ہی مقبول ہے۔ آپ کی دوسری اہم تصنیفات بھی ہیں۔ لیکن وہ آج کل نایاب ہیں۔

فقہی ذوق

مفتی محمد ابراہیم دہلوی ایک بلند پایہ مفتی اور فقیہہ تھے مفتی صاحب فتاوی نویسی میں ید طولی رکھتے تھے۔ آپ کی فقہی بصیرت کو بڑے بڑے معاصر علمار نے تسلیم کیا ہے۔ آپ کے قلم سے بے شمار فتاوی نکلے ہیں۔ بعض فتاوی راقم الحروف کی نظر سے بھی گزرے ہیں۔ ان قیمتی فتاوی سے آپ کی بے پناہ فقہی صلاحیت کا اندازہ ہوتا ہے۔

وفات

مولانا مفتی محمد ابراہیم دہلوی ۴ ر ذی الحجہ ۳۸ ھ کو داعی اجل کو لبیک کہا۔ اور آپ شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ اور شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کے پائین میں دفن

ہوئے۔ آپ کی قبر پر کوئی کتبہ نہیں ہے صرف مسجد کی دیوار پر "مولانا مفتی محمد ابراہیم" لکھا ہوا تھا اب وہ بھی مٹ گیا ہے۔

مفتی محمد ابراہیم صاحب کے انتقال پر آپ کے برادرِ محترم مولانا محمد اسحٰق مرحوم نے مرثیہ لکھا ـــــ مرثیہ کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

مرثیہ

ساری محفل ہے مگر سردارِ محفل کا نہیں
طالب صادق ہیں سب مطلوب کا جلوہ نہیں

آج اس ممبر پہ کیونکر لا بٹھائیں تم کو ہم
کوئی پہلو ہم کو بس ایسا نظر آتا نہیں

اے خلیل اللہ کے ہم نام اے پیارے اخی
آپ کے بھائی کا آنسو ہے کہ وہ تھمتا نہیں

یہ درو دیوار، یہ ممبر، یہ شاہین مدرسہ
چھوڑ کر رخصت ہوئے یہ آپکا تھا یا نہیں

عمرِ وہ توحید ربی میں گزاری آپ نے
آپ کے پیچھے ہمیں کوئی نظر آتا نہیں

آہ ابراہیم کیا شئے تھی کہ ہم سے چھن گئی
دل تڑپتا ہے تمہارے واسطے کس کا نہیں

آپ کا اسحاق چھوٹا بھائی روتا ہے کھڑا
آپ کا چہرہ کہیں کسی کو نظر آتا نہیں

ڈاکٹر سید محمود

ڈاکٹر سید محمود کا شمار آزادی وطن کے ان مجاہد ڈاکٹروں، انجنیروں، وکیلوں اور بیرسٹروں میں ہوتا ہے جنھوں نے اپنی عیش و نشاط کی زندگی تج کر قید و بند کی صعوبتیں اور اذیتیں برداشت کیں۔

ولادت اور تعلیم

ڈاکٹر سید محمود صاحب کی ولادت ۱۸۸۹ء میں سید پور بھیتری ضلع غازی پور میں ہوئی، آپ کا خاندان علمی اعتبار سے ممتاز مقام کا حامل تھا۔ آپ کے والد ایک نیک سیرت بزرگ اور اعلی تعلیم یافتہ انسان تھے۔ سلوک و طریقت کے جرعہ کش تھے۔

ڈاکٹر سید محمود صاحب کے بچپن کا زمانہ جونپور میں گزرا۔ انھوں نے دینی تعلیم مدرسہ امامیہ حنفیہ جونپور میں جسٹس سر شاہ محمد سلیمان کے ساتھ مولانا محمد ہادی حسن مرحوم کی نگرانی میں حاصل کی۔ دینی تعلیم کے حصول کے بعد آپ ۱۹۰۷ء میں محمڈن کالج علی گڈھ میں داخل ہوئے۔ آپ کے رفقائے درس میں سید راس مسعود، تصدق حسین خان شیروانی، عبدالرحمن بجنوری، سید

حسین شہید سہروردی اور سیف الدین کچلو تھے۔

ڈاکٹر سید محمود صاحب زمانہ طالب علمی سے انقلابی رجحان کے مالک تھے۔ علی گڈھ میں آپ اپنی سیاسی سرگرمیوں کی بنا پر محمود القوم سے مشہور تھے۔

ڈاکٹر صاحب ۱۹۰۸ء لندن گئے اور کیمبرج سے بیرسٹری کی سند حاصل کی پھر وہاں سے ایک جرمن پروفیسر کے آمادہ کرنے پر جرمنی آگئے اور جرمنی سے تاریخ میں ڈاکٹریٹ کی۔ آپ کا موضوع "مغلوں کا سیاسی نظم ونسق" تھا۔

جرمنی میں ہی آپ کی ملاقات مہاتما گاندھی سے ہوئی تھی جو ساؤتھ افریقہ سے آئے تھے۔ پنڈت نہرو بھی اس وقت کیمبرج میں تھے۔

مشہور بزرگ صحافی شاہ محمد عثمانی تحریر فرماتے ہیں کہ:

"ڈاکٹر صاحب گیا (بہار) آئے تو انھوں نے ایک قصہ سنایا کہ وہ جرمنی تعلیم کے لئے گئے ہوئے تھے۔ ایک پروفیسر نے یہ جان کر کہ وہ ہندوستانی ہیں۔ ہندوستان کے ابتدائی دور کی تاریخ پر گفتگو کی۔ ڈاکٹر صاحب تاریخ کے طالب علم تھے۔ لیکن قدیم ہندوستان کی تاریخ سے انکو پوری واقفیت نہ تھی، اور پروفیسر کو قدیم ہندوستان کی کافی واقفیت تھی۔ اس لئے وہ کوئی جواب نہ دے سکے۔ پروفیسر نے ان سے کہا کہ تم ہندوستانی ہو اور ہندوستان کی تاریخ سے واقف نہیں۔ اس جملہ پر وہ شرمندہ ہو گئے۔

ڈاکٹر صاحب کہتے تھے کہ نہ مسلمان ہندو کی تاریخ سے واقف ہیں اور نہ ہندو مسلم عہد کی۔ دونوں ایک ملک میں رہ کر ایک دوسرے سے ناواقف ہیں۔ اسی ناواقفیت کی وجہ سے انگریزوں

کو اس کا موقع ملا کہ دہ ہندوستان کی تاریخ غلط روپ میں پیش کریں اور دونوں فرقوں کو باہم لڑائیں۔"

ٹوٹے ہوئے تارے ص۱۸۳

ڈاکٹر صاحب ۱۹۱۲ء میں جرمنی سے ہندوستان واپس آگئے۔ اور بانکی پور بہار میں مقیم ہوگئے اور پریکٹس شروع کردی۔ اور آٹھ نو سال جم کر وکالت کی۔ پھر جنگ آزادی میں کود پڑے!

جدوجہد آزادی

ڈاکٹر سید محمود صاحب ہندوستان کے جلیل القدر مجاہد آزادی تھے انھوں نے وطن کو غیر ملکی پنجۂ استبداد سے چھڑانے کے لئے قید و بند کی صعوبتوں کو خندہ پیشانی کے ساتھ لبیک کہا اور ہر قسم کی جانی ومالی قربانیاں پیش کیں حقیقت تو یہ ہے کہ آپ کی زندگی کا زیادہ حصہ قید و بند کی نذر ہوگیا ؎

یوں بسر کی زندگی ہم نے اسیری میں جگر
ہر طریقہ داخلِ آدابِ زنداں ہو گیا

لیکن یہ فخر کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ آپ لیلائے آزادی سے ہم آغوش ہونے کے بعد لیلائے آزادی کے گیسو و زلف کے اسیر نہیں ہوئے بلکہ ملکی استحکام اور قومی فلاح وبہبود کی خاطر اپنی جدوجہد جاری رکھی جو آپ کا اصل مشن تھا۔

کانگریس سے تعلق

ڈاکٹر سید محمود ایک نیشنلسٹ مسلمان قائد تھے۔ آپ مدتوں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے سکریٹری اور کانگریس پارٹی کے اساسی رکن اور صوبہ بہار کے تمام معاملات

کے انچارج رہے موصوف بہار کے وزارتوں میں مختلف محکموں کے وزیر کی حیثیت سے ایک مدت تک خدمات انجام دیتے رہے اور ۱۹۵۴ء سے ۱۹۵۷ء تک ہندوستان کی وزارت خارجہ کے سربراہ کی حیثیت سے ہندوستان اور عالم اسلام کے تعلقات کو ٹھوس اور حقیقی بنیادوں پر مضبوط اور مربوط بنانے کی مہم میں بڑا حصہ لیا۔

وزیراعلیٰ

ڈاکٹر سید محمود کا شمار مہاتما گاندھی، مولانا ابوالکلام آزاد، پنڈت جواہر لال نہرو، نیتاجی سبھاش چندر بوس، مولانا محمد علی جوہر اور مولانا مظہر الحق جیسے چوٹی کے لیڈروں میں ہوتا تھا۔

یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ آزادی وطن کے بعد کانگریسی حلقہ وسعت نظری اور بلند ظرفی کا مظاہرہ کرتا تو ڈاکٹر سید محمود صوبہ بہار کے وزیراعلیٰ ہوتے لیکن کانگریس پارٹی ابتداء ہی سے ذات پات کی بنیاد پر مناصب تقسیم کرتی رہی ہے۔ لہٰذا محض ذات پات کی بنیاد پر ڈاکٹر سید محمود صاحب کو نظر انداز کرکے شری کرشن سنہا کو بہار کا وزیراعلیٰ بنایا گیا۔

مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد رحمۃ اللہ علیہ نے اس غلط نظریہ اور غلط انتخاب کے خلاف آواز حق بلند کی۔ جس کی وجہ سے ایوان سلطنت میں زلزلہ آگیا اور بڑے بڑے کانگریسی لیڈر بھی سراسیمہ ہوگئے بالآخر راجندر پرشاد نے ڈاکٹر سید محمود صاحب سے یہ بیان دلوایا کہ:

"انھوں (سید محمود) نے خود وزیراعلیٰ بننا نہیں چاہا"

جس کی وجہ سے وقتی طور پر مسئلہ دب تو گیا۔ لیکن مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم جیسے سیکولر اور ٹھنڈا دماغ قائد کو بھی اتنا سخت لکھنا پڑا۔

مولانا آزاد" انڈیا ونس فریڈم" میں لکھتے ہیں کہ:

"کانگریس نے نریمان کو صوبہ بمبئی کا اور ڈاکٹر سید محمود کو بہار کا وزیر اعلیٰ اس لئے نہیں بنایا کیونکہ وہ ہندو نہیں تھے۔" مولانا لکھتے ہیں" بمبئی میں مسٹر نریمان کانگریس کے متفقہ لیڈر تھے جب صوبائی حکومت بنانے کا سوال آیا تو عام توقع یہ تھی کہ اپنی پوزیشن کے مطابق نریمان کو قیادت سونپی جائے گی۔ اس کا مطلب یہ ہوتا کہ ایک پارسی کو وزیر اعلیٰ بنایا جاتا جبکہ کانگریس اسمبلی ممبروں کی اکثریت ہندو تھی۔ سردار پٹیل اور ان کے ساتھی اس صورتحال کو تسلیم کرنے کو تیار نہیں تھے اور محسوس کرتے تھے کہ یہ کانگریس کے ہندو حمائیتوں کے ساتھ زیادتی ہوگی۔ نتیجہ کے طور پر بی۔جی کھیر کو آگے لایا گیا اور بمبئی میں کانگریس اسمبلی پارٹی کا لیڈر منتخب کیا گیا۔"

مولانا آگے لکھتے ہیں کہ" ہم سب جانتے تھے کہ ایسا سردار پٹیل کے فرقہ وارانہ مطالبات کو پورا کرنے کے لئے کیا گیا۔ اس سے بیچارے نریمان کا دل ٹوٹ گیا اور ان کی سیاسی زندگی کا خاتمہ ہو گیا۔"

بہار کے بارے میں مولانا آزاد غیر مطبوعہ حصہ میں لکھتے ہیں:" ایسی ہی صورتحال بہار میں پیدا ہو گئی۔ جب الیکشن ہوئے تو ڈاکٹر سید محمود بہار کے چوٹی کے لیڈر تھے۔ یہ آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے جنرل سکریٹری بھی تھے اور اس طرح قومی سطح و صوبائی سطح کے لیڈر تھے۔ جب کانگریس کو واضح اکثریت مل گئی تو یہ مان لیا گیا کہ ڈاکٹر سید محمود کو پارٹی کا لیڈر اور صوبے کا پہلا وزیر اعلیٰ منتخب کیا جائے گا۔ لیکن شری کرشن سنہا اور اے۔ این سنہا جو قومی اسمبلی

کے ممبر تھے۔ انھیں واپس بلا کر وزیر اعلیٰ کی کرسی کے لئے تیار کیا گیا۔ بہار میں راجندر پرشاد نے وہی کردار نبھایا جو بمبئی میں سردار پٹیل نے نبھایا تھا۔ بمبئی اور بہار میں صرف اتنا فرق تھا کہ جب شری کرشن سنہا نے حکومت بنائی تو کابینہ میں ڈاکٹر سید محمود کو بھی شامل کیا گیا۔"

مولانا آزاد غیر مطبوعہ حصہ میں مزید لکھتے ہیں۔ "ان دونوں واقعات نے میرے اوپر بڑا اثر چھوڑا جب میں ان واقعات پر غور کرتا ہوں تو محسوس کرتا ہوں کہ کانگریس اپنے نظریات پر پوری نہیں اتری۔ مجھے افسوس کے ساتھ اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ کانگریس کی قوم پرستی ایسی سطح پر نہیں پہنچی تھی جہاں وہ فرقہ وارانہ مصلحتوں کو نظر انداز کر کے لیڈروں کو ان کے معیار پر منتخب کرتی نہ کہ اقلیت اور اکثریت کے سوال پر۔"

ہفت روزہ نئی دنیا ۲۵ نومبر ۸۸ء

دینی مزاج

ڈاکٹر سید محمود صاحب ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود ان کی طبیعت میں مشرقی طرز کی سادگی اور تواضع تھی۔ آپ کا مذہبی شعور بھی بڑا پختہ تھا۔ آپ جہاں ممتاز کانگریسی لیڈر تھے۔ وہیں ایک پختہ عقیدہ مسلمان بھی تھے۔ موصوف کو اسلام اور مسلمانوں کے مسائل سے بڑی دلچسپی تھی اور قومی و ملی کام کرنے والوں کی حوصلہ افزائی بھی فرماتے تھے۔ حتی المقدور تعاون بھی کرتے تھے۔ آزاد کانفرنس میں شرکت اور کل ہند مسلم کنونشن کی صدارت آپ کے مذہبی فکر و شعور کی پختگی کی نشانی ہے۔ آپ نے کانگریسی

حلقوں میں معتوب ہونا گوارا فرمالیا لیکن قومی و ملی وفاداری سے دست بردار نہیں ہوئے۔

آزاد کانفرنس

۱۹۴۷ء میں آزاد کانفرنس کے انعقاد میں جن مسلم لیڈروں، رہنماؤں نے امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کا بھرپور تعاون دیا تھا۔ ان میں سرفہرست مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب، سحبان الہند مولانا احمد سعید دہلوی، ڈاکٹر سید حسین، پروفیسر ہمایون کبیر، ڈاکٹر اشرف اور ڈاکٹر سید محمود صاحب تھے۔

ڈاکٹر صاحب تو آزاد کانفرنس کے روح رواں تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے کانفرنس میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا کہ:

"ہندوستان ہمارا وطن ہے۔ ہم اس کے وفادار، خیر خواہ ہیں لیکن ہندوؤں کو ہم سے وفاداری کا مطالبہ کرنے کا حق نہیں ہے وہ ہم سے اعلیٰ ہندوستانی نہیں ہیں۔ ہماری ہی طرح ہندوستانی ہیں وہ ہم سے مطالبہ کریں تو ہم کو چاہیئے کہ کہہ دیں کہ جاؤ ہم وفادار نہیں ہیں جو کرنا ہے کرلو۔"

ٹوٹے ہوئے تارے ص۱۸۰

فرقہ وارانہ فساد

ڈاکٹر سید محمود صاحب دبنگ، نڈر اور بے باک آدمی تھے۔ کسی کو جلتے مرتے اور پٹتے دیکھکر خاموش تماشائی بنے نہیں رہ سکتے تھے۔ وطن کے وفادار تھے۔ لیکن کسی قوم کے ناحق طرفدار نہیں تھے۔ جب راوڑکیلا اور جمشید پور

میں خوفناک فسادات اور اضطرابات ہوئے تو ڈاکٹر صاحب بے چین ہو گئے اور مظلوں کو بچانے کے لئے بھاگ دوڑ کرنے لگے۔ ڈاکٹر صاحب نے بیان دیا کہ:

"ہندو مسلم منافرت دور کرنے میں ہندو قیادت ناکام رہی ہے۔
اس لئے اب یہ کام مسلمانوں کو کرنا چاہیئے۔"

ڈاکٹر صاحب نے اسی مقصد کی خاطر مسلم مجلس مشاورت کی بنیاد ڈالی اور پورے ہندوستان کا دورہ کیا۔ اور لوگوں میں اتحاد و یگانگت کی فضا قائم کی۔ ڈاکٹر صاحب اور دوسرے قائدین کے ملک گیر دوروں سے ہندو مسلم اتحاد پر اچھا اثر پڑا۔

تقسیم ملک اور ڈاکٹر صاحب کی بے چینی

ڈاکٹر سید محمود کا شمار تقسیم ملک کے شدید مخالفوں میں ہوتا ہے۔ وہ کسی قیمت پر تقسیم ملک کے لئے تیار نہیں تھے۔ آپ نے اس وقت بھی بٹوارہ کی مخالفت کی جبکہ مہاتما گاندھی اور جواہر لال نہرو بھی تقسیم کے حامی ہو چکے تھے۔ اور ملک کو تباہ کرنے والی طاقتوں کے سامنے سپر ڈال چکے تھے۔

مہاتما گاندھی ۱۹۴۷ء میں پٹنہ آئے اور ڈاکٹر سید محمود کی کوٹھی پر ٹھہرے جب گاندھی جی پٹنہ سے دہلی روانہ ہونے لگے تو ڈاکٹر سید محمود صاحب سے کہا کہ:

"تمہارے دوستوں نے دہلی میں پارٹیشن طے کر لیا ہے تم کیا کرو گے؟"
سید محمود نے اس وقت جواب دیا تھا کہ میں اس کے خلاف ہوں اور اگرچہ ایک ہاری جانے والی جنگ لڑنے جا رہا ہوں لیکن اچھی ٹکر لوں گا۔ مہاتما جی نے اس وقت کہا تھا کہ مسلمانوں کو پاکستان دو ٹکڑوں میں ملے گا۔ وہ شاید مان جائیں لیکن وہ تباہ ہو جائیں

گے۔ گاندھی جی نے وعدہ کیا کہ وہ دہلی سے واپس آکر ان کے گھر پر بیٹھ کر پلان بنائیں گے کہ اس صورت حال کا کس طرح مقابلہ کیا جائے۔ الغرض گاندھی جی پٹنہ سے دہلی گئے اور سید محمود کے الفاظ میں چار پانچ دن ڈٹ کر مقابلہ کیا مگر پھر چپ ہو گئے مولانا آزاد کے لبوں پر بھی مہر سکوت لگ گئی چند دنوں کے بعد سید محمود دہلی گئے تو انھوں نے گاندھی جی سے سوال کیا کہ آپ نے تقسیم کو کیوں مان لیا۔ گاندھی جی نے جواب دیا کہ "مجھے الٹی میٹم دیا گیا کہ تم خود گورنمنٹ چلاؤ تو میں کیسے یہ کر سکتا ہوں۔ میں نئی لیڈر شپ پیدا کر سکتا ہوں مگر اس کے لئے وقت درکار ہے۔"

گاندھی جی کا طریقہ یہ تھا کہ وہ پہلے دوستوں کو سمجھاتے تھے جب لوگ نہیں مانتے تھے تو وہ خاموش ہو جاتے تھے اور لوگوں پر معاملات کو چھوڑ دیتے تھے کہ وہ خود اسے حل کریں اور تجربہ حاصل کریں۔"

نامورانِ علی گڑھ ص ۱۲۹

اس اقتباس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے۔ مہاتما گاندھی اور مولانا آزاد جیسے مضبوط و مستحکم قائدین بھی یاد مخالفت کے مقابلے سے عاجز اور بے بس ہو گئے تھے۔

سردار پٹیل اور جواہر لال نہرو تو ابتدا ہی مرحلہ میں تقسیم ملک کے پر جوش حامی ہو گئے تھے۔ تعجب تو اس بات پر ہے کہ مہاتما گاندھی بھی فرقہ پرستی کی بہتی گنگا جمنا میں ہاتھ دھونے لگے۔ ڈاکٹر صاحب جیسا نیشنلسٹ لیڈر بھی مسٹر جناح کو تقسیم ملک کا ذمہ دار قرار نہیں دیتا ہے۔

ڈاکٹر سید عبدالباری مشہور صحافی اور جی ایس پی جی کالج سلطان پور میں شعبہ اردو کے صدر رہیں۔ موصوف نے ڈاکٹر صاحب سے بڑا اہم انٹرویو لیا تھا۔ جس سے تقسیم ملک کے مسئلے پر بڑی اچھی روشنی پڑتی ہے اور یہاں ایک نیا رخ سامنے آتا ہے۔ یہاں پر انٹرویو کے بعض اجزاء کو نقل کیا جاتا ہے ملاحظہ فرمائیں۔

"انھوں (ڈاکٹر سید محمود صاحب) نے میرے ایک سوال پر کہ آپ تقسیم ملک کا اصل ذمہ دار کس کو گردانتے ہیں۔ فرمایا تھا کہ:
"میرا خیال ہے مسلم لیگ یا جناح نے نہیں بلکہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن اور چرچل نے پاکستان بننے کی راہ ہموار کی۔
ماؤنٹ بیٹن جب ہندوستان آئے تو انھوں نے حکمت عملی سے ہندوؤں میں شہرت و مقبولیت حاصل کر لی۔ مگر یہی وہ شخص ہے جس نے پنجاب و بنگال کی تقسیم کرائی۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے ہی تو کانگریس کے کچھ لیڈروں کو سمجھا بجھا کر پاکستان دینے پر راضی کیا اور ان لیڈروں نے گاندھی کو راضی کرنے کی کوشش کی۔ جناح شروع ہی میں پاکستان کو موجودہ صورت میں لینے کے سخت خلاف تھے۔ انھوں نے اپنی مشہور اسپیچ میں کہا تھا (To Tak Truncated Pakistan
یعنی میں نے کٹے پھٹے پاکستان کو لینے سے انکار کر دیا۔
مگر بعد میں وہ بھی جھک گئے۔ ڈاکٹر محمود کا خیال تھا کہ جناح اچھے مدبر و سیاستداں نہیں تھے۔ لیکن وکیل بہت اچھے تھے مسلمانوں کے کیس کو وکیل کی حیثیت سے لے کر لڑے اور مدبر کی حیثیت سے ان کے معاملات کی پیروی نہیں کی چنانچہ تقسیم

کے بعد جو بلوہ، فساد اور قتل و غارت گری منظر عام پر آئی اس سے وہ بہت متاثر ہوئے اور ان خبروں کو سن کر تاسف کے ساتھ کہا کرتے تھے کہ مجھے کیا خبر تھی کہ آزادی کے بعد یہ مشکل پیدا ہوگی۔

دراصل جناح خود تقسیم نہیں چاہتے تھے بلکہ وہ کانگریس کے ساتھ عدم تعاون کی سخت روش اپنا کر مسلمانوں کے لئے زیادہ سے زیادہ مراعات کا سودا کرنا چاہتے تھے۔ دھیرے دھیرے کانگریسی لیڈروں کی روش کے سبب وہ اپنے مطالبہ پاکستان میں سخت سے سخت ہوتے گئے۔

میں اس زمانہ میں بانکی پور سے دہلی آیا ہوا تھا۔ تقسیم ملک کی خبریں زوروں پر گرم تھیں۔ میں نے اس صورت حال کی سخت مخالفت کی مگر بعد میں یہ معلوم کر کے حیران رہ گیا کہ جواہر لال بھی اس پر راضی ہو گئے ہیں۔

کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ ہم لوگ جیل سے تھک گئے تھے۔ اب اور دن وہاں زندگی گزارنا نہیں چاہتے تھے یا کچھ لوگ حکومت کا مزا چکھ چکے تھے۔ اس لئے بعجلت تقسیم پر راضی ہو گئے مگر میرے خیال میں جواہر لال نہرو جیسے آدمی کو اس پر راضی ہونے کے لئے کوئی اور طاقتور بات ہونی چاہیئے! اس لئے کہ ان کا بدل جانا حیرت انگیز ہے چنانچہ میں یہ نتیجہ نکالنے پر مجبور ہوں کہ ماؤنٹ بیٹن نے ان جیسے لوگوں کو سمجھایا کہ پاکستان تو ختم ہو ہی جائیگا اس لئے کہ جو فوج وہ لے جائیں گے وہ ملک کو باقی رکھنے کیلئے اور جو ملک وہ لے جائیں گے وہ فوج باقی رکھنے کے لئے

کافی نہ ہوگا۔"

ماہنامہ دوام ٹانڈہ مئی ۱۹۷۰ء

وفات

ڈاکٹر سید محمود صاحب مظلوم لیڈر تھے وہ ۸۲ سال تک اسلامی درد، مسلمانوں کی بہبودی، ترقی اور خوشحالی کے خواب اپنے ذہن میں بسائے مسلمانوں میں گھومتے رہے لیکن مسلمانوں نے انھیں دکھ، تکلیف اور ذہنی اذیتوں کے سوا کچھ نہ دیا۔ مگر اس مردِ مجاہد نے کبھی شکایت نہیں کی اور کبھی فریاد دل اور گلہ مندیوں کی ضرورت نہیں سمجھی وہ ایک عظیم اور لامحدود سمندر کی طرح خاموش اور اپنی تہہ کے بیش بہا خزانوں کے تصور سے مست اور مطمئن رہے۔ خاموشی اور اعلیٰ ظرفی کے ساتھ اپنا فرض نباہتے ہوئے دارفانی سے دارجاویدانی کی طرف کوچ کر گئے اور شاہ ولی اللہؒ کے پہلو میں آسودہ راحت ہو گئے۔

مولانا حفظ الرحمنؒ

مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی سابق ناظم اعلیٰ جمیعۃ علماء ہند مولانا سید انور شاہ کشمیریؒ کے نامور تلامذہ میں تھے۔ موصوف اپنی گرانقدر علمی و سیاسی خدمات کی بنا پر ہندوستان کے گنے چنے علماء اور سیاسی قائدین میں شمار کئے جاتے تھے۔

ولادت اور تعلیم

مولانا حفظ الرحمٰن ۱۰ر جنوری ۱۹۰۱ء بمطابق ۱۳۱۸ھ میں مشہور قصبہ سیوہار محلہ مولو میان ضلع بجنور میں پیدا ہوئے۔

آپ کا اصل نام معز الدین، تاریخی اسم حفظ الرحمن، کنیت ابوالقاسم اور لقب مجاہد ملت تھا۔ آپ کے والد ماجد کا اسم گرامی الحاج مولوی شمس الدین صدیقی تھا۔ مولوی شمس الدین صدیقی نہایت صالح اور نیک سیرت خاندانی بزرگ تھے۔ اور علماء حق کے قدر دان و گرویدہ!

مولانا حفظ الرحمن کی مکتبی تعلیم و تربیت رواج زمانہ کے مطابق گھر کے

بزرگوں کے زیر سایہ ہوئی اور موجودہ درس نظامی کی تعلیم و تکمیل جامعہ قاسمیہ مرادآباد اور مدرسہ فیض عام سیوہارہ میں ہوئی۔

مجاہد ملت نے سند حدیث اور علم حدیث کی خاطر دارالعلوم دیوبند کا سفر کیا۔ حسن اتفاق سے اس وقت دارالعلوم دیوبند انور شاہ صاحب کشمیری کے نغموں سے گونج رہا تھا۔ شاہ صاحب کے علاوہ مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی، مولانا مفتی عزیز الرحمن عثمانی، حافظ محمد احمد، مولانا اصغر حسین اور مولانا شبیر احمد عثمانی جیسے یگانہ عصر علماء و مشائخ مسند درس و تدریس پر رونق افروز تھے۔

مولانا حفظ الرحمن صاحب شاہ صاحب کے درس حدیث میں ایک متلاشی حدیث کی حیثیت سے داخل ہوئے تھے۔ موصوف شاہ صاحب جیسے بحر زخار کے علوم و فنون سے مستفیض ہونے لگے۔ اور بہت جلد شاہ صاحب کی نگاہوں میں آگئے۔ اب تو مولانا حفظ الرحمٰن کا شمار شاہ صاحب کے مخصوص تلامذہ میں ہونے لگا۔

درس و تدریس

مولانا حفظ الرحمٰن مجاہد ملت پر وہی تحقیقی و تدریسی رنگ تھا۔ جو مولانا انور شاہ صاحب کے شاگردوں کا تحقیقی و تدریسی رنگ ہوا کرتا تھا۔

مولانا حفظ الرحمن صاحب رسمی تعلیم سے فراغت کے بعد مدرسہ اسلامیہ کلکتہ، جامعہ اسلامیہ ڈابھیل اور دارالعلوم دیوبند جیسے عظیم دینی درسگاہوں میں تدریسی خدمات انجام دیتے رہے۔ موصوف میدان سیاست کیطرح درس و تدریس کے میدان میں بھی نمایاں و ممتاز تھے۔

مولانا سعید احمد اکبرآبادی مرحوم لکھتے ہیں۔

"مولانا حفظ الرحمن صاحب حضرت شاہ صاحب کے ساتھ ڈابھیل آئے اور طبقہ علیا کی کتابوں کا درس دینے لگے۔ طبیعت ایسی رسا اور ذہین پائی تھی کہ یہاں ہر فن کی اونچے درجہ کی کتاب پڑھایا کرتے تھے اور یہ کہنا مشکل تھا کہ انھیں سب سے زیادہ مناسبت کس فن سے ہے۔"

مشہور صحافی مولانا سید ازہر شاہ قیصر مرحوم تحریر فرماتے ہیں کہ:

"حدیث و تفسیر کی اعلیٰ کتابیں ان کے زیر تدریس تھیں اور خاص شفقت و محبت سے پڑھاتے تھے۔ طلبار کی بڑی جماعت ہوتی تھی اور سب اس شیوا بیاں مدرس کی تقریر پر فدا تھے۔"

سیاست

مجاہد ملت میدان تدریس میں اپنے جوہر دکھا رہے تھے اور تشنگان علوم آپ کے فیضان علم سے خوب خوب سیر ہو رہے تھے کہ اچانک ملک کو آپ کی مجاہدانہ سرگرمیوں کی ضرورت پیش آئی اور آپ کے اسلاف کی جمعیۃ علمار ہند نے آپ کو آواز دی تو آپ اس کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے میدان سیاست میں کود پڑے آپ کے میدان سیاست میں آتے ہی ۱۹۳۰ء میں جمعیۃ علمار ہند کا عظیم الشان اجلاس ہوا اس اجلاس میں مفتی اعظم مولانا کفایت اللہ، مولانا محمد علی جوہر، مولانا شوکت علی، مولانا سید عطار اللہ شاہ بخاری اور مولانا حسین احمد مدنی جیسے بلند پایہ قائدین شریک تھے۔ اور تحریک آزادی وطن میں جمعیۃ علمار ہند کے موقف و نظریہ کے تعین کا اہم سوال درپیش تھا۔

مولانا محمد علی جوہرؒ اور مولانا شوکت علیؒ کی رائے کے خلاف مولانا حفظ الرحمن صاحب نے پورے جوش و ولولہ کے ساتھ اپنا نقطۂ نظر واضح فرمایا کہ جمعیۃ علمار

کو آزادی وطن کی راہ میں کھلے بندوں انڈین نیشنل کانگریس کا ساتھ دینا چاہیئے
اور بلا شرط تعاون کرنا چاہیئے۔

مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کی اس تجویز کی سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ نے
پر زور تائید کی اور یہی اجلاس کا متفقہ فیصلہ قرار پایا۔

قید و بند

مجاہد ملت نے جنگ آزادی میں قید و بند کی صعوبتیں و تکلیفیں برداشت
کیں وہ ایک جانباز و جانفروش مجاہد کی طرح انگریزوں سے لڑتے رہے اور
فتحیاب ہوئے۔

مجاہد ملت کی زندگی خدمت خلق سے عبارت ہے۔ لیکن ان کا تاریخی اور
عہد ساز کارنامہ ۱۹۴۷ء کے ہنگاموں اور شورشوں کے بعد شروع ہوتا ہے۔
جبکہ انسان نما درندے اور بھیڑیئے بے بس مسلمانوں پر بڑی بے دردی سے حملہ
آور ہوتے، ان کو تہہ تیغ کرتے حتیٰ کہ ان کے معصوم بچوں کو دیواروں پر مار
مار کر فنا کی گھاٹ اتارتے اور ان کی جوان عورتوں کو اٹھا لیجاتے، ان کی عصمت
دری کرتے، زبردستی ان کو اپنے گھروں میں رکھتے، اور انکے ساتھ انسانیت سوز حرکتیں کرتے

مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰن ——— مولانا انیس الحسن ہاشمی، مولانا فقیہہ الدین
مولانا وحید الدین قاسمی، مولانا عبد الحق قادری سورتی، مولانا محمد عاقل الہ آبادی
محمد احمد ایڈوکیٹ، ڈاکٹر احمد حسن عثمانی، حافظ محمد نسیم پٹن والے، حاجی
حسام الدین، قاضی اکرام اور علی محمد شیر میوات جیسے مخلص رفیقوں اور جان فروش کارکنوں کیساتھ مسلمانوں
کی حفاظت، اجڑے ہوئے مسلمانوں کی آبادیٔ لٹے ہوئے قافلوں کے قدم جمانے
اور اغوا شدہ عورتوں کی بازیابی کے لئے، شب و روز دیوانہ وار جد و جہد فرماتے
اور اس سلسلہ میں کبھی پنڈت جواہر لال اور مولانا آزاد کی کوٹھی پر ہیں تو

کبھی گاندھی کی روبرو داستان درد والم سناتے نظر آتے تھے۔
مشہور صحافی محمد عثمانی تحریر فرماتے ہیں کہ:

"مولانا حفظ الرحمن صاحب نے مجھ سے کہا کہ ایک روز میں نے گاندھی جی سے کہا کہ مسلمانوں کی حفاظت کا نظم اطمینان بخش نہیں ہے کوئی صورت اس کے سوا سمجھ میں نہیں آتی کہ مسلمانوں کو عام ہجرت کا مشورہ دیدیا جائے جیسا کہ پنجاب میں ہوا۔ گاندھی جی نے جواب دیا کہ غیر معمولی حالات میں ہمت کو نہیں چھوڑنا چاہیئے! کام کرتے رہنا چاہیئے۔ کچھ نہ کچھ تو نتیجہ نکلے گا ہی۔
سردار پٹیل گاندھی جی کو سمجھانے گئے جبکہ وہ مرن برت رکھے ہوئے تھے۔ گاندھی جی لیٹے ہوئے تھے اٹھ کر بیٹھے اور بولے تم وہ پٹیل نہیں ہو جس کو میں اتنے زمانہ سے جانتا ہوں"

ٹوٹے ہوئے تارے ص۱۹۸

حق گوئی

مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمن حق گو، صاف گو اور بہادر انسان تھے۔ آپ بولنے پر آتے تو (خواہ پارلیمنٹ میں ہوں یا کسی دینی جلسہ میں) پورے زور کے ساتھ اور مدلل بات کرتے، مخالفین بھی زور استدلال سے ششدر و حیران رہ جاتے اور موافقین بھی واہ واہ کہتے!

سوچیتا کرپلانی ممبر پارلیمنٹ نے جب یہ کہا کہ:

"حکومت مسلمانوں کی پاسداری کرتی ہے تو مولانا حفظ الرحمن نے فوراً غصہ سے بھری ہوئی تقریر کی اور کہا کہ آپ کا تو یہ حال ہے کہ آصف علی گورنر اڑیسہ کے مکان کو گورنمنٹ کسٹڈی میں لے لیا

کہ یہ پاکستانی کا مکان ہے۔
اور ڈاکٹر انصاری جیسے جلیل القدر لیڈر کے مکان کو بحق کسٹوڈین ضبط کیا گیا کہ یہ پاکستانی کا مکان ہے۔ حالانکہ ان کے وارث شوکت اللہ انصاری ترکی میں حکومت کے سفیر ہیں۔"

ٹوٹے ہوئے تارے ص ۱۹۹

جوشِ خطابت

مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب ایک شعلہ بیان مقرر اور ولولہ انگیز خطیب تھے۔ آپ کی زورِ خطابت سے دوست اور دشمن دونوں ہی مرعوب تھے۔ آپ بے پناہ بولتے تھے۔

لال بہادر شاستری نے ٹاؤن ہال کے تعزیتی جلسہ میں کہا تھا۔
"مولانا ابوالکلام آزاد کے بعد گزشتہ ۳۰ / ۴۰ برسوں میں حفظ الرحمٰن سے زیادہ اچھی اور سلجھی ہوئی تقریر کرنے والا میں نے نہیں دیکھا۔"

مشہور صحافی ماہر القادری مرحوم نے لکھا تھا۔
"تقریر و خطابت میں وہ (مولانا حفظ الرحمٰن صاحب) آپ اپنا جواب تھے۔ شعلہ نوا بھی اور شبنم افشاں بھی!
تقریر و خطابت اور ذہانت میں مولانا آزاد سے کم مگر دینی شغف اور ارکان شریعت کی پابندی میں ان سے بڑھ کر۔"

مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کی زور خطابت، قوت بیان اور قوت استدلال کا صحیح تذکرہ کرنے کے لئے، لکھنؤ کانفرنس، انڈین مسلم کنونشن اور پارلیمنٹ کی تقریروں کو ملاحظہ فرمانا ضروری ہے۔

مولانا نے ۱۹۴۷ء میں آزاد کانفرنس میں فرمایا۔

"جو حالات ہمارے سامنے ہیں کہ انسان خود انسان کے خون کا پیاسا ہے۔ ہم نہیں سمجھ سکتے کہ ان کو کن الفاظ سے تعبیر کریں، وحشت اور درندگی کا لفظ کافی نہیں ہے، بلکہ سچ تو یہ ہے کہ وحشت اور درندگی اس حالت سے شرم کر رہی ہے۔

شیر اور بھیڑیئے جو سب سے زیادہ وحشت ناک درندے مانے جاتے ہیں وہ دوسرے جانوروں کا خون چوس کر درندگی کی پیاس بجھاتے ہیں لیکن اپنے بچوں کو وہ بھی نہیں پھاڑتے، یہ حضرت انسان ہی ہیں کہ خود اپنے ہم جنس بچوں اور عورتوں اور کمزور انسانوں کو ذبح کرتے ہوئے نہیں شرماتے"۔

آپ نے مسلمانوں کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا۔

"یہ کیا بزدلی ہے کہ تم در و دیوار سے وحشت زدہ ہو، تم خود اپنے سایہ سے ڈرتے رہتے ہو،

اگر تم کل تک بہادر تھے تو آج بزدل کیوں ہو گئے۔ اسلام اور بزدلی ایک دل میں جمع نہیں ہو سکتے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔ مسلمان سب کچھ ہو سکتا ہے مگر بزدل نہیں ہو سکتا مسلمان حق بات کہنے میں ہمیشہ دلیر ہوتا ہے۔

خوف و ہراس، بزدلی اور نامردی کو دل سے نکال دو یہاں سے عہد کر کے جاؤ کہ ہر ایک ناانصافی کا مقابلہ ڈٹ کر کریں گے۔ بیشک ہم وفادار ہیں، مگر ہم مادر وطن کے وفادار ہیں، وفاداری کے یہ معنی ہرگز نہیں کہ ہم کسی کلکٹر یا کسی سرکاری افسر یا وزیر کے فعل پر کسی قسم کی نکتہ چینی نہیں کر سکتے۔ وہ زمانہ ختم ہو گیا کہ حکام کی چاپلوسی کو

وفاداری کا معیار قرار دیا جاتا تھا۔

تصنیف وتالیف

مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کا خصوصی کمال یہ تھا کہ اتنی ہنگامہ خیز سیاست میں سرگرم ہونے کے باوجود ایک بلند پایہ مصنف اور صاحب طرز ادیب بھی تھے۔ آپ کے قلم سے کچھ ایسی کتابیں منصہ شہود پر آئی ہیں جو تحقیقی وادبی اعتبار سے اپنی نظیر آپ ہیں اور جن کو منصہ شہود پر لانے کے لئے انتہائی یکسوئی اور پرسکون زندگی کی ضرورت ہے۔ حضرت مولانا کی تصنیفات میں

قصص القرآن

قصص القرآن بہت ہی زیادہ خصوصیت اور اہمیت کی حامل ہے ——————
جس کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا مرحوم قدیم عربی ماخذ ومصادر کے ساتھ ساتھ مستشرقین کی جدید تصنیفات وتالیفات کے محاسن اور عیوب سے بھی صرف آگاہ ہی نہیں بلکہ علامہ شبلی نعمانی، مولانا سلیمان ندوی اور سید امیر علی کی طرح ناقد بھی ہیں۔

موصوف اسلام اور اسلامی امور پر مستشرقین کی طرف سے کی گئیں جارحانہ تنقیدوں وتنقیصوں کا اس طرح دندان شکن جواب دیتے ہیں کہ ان کے تمام بے سروپا شکوک وشبہات خود بخود رفع ہوجاتے ہیں۔

راقم الحروف کو زمانہ طالب علمی میں ہی قصص القرآن کے اجمالی مطالعہ کا شرف حاصل ہوگیا تھا اور اس کی صورت یہ ہوئی کہ قصص القرآن مولانا عبدالمعبود صاحب قاسمی سابق استاذ مدرسہ ریاض العلوم ساٹھی کے مطالعہ میں رہتی تھی تو میں کبھی کبھی اس کو الٹ پلٹ کر دیکھ لیا کرتا تھا۔ لیکن اس وقت کی کوئی قابل ذکر بات یاد نہیں بس

ایک نقش ماضی اب بھی ذہن و دماغ پر محفوظ ہے۔ البتہ قیام دارالعلوم دیوبند میں قصص القرآن بالاستعاب دیکھنے کا موقع ملا جس سے راقم الحروف متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔

اسلام کا اقتصادی نظام

اسی طرح اسلام کا اقتصادی نظام میں بھی خداوندانِ ماسکو کے پرفریب نعروں کا پول کھول کر رکھ دیا ہے۔

اسلام کا اقتصادی نظام لکھنے کی اصل وجہ یہ پیش آئی کہ مولانا حفظ الرحمن اور مفتی عتیق الرحمن عثمانی ایک عرصہ تک کلکتہ میں رہے ہیں اور بنگال بھی ہندوستان کا دوسرا روس ہے۔ لہذا وہاں اس قسم کے مسائل اکثر سامنے آتے رہتے تھے اور مولانا مدلل جوابات سے سامعین کو مطمئن کرتے رہتے تھے۔

چنانچہ مولانا شاہ محمد عثمانی لکھتے ہیں۔

کلکتہ میں کمیونسٹوں کا زور بہت زمانہ سے رہا ہے اس لئے سوالات اٹھتے رہتے تھے کہ معاشی مسائل کا حل اسلام میں کیا ہے۔ ہمارے ساتھی مولانا حفظ الرحمن سے پوچھتے تھے۔ مولانا اس کا تشفی بخش جواب دیتے تھے کبھی کبھی فقہ کی کتابیں نکال کر حوالے بھی دکھاتے۔ مولانا سے ہمارے دوستوں نے کہا کہ اردو میں اسلامی نظریہ معیشت پر کوئی کتاب نہیں ہے۔ کیا اچھا ہوتا اس پر آپ کوئی کتاب لکھ دیتے۔ چنانچہ مولانا نے کلکتہ چھوڑنے کے بعد اسلام کا اقتصادی نظام کے نام سے ایک کتاب لکھی اور وہ ندوۃ المصنفین سے شائع ہوئی۔

مولانا مرحوم کی دوسری تصنیفات بھی بہت ہی اہم ہیں اور جو حسب ذیل

ہیں۔

"اخلاق و فلسفۂ اخلاق"، "رسول کریم"، "بلاغ مبین"، حفظ الرحمن لمذہب النعمان"۔

وفات

مولانا حفظ الرحمن کینسر کے موذی و مہلک مرض میں ایک زمانہ سے گرفتار تھے۔ ڈاکٹروں کے مشوروں سے امریکہ گئے لیکن صحت قسمت میں نہ تھی ہندوستان واپس آ گئے۔ ۲۰ راگست ۱۹۶۲ء کو صبح ۴ بجے روحِ بے قرار قفس عنصری سے آزاد ہو گئی اور جسد خاکی کو حضرت شاہ ولی اللہ اور خاندان ولی اللہ کے مزارات سے بالکل متصل دفن کر دیا گیا۔۔۔ رحمۃ اللہ علیہ رحمۃ واسعۃ

محمد اکبر خان

مولانا محمد اکبر خان ہندوستان کی جنگ آزادی کے جان فروش مجاہد اور لیڈر تھے۔ آپ نے برطانوی سامراج کے خلاف زبردست جنگ کی اور قید وبند کی صعوبتیں اور تکلیفیں برداشت کیں اور آزادی وطن کے بعد بھی جلاوطنی کی زندگی گزاری۔

جائے ولادت

مولانا محمد اکبر خان ضلع ہزارہ کے ایک کھاتے پیتے علمی گھرانے کے چشم و چراغ تھے۔ آپ ۱۵ ر مارچ ۱۹۰۲ء میں ضلع ہزارہ میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد کا نام مولوی محمد حسن یفا تھا۔ وہ ایک دیندار اور بلند اخلاق انسان تھے۔

مولانا محمد اکبر خان نے ابتدائی تعلیم وطن بقا ہیں حاصل کی۔ پھر کچھ باشعور ہوئے تو دہلی آئے اور دلی کے قدیم مدرسہ عالیہ فتحپوری میں داخل ہو گئے اور مدرسہ عالیہ فتحپوری کے باصلاحیت اساتذہ سے کسب فیض کرنے لگے اور دارالعلوم

دیوبند کے فیوض و برکات سے بھی خوب خوب سیراب ہوتے رہے۔ آپ دارالعلوم دیوبند سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد اپنے آبائی وطن بفا واپس ہو گئے۔

علم وفضل

مولانا محمد اکبر خان مرحوم کا شمار دارالعلوم دیوبند کے ممتاز اور رجید الاستعداد علماء اور فضلاء میں ہوتا ہے۔ آپ قرآن و حدیث کے زبردست عالم دین تھے آپ کو خاص طور پر منطق و فلسفہ میں ملکۂ راسخہ حاصل تھا۔ آپ اگر درس و تدریس میں لگے ہوتے تو اپنے عہد کے مشہور اور ماہر فن استاد ثابت ہوتے۔ لیکن آپ کی تمام تر نظری صلاحیت اور تدریسی لیاقت سیاست کی نذر ہو گئی۔ اس میں آپ کا کوئی قصور نہیں آپ کا زمانہ ہی۔۔۔ سیاسی ہنگاموں کا عہد تھا۔

کانگریس میں شمولیت

مولانا محمد اکبر خان کو یہ امتیازی شان حاصل ہے کہ آپ نے بفا ضلع ہزارہ میں نیشنل کانگریس سے لوگوں کو روشناس کرایا۔ آپ ابھی ابھی دارالعلوم دیوبند سے فارغ التحصیل ہو کر آئے تھے۔ سرحدی گاندھی خان عبدالغفار خان مرحوم کے مشورہ سے کانگریس میں شامل ہو گئے اور اپنی سیاسی بصیرت کی بنا پر بہت جلد ضلع کانگریس کے صدر منتخب ہو گئے۔

سرحدی گاندھی اور خدائی خدمتگاروں پر مظالم

مولانا محمد اکبر خان صوبہ سرحد میں ممتاز حیثیت کے لیڈر تھے۔ سرحدی گاندھی کے قریبی سیاسی رفیق اور محرم راز کی حیثیت سے ملک اور بیرون ملک

میں جانے پہچانے جاتے تھے۔ آپ اور سرحدی گاندھی آزادی وطن سے پہلے انگریزوں کے مصائب و آلام کا شکار رہے اور تقسیم ملک کے بعد بھی اپنے ہی ہم وطنوں کے ہاتھوں تکالیف و مصائب کا شکار ہوئے اور قید و بند کی صعوبتیں بھی برداشت کیں۔

قیام پاکستان کے بعد صوبہ سرحد میں خدائی خدمتگاروں پر مصائب و آلام کی داستان محتاج تفصیل نہیں۔ جبکہ حکومت پاکستان مختلف حیلوں اور بہانوں سے خدائی خدمتگاروں کو موت کے گھاٹ اتار رہی تھی۔ اور خان عبدالغفار خان اور مولانا محمد اکبر خان جیسے دردمند قائد تڑپ رہے تھے۔ اور پاکستانی حکومت سے خدائی خدمتگاروں کے لئے صرف جینے کا حق مانگ رہے تھے جس کے لئے حکومت پاکستان تیار نہ تھی۔

مولانا محمد اکبر خان ان دنوں اپنے وطن بقا میں تھے اور پاکستانی حکومت آپ کی سیاسی سرگرمیوں سے خوب آگاہ تھی اور ہر وقت آپ کے تعاقب میں تھی۔ ایسی صورت حال میں آپ نے ضروری خیال کیا کہ اب وقت آگیا ہے کہ پاکستان سے نکل کر صوبہ سرحد میں ہونے والے واقعات اور مظالم سے دنیا کو باخبر کریں اور خدائی خدمتگاروں کے حق میں آواز بلند کریں۔ دوسرے ممالک میں اس کا پروپگنڈہ کریں اور مجلس اقوام متحدہ تک ان کی آواز کو پہونچائیں اور پختونستان کے حق میں بین الاقوامی رائے عامہ کو ہموار کریں۔ اس ارادہ کو عملی جامہ پہنانے کے لئے آپ بڑی ہی دانشمندی سے روپوش ہو کر بقا سے پشاور پہونچے۔ وہاں سرحدی گاندھی خان عبدالغفار خان سے تبادلہ خیال کیا۔ اگرچہ اس وقت پاکستان گورنمنٹ آپ کے ارادوں کو بھانپ چکی تھی اور پاکستانی پولیس بھی حرکت میں آچکی تھی، مگر کوئی چیز آپ کو نہ روک سکی اور آپ تمام خطرات کا مقابلہ کرتے ہوئے ہندوستان میں داخل

ہو گئے۔

ہندوستانی لیڈروں سے ملاقاتیں

مولانا محمد اکبر خان مرحوم ہندوستان آنے کے بعد ہندوستان کے چوٹی کے لیڈروں سے ملاقاتیں کیں اور سرحد میں خدائی خدمت گاروں پر ہونے والے مصائب والام کی تفصیلات سنائیں۔ اور ان کی ہمدردیاں حاصل کیں۔

کل ہند پختون جرگہ

مولانا محمد اکبر خان نے اپنی سیاسی سرگرمیوں کا مرکز ہندوستان ہی کو بنایا ہندوستانی لیڈروں نے بھی غیر معمولی دلچسپی کا مظاہرہ کیا۔ مولانا محمد اکبر خان نے پورے ہندوستان کا دورہ کیا اور تمام سرحدی پختونوں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کرنے کی جدوجہد کی۔ آپ نے اسی اہم مقصد کی خاطر "کل ہند پختون جرگہ" کے نام سے پختونوں کی ایک جماعت کی بنیاد رکھی۔ ہندوستان جہاں ہزاروں پختون آباد تھے وہ سبھی پختون جرگہ کی زیر قیادت جمع ہو گئے اور انھوں نے مولانا محمد اکبر خان پر بڑا اعتماد و بھروسہ کیا۔ اور جانی و مالی تعاون دینے کی یقین دہانی کرائی۔

مختلف غیر ملکی اسفار

مولانا محمد اکبر خان مرحوم ہندوستان میں پختون جرگہ کو مستحکم کرنے کے بعد مختلف ملکوں کے دورے کئے۔ آپ سنگاپور، سیام، ملایا، انڈونیشیا برطانیہ، سعودیہ عربیہ اور مصر وغیرہ ممالک تشریف لے گئے اور وہاں کے سربراہوں سے گفتگوئیں کیں۔ اور ان کے سامنے سرحد کے خدائی خدمت گاروں

پر کئے گئے مظالم و مصائب کی تفصیلات بیان کیں اور خان عبدالغفار خان کی رہائی کی خاطر دستخطوں کی مہم چلائی۔ آپ نے ہندوستان اور دوسرے ممالک سے بیس لاکھ لوگوں سے دستخط حاصل کئے جن میں عوام کے علاوہ ان ممالک کے سربرآوردہ حضرات بھی شامل تھے۔ جس سے مجبور ہو کر حکومت پاکستان نے سرحدی گاندھی خان عبدالغفار خان اور خدائی خدمت گاروں کو رہا کیا۔

صحافتی زندگی

مولانا محمد اکبر خان اردو، فارسی، پشتو اور عربی کے بڑے ادیب اور انشاء پرداز تھے۔ آپکی صحافتی زندگی بھی بہت ہی اہم رہی ہے۔ آپ کئی اہم اور موقر اخباروں کے مدیر رہے اور آپ نے خود بھی ایک پندرہ روزہ انگریزی اخبار "پختونستان" نکالا تھا۔ جو ہندوستان اور عرب ممالک میں بہت ہی مقبول ہوا۔ یہ اخبار صوبہ سرحد اور خدائی خدمت گاروں کا ترجمان تھا۔ اور اس کے بعد آپ نے ہفت روزہ "صداقت" ہفت روزہ "یقین" اور ایک اردو یومیہ اخبار نکالا۔ ان تمام اخباروں کے مالک اور مدیر آپ ہی تھے۔

مولانا محمد اکبر خان ایک ایماندار اور اصول پسند صحافی تھے۔ آپ نے تمام صحافتی ذمہ داریوں کو بحسن خوبی انجام دیا۔ اور میدان صحافت میں ایک مجاہد کی حیثیت سے کھڑے رہے اور ایمان فروشوں کا مقابلہ کرتے رہے۔

عادات و خصائل

مولانا محمد اکبر خاں مرحوم بڑے خلیق، ملنسار، متواضع اور ہر دلعزیز انسان تھے۔ آپ کی ہر دلعزیزی کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ آپ پٹھانوں کے محبوب لیڈر تھے اور پٹھان جیسی جذباتی قوم بھی آپ پر اعتماد و بھروسہ کرتی تھی

اور آپ کے اخلاق و کردار سے بے حد متاثر تھی۔

مولانا کی شہادت

مولانا محمد اکبر خان کی شہادت ۱۹۶۳ء میں دہلی میں ہوئی آپ دارالعلوم دیوبند جانے کے لئے دلی ریلوے اسٹیشن گئے، ٹکٹ خرید لیا چونکہ گاڑی میں کافی دیر تھی، اس وجہ سے آپ دلی اسٹیشن سے پھاٹک حبش خاں آگئے اور وہاں اپنے کسی دوست سے ملنے کے لئے مسجد رمضان شاہ کے سامنے گلی میں ایک بڑے مکان میں داخل ہوئے اور داخل ہوتے ہی مکان گر پڑا جس میں آپ کی شہادت واقع ہوگئی۔ اور آپ کے ساتھ کئی لوگ شہید ہوتے اور ان میں قابل ذکر قومی و ملی کارکن علیم الدین صاحب بھی تھے، جن کو شہادت نصیب ہوئی اور آپکو قبرستان مہندیان میں لایا گیا اور احاطہ شاہ ولی اللہ میں دفن کر دیا گیا۔ آپ کا مزار شاہ ولی اللہ کے مزار سے تقریباً ۔ ۲ میٹر کے فاصلے پر مشرق میں واقع ہے۔ آپ کے مزار کے قریب مختلف باا ثر حضرات کی پختہ قبریں ہیں۔

مفتی عتیق الرحمنؒ

ولادت اور تعلیم

مفتی عتیق الرحمن عثمانی کی ولادت ۱۳۱۹ھ میں دیوبند میں ہوئی۔ آپ کے والد ماجد مفتی اعظم مولانا عزیز الرحمن عثمانی ہیں جو سلسلۂ نقشبندیہ مجددیہ کے شیخ طریقت تھے۔

مفتی عتیق الرحمن صاحب عثمانی نے ۹ سال کی عمر میں قرآن مجید حفظ کیا اور جملہ علوم وفنون دار العلوم دیوبند میں حاصل کئے۔ آپ کے اساتذہ میں شیخ الاسلام علامہ انور شاہ کشمیری، شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی، مولانا حبیب الرحمن عثمانی مولانا حافظ محمد احمد اور مولانا اصغر حسین رحمہم اللہ شامل ہیں۔

دار العلوم سے فراغت تعلیم کے بعد دو سال دار العلوم دیوبند میں ہی بحیثیت معین خدمتِ تدریس انجام دی۔ اس کے بعد دار العلوم اسلامیہ ڈابھیل گجرات چلے گئے۔ وہاں پانچ سال تک درس وتدریس اور فتاویٰ نویسی کے فرائض انجام دیئے۔

تحریک آزادی

مفتی عتیق الرحمن عثمانی تحریک استخلاص وطن کے جلیل القدر مجاہد تھے۔آپ کی مجاہدانہ زندگی کا آغاز ان کے اس اہم فتوے سے ہوا جو انھوں نے مہاتما گاندھی کی فرمائش پر دارالعلوم اسلامیہ ڈابھیل میں لکھا تھا۔ اس کی شکل یہ ہوئی تھی کہ جب مہاتما گاندھی جی نے انگریزوں کے خلاف ڈانڈی مارچ شروع کیا تو مفتی صاحب اپنے رفقاء کے ساتھ ڈابھیل سے ڈانڈی مہاتما گاندھی سے ملنے گئے مفتی عتیق الرحمن صاحب عثمانی کا بیان ہے کہ:

"ہم گاندھی جی کے پاس پہنچے تو وہ ہمیں دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور بڑی خندہ پیشانی سے کہا آؤ "مولانا" پھر ہم سے بیٹھنے کو بھی کہنے سے پہلے انھوں نے پوچھا کہ مولانا میں نے سنا ہے کہ آنحضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "پانی، گھاس، نمک پر ڈیوٹی نہیں میں نے اس کی تصدیق کی تو وہ اور خوش ہوئے اور دیر تک کرید کرید کر تفصیل پوچھتے رہے۔میں نے تفصیلات بیان کیں تو انھوں نے کہا کہ بڑی مہربانی ہوگی اگر آپ انھیں لکھ کر بھیجیں۔ ہم سب وہاں دن بھر رہے اور واپس آنے کے بعد لکھ کر بھیجدیا۔"

مفکر ملت نمبر ص ۳۴۶

جب برطانوی حکومت نے ان مجاہدین کی جائیدادوں کو بحق سرکار ضبط کرنا شروع کردیا جو اس وقت نمک سازی کی تحریک میں حصہ لے رہے تھے تو مفتی صاحب نے فتوی دیا کہ ان جائیدادوں کو خریدنا جائز نہیں۔اس فتوے سے جہاں تحریک میں جان پڑی وہاں حکومت بوکھلا گئی اور مفتی صاحب کے خلاف وارنٹ جاری کردیا اور آپ کو ڈابھیل کی ملازمت ترک کرنی پڑی۔

انسانی ہمدردی

مفتی صاحب حقیقی معنی میں انسانی اخوت اور خدمت خلق کا بہترین مجسمہ اور اور نکھرا ہوا نمونہ تھے۔ مفتی صاحب کی عظمت کا سب سے جدا اور منفرد پہلو یہ تھا کہ ان سے گفتگو کرتے وقت متکلم کو اپنی بڑائی اور عظمت کا احساس ہونے لگتا تھا حضرت مفتی صاحب مخاطب سے کچھ اس انداز سے گفتگو فرماتے کہ اس میں یہ اعتماد ابھرتا تھا کہ وہ بھی کوئی حیثیت رکھتا ہے۔ مفتی صاحب خود ستائی و خود بینی جیسی کمزوریوں میں مبتلا نہ تھے۔ وہ اپنی ذات کے بارے میں بہت ہی کم بات کرتے تھے لیکن دوسروں کی شخصیت کے بارے میں اس قدر دلچسپی لیتے تھے جیسے وہ کسی ——— عظیم اسکالر اور قدآور شخصیت کا مطالعہ کر رہے ہوں۔ اپنے سے چھوٹوں کے سامنے بھی وہ اس طرح بچھ جاتے کہ شرمندگی ہوتی تھی۔ بڑی محبت سے ہر ایک سے ملتے سب کی دکھ درد سنتے، اپنی استطاعت کی حد تک پریشانی دور کرنے کی کوشش بھی فرماتے۔ اپنے گھر میں ہوں یا کسی اجتماع میں یا سر راہ ان کی وضعداری اور محبت میں کبھی فرق محسوس نہیں ہوتا مفتی صاحب بڑے وضعدار قسم کے بزرگ تھے۔ مرحوم اپنی وضعداری مروت اور رکھ رکھاؤ کی وجہ سے زہر کے گھونٹ بھی مسکراتے ہوئے پی جاتے تھے اور ازلی دشمنوں اور سیاسی حریفوں سے اس طرح ملتے جیسے ان سے ملنا خضر و مسیحا کی ملاقات سے بہتر ہو۔ ان کی وضعداری ہی تھی کہ تادم آخر کانگریسی رہے۔ لیکن کانگریسیت کے ساتھ ساتھ سیاسی میدانوں میں ان کا رشتہ مختلف رجحانات کے لوگوں سے رہا۔

میدان سیاست

مفتی صاحب سیاسی لیڈر ہی نہ تھے۔ لیڈروں کے لیڈر تھے۔ لیکن عام

کانگریسی کی طرح کسی بڑے حکمران سے گفتگو کرتے ہوئے کانپتے اور تھرّاتے نہیں تھے۔ بلکہ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرتے تھے مجھے متعدد قومی رہنماؤں نے بتایا کہ ایک کانفرنس میں جس میں آنجہانی اندراجی بھی شریک تھیں۔ اندراجی نے بنگلہ دیشی مسلمانوں سے بڑی ہمدردی کا اظہار کیا تو مفتی صاحب نے برجستہ اسی مجلس میں اپنے مخصوص انداز میں فرمایا کہ آج کل ہماری محترمہ وزیراعظم کو بنگلہ دیشی مسلمانوں سے کچھ زیادہ ہی ہمدردی ہوگئی ہے۔ مفتی صاحب باوجود بڑے کانگریسی لیڈر ہونے کے سودے بازی اور نعرہ لگانے کے فن سے کورے تھے۔ اگر مفتی صاحب چاہتے تو بڑے سے بڑا عہدہ ان کو بآسانی مل سکتا تھا۔ لیکن ان کی وضعداری تھی کہ کبھی کسی سرکاری عہدہ کا لالچ نہیں کیا۔

تحریر و تقریر

مفتی صاحب تحریر و تقریر کے میدان کے کامیاب شہسوار تھے۔ زبان و قلم میں بلا کی شگفتگی و دلآویزی تھی۔ آپ کی تقریروں میں علم و روحانیت فکر و بصیرت اور تحقیق و کاوش کے جوہروں کے ساتھ ساتھ ادب کی چاشنی اور اسلوب کی دلآویزی چمکتی و دمکتی نظر آتی ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ مفتی صاحب کو قدرت نے نثر نگاری کا جتنا صاف ستھرا ذوق دیا تھا ویسے ہی علمی حیثیت سے بھی بلند مقام عطا فرمایا تھا مگر انھوں نے اپنی زندگی کا تقریباً تمام تر حصہ چھوٹوں کو بڑا اور بڑوں کو اور بڑا بنانے میں صرف کر دیا۔ ؎

ہم نے ہر ادنیٰ کو اعلیٰ کر دیا
خاکساری اپنی کام آئی بہت

بلاشبہہ تاریخ میں ایسے بے لوث تعمیر پسند اور دوسروں کو ہر قدم اور ہر موڑ پر سہارا دینے والے کم ہی لوگ نظر آتے ہیں ۔ نہ جانے کتنے نوجوان ہیں جو صرف حضرت مفتی صاحب کی حوصلہ افزائی، امداد و تعاون کی بدولت صاحب قلم، صاحب تصنیف اور علمی دنیا میں شہرت و عظمت کے حامل ہو گئے ۔ اور مفتی صاحب نے خود کو انشاء پردازی کے میدان میں پیچھے رکھنے کی سعی کی اور شاذ و نادر ہی اور انتہائی مجبور کن حالات میں ہی کچھ لکھا۔ خود ہی ایک جگہ لکھتے ہیں ۔

"۱۹۳۷ء کے اوائل میں جب ندوۃ المصنفین کا قیام عمل میں آیا دوسرے رفقائے کار کے ساتھ میں بھی ایک بڑھیا قسم کی بلوری دوات اور عمدہ قلم سنبھال کر بیٹھ گیا تھا۔ اور لکھنے پڑھنے کا کام شروع بھی کر دیا تھا علامہ ابن تیمیہؒ کی "الکلم الطیب" تشریحی نوٹوں کے ساتھ اور علامہ ابن الجوزی کی "صید الخاطر" کا ترجمہ انہی دنوں کی یادگار ہیں ۔ لیکن جلد ہی یہ طے کر لیا کہ لکھنے پڑھنے والوں اور تصنیف و تالیف کے شہسواروں کی کمی نہیں ۔ کمی جس چیز کی ہے وہ یہ ہے کہ ادارے کا انتظام کون چلائے اور کس طرح چلائے اس فیصلہ کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک کوتاہ قلم اور کم سواد انتظامات کے خرخشوں میں پھنس کر رہ گیا اور شروع کئے ہوئے کام یوں ہی ناتمام رہ گئے۔ گزرے ہوئے دن واپس نہیں آتے اور اب افسوس کے علاوہ چارۂ کار ہی نہیں ہے ۔ انتہی ۔ منار صدار ص ۹

مفتی صاحب ایک عظیم المرتبت عالم دین ہونے کے ساتھ ساتھ ایک کامیاب ترین منتظم بھی تھے ان کی بے پناہ اور محیر العقول انتظامی صلاحیتوں کا اعتراف سبھی کرتے ہیں ادارہ ندوۃ المصنفین ان کی بے پناہ انتظامی صلاحیتوں اور حیرت انگیز کاوشوں کا ثمرہ ہے۔ خدا حضرت مفتی صاحبؒ کے قائم کردہ

اس ادارہ کو پروان چڑھائے

وفات

مفتی عتیق الرحمن عثمانی ۱۲ / مئی ۱۹۸۴ء میں داعی اجل کو لبیک کہا اور مہندیان میں دفن ہوئے، آپ کی قبر دارالمدرسین سے چند قدم آگے بائیں جانب سر راہ ہے۔

علامہ المامون الدمشقی

مختصر تعارف

علامہ محمد المامون الارزنجانی الدمشقیؒ کا شمار اسلام کے مخلص مبلغوں اور دانشوروں میں ہوتا ہے۔ وہ ــــــــ میں ارزنجان دمشق میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد کا نام معلوم نہیں ہوسکا اور نہ آپ کے ابتدائی حالات معلوم ہوئے اور نہ ملک شام چھوڑنے کی وجہ معلوم ہوسکی۔ خدا معلوم کس وجہ سے اہل وعیال کے اصرار کے باوجود کبھی وطن نہیں گئے اور مختلف ممالک جیسے جرمن، اٹلی اور ہندوستان میں مقیم رہے۔ ہندوستان میں تقریباً بیس سال رہے۔ حیدر آباد میں زیادہ قیام رہا۔ حیدر آباد میں محلہ نامپلی میں قیام رہا۔ لیکن کوئی خاص مشغلہ نہیں تھا۔ کبھی کبھی نشرگاہ حیدر آباد سے نشریاتی پروگرام میں عربی اناؤنسر بھی رہتے تھے۔ ۱۹۴۸ء میں چند سال جامعہ عثمانیہ حیدر آباد میں پروفیسر رہے پھر مسلم یونیورسٹی علی گڈھ میں عربی کے استاذ رہے۔ وہاں سے دہلی کالج میں آئے اور عربی کے استاذ رہے۔

ادبی ذوق

علامہ محمد المامون عربی زبان کے ادیب تھے اور وہ ان کی مادری زبان تھی۔ لغت فصحیٰ بولتے اور لکھتے تھے اور اس کے مبلغ تھے۔ لغت عامیہ کے بہت خلاف تھے۔ عربی زبان کے قادر الکلام شاعر بھی تھے۔ آپ کے بہت سے قصائد غیر مطبوعہ اور مطبوعہ تھے عربی زبان کے علاوہ فارسی، انگریزی جرمنی، اردو اور جاپانی زبان سے بھی بخوبی واقف تھے

تصنیف و تالیف

علامہ مرحوم ایک بلند پایہ مصنف تھے آپ نے سیرت الرسولؐ پر ایک رسالہ رسول الثقلین کے نام سے لکھا تھا اور ادب میں المقامات الدکنیہ کے نام سے ایک مختصر مطبوعہ کتاب تھی ان کا غیر مطبوعہ ایک دیوان بھی تھا۔
آخیر میں مہاتما گاندھی کی سوانح عمری عربی میں لکھ رہے تھے معلوم نہیں یہ سوانحعمری مکمل ہوسکی یا تشنۂ تکمیل رہی، مولانا آزاد کے انتقال پر بڑا پر درد مرثیہ لکھا جو الجمعیۃ کے مولانا آزاد نمبر میں شائع ہوا ہے۔

ذوق تصوف

علامہ محمد مامون الشامی علم روحانیت میں درک رکھتے تھے اور غیر مسلموں سے میل جول اور ان سے مذہبی اور خاص طور پر روحانیت و اخلاقیات پر تبادلۂ خیال کرتے تھے ان کو اسلام کی دعوت بھی دیتے تھے۔
روزانہ اپنی قیام گاہ سے گیارہ بجے نکل کر شہر کے مختلف علاقوں میں مختلف لوگوں سے ملتے جلتے تھے۔

آپ مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی، مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی اور مولانا مفتی حفیظ الرحمٰن واصف مرحوم سے ملنے جاتے تھے۔ یہ حضرات بھی آپ کے اخلاص و محبت کی بڑی قدر کرتے تھے۔

مولانا آزادؒ اور مولانا ملیح آبادیؒ سے آپ کا بڑا گہرا تعلق تھا۔ مولانا ملیح آبادی جب آل انڈیا ریڈیو کے شعبہ عربی سے وابستہ ہو گئے تو علامہ المامون سے بھی گاہ بگاہ تقریر کراتے تھے۔

عادات و خصائل

علامہ المامون الشامی بڑے سادہ مزاج اور مجاہد انسان تھے۔ آپ اپنے ساتھ فوجیوں کی طرح تھیلے رکھتے تھے جس میں چنے، ڈبل روٹی وغیرہ معمولی خورد و نوش کا سامان رکھتے۔ سوکھی روٹی سے بھگو کر گڑ سے بھی کھاتے تھے۔ حفظانِ صحت کے اصول کیمطابق خاص طور پر ہوا خوری کا ہر جگہ اہتمام رکھتے تھے۔ خوش مزاج اور با وضع انسان تھے۔ بلا کے ذہین تھے۔ بہت جلد ہر بات کو تاڑ لیتے تھے۔

وفات

علامہ محمد المامون الشامی دہلی میں بیمار پڑے اور ان کو ارون ہسپتال میں داخل کرایا گیا۔ ۱۹ر فروری ۱۹۶۰ء میں داعی اجل کو لبیک کہا غریب الوطنی کی موت ہوئی۔ قبرستان مہندیان میں باب حفظ الرحمٰن کے قریب ہی دفن ہوئے۔ خدا جزائے خیر دے شیر میوات کو کہ انھوں نے بڑا خوبصورت کتبہ لگا دیا ہے۔ آپ کی قبر سے قریب ہی دائیں بائیں دو غیر معروف قبریں ہیں۔

چودھری مختار احمد خان

ولادت و تعلیم

چودھری صاحب کی پیدائش ۱۹۱۶ء میں قصبہ ڈھلہ مراد آباد کے ایک صاحب ثروت زمیندار گھرانہ میں ہوئی۔ ان کے والد حاجی عبدالمجید صاحب مرحوم سی پی ڈبلیو ڈی میں انجینئر تھے اور لکھنؤ میں تعینات تھے۔ اس لئے چودھری صاحب کی تعلیم و تربیت لکھنؤ میں ہی ہوئی اور وہیں سے گریجولیشن کرنے کے بعد علی گڈھ مسلم یونیورسٹی سے ایم ایس سی ۱۹۳۷ء میں اعلیٰ نمبرات سے پاس کیا۔ دور طالب علمی نہایت سادگی سے گزارا۔

ملازمت

مزاجاً بہت سخت مگر طبیعت کے بیحد نرم واقع ہوئے تھے۔ اگرچہ برطانیہ کی ملازمت مرغوب نہ تھی مگر والد صاحب کے اصرار پر یونین پبلک سروس کے اسسٹنٹ گریڈ کے امتحان میں شرکت کی اور پہلی ہی مرتبہ اعلیٰ و امتیازی نمبرات سے کامیابی حاصل کرکے ۱۹۳۸ء میں سنٹرل بورڈ آف ریونیو میں اسسٹنٹ کی حیثیت

سے جوائن کیا۔

اس دور میں ترقی کا معیار انگریز حکومت سے وفاداری تھا مگر مرد مومن کی طرح ڈٹے رہے اور کسی انگریز کو خاطر میں نہ لائے۔ اپنی ایمانداری، شرافت اور اپنے کام پر مکمل عبور و دسترس ہونے کی وجہ سے ۱۹۴۲ء میں سپرنٹنڈنٹ سپھر ڈی جی ایس اینڈ ڈی میں اسسٹنٹ ڈائریکٹر، ۱۹۴۵ء میں ڈپٹی ڈائریکٹر اور ۱۹۴۹ء میں ڈائریکٹر کمپلینٹس مقرر ہوئے اور ۱۹۷۴ء میں اسی عہدے سے ریٹائر ہوئے۔

دینی مزاج

بچپن سے ہی مذہبی ماحول میں پرورش ہوئی تھی چنانچہ باشرع ڈاڑھی، کرتا پائجامہ، شیروانی ہی وضع قطع تھی یہاں تک کہ علی گڑھ میں مولوی کی حیثیت سے پہچانے جاتے رہے۔ آزادی سے پہلے مرکزی دفاتر شملہ میں چھ ماہ رہے۔ شملہ کے قیام کے زمانے میں سرکاری ملازمین کی ایک تنظیم جمعیۃ انصار المسلمین کے نام سے قائم کی اور اس کے ماتحت شملہ کی پہاڑیوں پر دینی مکاتیب قائم کئے اور ان کی تمام ذمہ داریوں کو اپنے ذمہ لے کر بحسن خوبی نباہتے رہے۔

تحریک انکار حدیث

چودھری صاحب کے مقابلہ میں مشہور منکرِ حدیث پرویز نے ایک انجمن، انجمن اسلامیہ کے نام سے قائم کی اور اس کے ذریعہ اپنے مخصوص خیالات کا پرچار کرنا اور مسلمانوں کو حدیث کے خلاف بھڑکانا اور احادیث کے خلاف ذہن سازی کی جد وجہد شروع کر دی یہ لوگ اپنے آپ کو اہل قرآن کہتے اور حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا صریح انکار بلکہ حدیث کے بارے میں نازیبا کلمات تک کہنے سے نہ چوکتے تھے مگر بد قسمتی سے یہ سکریٹریٹ کی مسجد

(جامع مسجد نئی دہلی) میں خطیب اور امام جمعہ تھے۔ جمیعۃ انصار المسلمین کے ذریعہ چودھری صاحب نے کافی جدوجہد کی۔ اور ان کو اس منصب اور اس مسجد سے ہٹانے میں کامیاب ہوئے اور ان کی جگہ حضرت مولانا احتشام الحق صاحب تھانوی علیہ الرحمہ کو امام و خطیب مقرر کرایا۔ اور ان تحریکات و جمیعۃ کے سلسلہ سے حضرت مولانا حفظ الرحمان صاحبؒ، مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب وغیرہ سے قریب ہوئے اور ندوۃ المصنفین قرولباغ بیں پھر گلی قاسم جان اور آخر میں علاقہ جامع مسجد میں قائم کرنے میں ان اکابر کے معاون و مددگار رہے۔

جب ۱۹۴۰ء کے دوران انکے دفاتر سنٹرا اسٹریٹ سے شاہجہاں روڈ پر منتقل ہوئے تو وہاں مسجد نہ ہونے کی وجہ سے پریشان تھے۔ ہمایوں روڈ پر ایک خستہ مسجد کے آثار نکلے اس کی صفائی وغیرہ کرائی۔ امام و خطیب مقرر کیا، جمعہ کے لئے قاضی سجاد حسین صاحب کو تیار کیا اور اس مسجد کو دوبارہ نہایت خوبصورت انداز میں تعمیر کرایا۔

اردو نوازی

۱۹۴۷ء میں مسلمانوں کی بربادی اور اردو تعلیم کے خاتمہ سے بہت کبیدہ تھے اور چاہتے تھے کہ اردو پھر سے زندہ ہو، مشاعرہ میں کبھی شرکت نہ کرنے کے باوجود درپردہ اردو کی بہبودی و فروغ کے لئے کوشاں رہے۔

موصوف نے ذاتی طور پر اردو اکادمی قائم کی اور وہ تمام کتابیں جنکو پبلیشر نہیں چھاپتے تھے۔ ان کتابوں کو اردو میں ترجمہ کرا کر اکادمی سے شائع کرائیں۔

وسیع النظری

ان کی زندگی ایک مسلسل جدوجہد تھی اور بلا فرق مذہب و ملت اپنے ماتحتوں کی برابر مدد کرتے تھے اور اس حد تک اس معاملہ میں فراخ دل تھے کہ وہ جنھوں نے ہمیشہ

مخالفت کی ان کے ساتھ بھی وقت ضرورت تعاون کرنے سے نہ چوکتے۔ یہی وجہ تھی کہ ان کے دفتر کے لوگ آخیر تک ان کے پاس اپنے کاموں کے سلسلہ میں آتے رہے۔ آپ ہی کے نقش قدم پر آپ کے بڑے صاحبزادے جناب چودھری حکیم صغیر احمد خان انچارج شوروم ہمدرد آصف علی روڈ ہیں جو بڑے مخلص اور ہمدرد انسان ہیں۔ ملی کاموں میں برابر دلچسپی لیتے ہیں۔

اوقاف کی حالت زار

اوقاف کی حالت ایک زمانہ میں خراب ہوگئی تھی۔ حضرت مولانا حفظ الرحمن صاحب نے ڈپوٹیشن پر مقرر کر دیا۔ چودھری صاحب نے اوقاف کا ایک ضابطہ بنایا اور اوقاف سے مسلمانوں کی مدد و تعاون کا منصوبہ بنایا اور مسلم تنظیموں کے آپسی اختلافات کو ختم کرانے کے سلسلہ میں مسلسل کوشاں رہتے۔ جبل پور کے فسادات کے بعد حضرت مولانا حفظ الرحمن صاحب، مولانا ابواللیث صاحب اور مولانا مسعودی صاحب کے درمیان جو مشاجرات کی شکل پیدا ہوگئی تھی ان کو ختم کرا کر ایک ساتھ کام کرنے پر آمادہ کیا اور کسی حد تک اپنی کوشش میں کامیاب رہے اور جبل پور میں ریلیف کا کام دونوں جماعتوں نے مل کر کیا۔ مشاورت بننے کے بعد بھی مشورے دیتے رہے اور اس سلسلہ میں پہلا میمورنڈم اکابرین کے مشورے سے اس کو تیار کر کے دیا۔

وفات

اکثر زیادہ محنت اور ذہنی حالات کی وجہ سے پریشانیوں کے باعث بیمار رہتے تھے مگر اکتوبر ۱۹۸۳ء میں شدید فالج اور پھر دل کا حملہ ہوا۔ ہمدرد نرسنگ ہوم میں داخل کئے گئے، اس دوران بھی جب طبیعت کچھ بحال ہوئی تو اینگلو عربک اسکول

کے سلسلہ میں ایک طویل ڈرافٹ تحریر کرایا اگرچہ ڈاکٹروں نے سختی سے منع کیا تھا۔ مگر ان کی لگن کاموں میں اس طرح تھی کہ اس میں کوئی چیز آڑے نہ آئی۔

موصوف اینگلو عربک اسکول کے منیجر بھی تھے اور نہایت ہی خلوص کے ساتھ اسکول کی تمام تر ذمہ داریوں کو نبھایا۔ آخر ۲۴ جنوری ۱۹۸۲ء کو دوسرا حملہ ہوا اور چودھری صاحب اس دار فانی سے کوچ کر گئے۔ مرحوم کی تدفین دھندیان میں ہوئی۔

خدا مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا۔

ہندوستان کے مشہور مجاہد آزادی علامہ انور صابری مرحوم نے قطعۂ تاریخ کہی ہے۔ ؎

ہاتف غیبی سمجھتا ہے جنھیں عنوان خلد
جن کے اوصاف حمیدہ تھے سروسامان خلد
شکر ہے بعد قتادہ ہو گئے مہمان خلد
کہہ بھی دو تاریخ تم، مختار احمد جان خلد
۱۹۸۲ء

حکیم محمد الیاس خان

ولادت اور تعلیم

صدر الاطبار حکیم محمد الیاس خان ۱۸۸۰ء میں اپنے آبائی مکان قصبہ سہاور ضلع ایٹہ کے ایک معزز چودھری خاندان میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد ماجد چودھری محمد امجد علی خان مرحوم کا انتقال ان کی صغر سنی میں ہی ہو گیا۔ آپ کی والدہ محترمہ جو بہت ہی رعب اور دبدبہ کی مالک تھیں اور آپ بھی اپنی والدہ محترمہ کی بہت عزت و تکریم کرتے تھے۔ انھوں نے چودھری صاحب کے وصال کے بعد صاحبزادہ کو حصول علم کے لئے مدرسہ امینیہ دہلی میں داخل کرادیا جہاں آپ نے بہت ہی کم مدت میں تمام علوم کی تکمیل کرنے کے بعد مدرسہ طبیہ سے حکیم عبدالمجید خان کی نگرانی میں طب کی تعلیم حاصل کی۔ ۱۹۰۱ء میں مدرسہ طبیہ سے سند طب حاصل کر کے اپنے آبائی وطن قصبہ سہاور واپس چلے گئے۔

مطب

اور وہاں اپنے گھر پر ہی پریکٹس (مطب) شروع کر دی۔ خداوند تعالیٰ نے جہاں قابلیت اور ذہانت سے نوازا تھا وہیں دست شفا بھی عنایت فرمایا تھا۔ اتفاق سے ۱۹۰۱ء میں ڈاکٹر ضیاء الدین مرحوم وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ چندے کی مہم پر جب قصبہ سہاور تشریف لائے تو افلاطون وقت حکیم محمد الیاس خان سے ملاقات ہوئی۔ ڈاکٹر ضیاء الدین مرحوم آپ سے ملکر بے حد متاثر ہوئے اور حکیم صاحب کو علی گڑھ آنے کی دعوت دی۔ ڈاکٹر صاحب کی دعوت پر علی گڑھ تو تشریف لے آئے مگر ملازمت کے لئے تیار نہ ہوئے۔ اور شہر علی گڑھ میں اوپر کورٹ پر اپنا مطب شروع کر دیا۔ حکیم محمد الیاس خان صاحب اس وقت جو حکیم صاحبان وہاں موجود تھے ان میں نہایت ہی کم عمر تھے اور اس واسطے لوگ ان کو اکثر "بچہ حکیم" کہکر پکارتے تھے اور جب مریض ان بزرگ حکیموں کے علاج سے شفایاب نہ ہوتے تو پھر "بچہ حکیم" کو بھی آزماتے اور اللہ تعالیٰ اس بچہ حکیم کے ہاتھوں بڑے بڑے لا علاج مریضوں کو شفاء عطا فرماتا تھا۔ کچھ عرصہ علی گڑھ میں قیام کر کے ۱۹۲۰ء کے اوائل میں دہلی آگئے اور بارہ ٹوٹی (صدر بازار) میں اپنا مطب شروع کر دیا۔

طبیہ کالج

اور ۱۹۲۰ء میں ہی مسیح الملک حکیم محمد اجمل خان مرحوم کی دعوت پر طبیہ کالج قرولباغ کی خدمت قبول فرمالی۔ جہاں آپ ہاؤس فزیشن اور پروفیسر معالجات کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ ۱۹۲۶ء میں مسیح الملک حکیم محمد اجمل خان مرحوم نے ایک مجلس تحقیق (ریسرچ کمیٹی) قائم کی جس کے چیئرمین خود

حکیم محمد اجمل خان مرحوم رہے اور سکریٹری حکیم محمد الیاس خان مرحوم کو بنایا۔

جامعہ طبیہ کا قیام

۱۹۲۷ء میں طبیہ کالج آپسی اختلافات کا مرکز بن گیا تو حکیم محمد الیاس خان مرحوم نے اختلافات سے کنارہ کش ہو کر قرولباغ کے نزدیک ہی شیدی پورہ کے چوراہے پر ایک نئے طبیہ کالج بنام جامعہ طبیہ کی بنیاد ڈالی اور بہت جلد یہ جامعہ طبیہ اپنے اعلیٰ کارکردگی اور فنی تحقیق کی وجہ سے بام عروج پر پہونچ گیا۔

۱۹۴۷ء تک یہ ادارہ پوری شان وشوکت کے ساتھ چلتا رہا مگر ۱۹۴۷ء کی ہولناکیوں کی تاب نہ لاسکا اور ان ہولناکیوں نے اسے تباہ کر دیا اور بلوائیوں نے اس کی اینٹ سے اینٹ بجادی۔ جس دور میں جامعہ طبیہ وجود میں آرہا تھا اسی دور میں حیدرآباد میں ایک طبیہ کالج کا خاکہ بھی مرتب کیا جارہا تھا۔ جس میں طبی ماہر کی حیثیت سے حکیم محمد الیاس خان مرحوم بھی بلائے گئے اور وہاں بھی ایک طبیہ کالج، نظامیہ طبیہ کالج کے نام سے وجود میں آیا۔ وہاں کے ناظم طبابت حکیم مقصود یار جنگ نے جامعہ طبیہ دہلی کے اساتذہ کو دعوت دی کہ وہ یہاں آکر اپنی خدمات سے نوازیں۔ لہذا حکیم محمد الیاس خان کے رفقاء کار میں سے علامہ حکیم کبیر الدین مرحوم اور حکیم فضل الرحمن مرحوم حیدرآباد دکن تشریف لے گئے اور اب جامعہ طبیہ دلی میں صرف حکیم محمد الیاس خان ہی موجود رہ گئے۔

حکیم محمد الیاس صاحب کو بھی انتہائی کوشش کیگئی کہ وہ بھی حیدرآباد چلے آئیں لیکن انھوں نے یہ کہکر معذرت چاہی کہ میں اپنی ذاتی وخانگی مجبوری کی وجہ سے دلی نہیں چھوڑ سکتا۔ وہ ذاتی اور خانگی مجبوری صرف جامعہ طبیہ ہی تھا۔

جس کے لئے وہ اپنے آپ کو وقف کر چکے تھے۔

موصوف اپنی تمام تر توجہ اور ذاتی سرمایہ جامعہ طبیہ کی تعمیر و ترقی کے لئے وقف فرما چکے تھے۔

جامعہ طبیہ گلی قاسم جان میں

حکیم محمد جمیل خان صاحب بن مسیح الملک حکیم محمد اجمل خان پرنسپل طبیہ کالج آپکے کرب و بے چینی سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہے اور پیش کش فرمائی کہ آپ جامعہ طبیہ گلی قاسم جان میں منتقل فرمالیں اور میں ہر طرح سے آپ کا تعاون کرونگا۔ لہٰذا اب تن تنہا اس جامعہ کی نشأۃ ثانیہ کی فکر میں لگ گئے۔

لہٰذا حکیم محمد جمیل کی درخواست پر گلی قاسم جان کے ایک مکان میں جامعہ طبیہ کی نشأۃ ثانیہ کر دی گئی۔ اس میں طبیہ کالج دہلی کے ان طلبار کو بھی داخلہ دیدیا گیا جن کی تعلیم ادھوری رہ گئی تھی۔ تاکہ وہ اپنی تعلیم پوری کر کے سند حاصل کر سکیں۔ بہرحال آپ نے آخروقت تک اس ادارہ جامعہ طبیہ کو اپنا سرمایہ حیات قرار دیکر اس کی خدمت کرتے رہے اور اس ادارہ کی خدمت کرتے کرتے ہی ۱۹۶۳ء میں اپنے مولیٰ حقیقی سے جا ملے اور قبرستان مہندیان میں سپرد خاک کر دیئے گئے۔ مگر مرتے مرتے بھی اس جامعہ کا فکر حکیم محمد الیاس صاحب کو دامن گیر رہا۔

حکیم عبدالحمید صاحب کی تولیت

انتقال سے قبل آپنے وصیت فرمائی کہ میرے بعد یہ ادارہ محترم حکیم عبدالحمید صاحب چیئرمین ہمدرد نیشنل فاؤنڈیشن و صدر آل انڈیا یونانی طبی کانفرنس کی تولیت میں دیدیا جائے۔ لہٰذا آپ کی وفات کے بعد آپ

کی وصیت کے مطابق ۱۹۶۳ء میں یہ ادارہ حکیم حاجی عبدالحمید صاحب کی تولیت میں دیدیا گیا۔ اور اب یہ ادارہ حضرت حکیم حاجی عبدالحمید صاحب کی سرپرستی میں ہمدرد طبیہ کالج کے نام سے تغلق آباد میں روز افزوں، دن دونی رات چوگنی ترقی کر رہا ہے۔ پدم بھوشن حکیم عبدالحمید صاحب کی مخلصانہ جدوجہد کی وجہ سے ہمدرد طبیہ کالج ہندوستان کے چوٹی کے اداروں میں شمار ہونے لگا ہے۔

حکیم صاحب معاصرین کی نظر میں

آپ کے پرانے رفیق و ہمدم علامہ حکیم کبیر الدین صاحب نے علی گڈھ سے انتہائی موثر و پر درد الفاظ میں مرحوم کو خراج تحسین پیش کیا۔ تحریر فرماتے ہیں :۔

"کشتیٔ فن کا آزمودہ کار ملاح، تجربہ کار ناخدا، اجمل خان کا جانشین سپاہی چل بسا۔۔۔ بڑا بہادر، بڑا دلیر، بڑا جنگجو، دلی رو رہی ہے۔ حیدر آباد اشکبار ہے۔ کراچی میں آنسو بہہ رہے ہیں۔ حکیم الیاس خان کہنے کو ۸۲ برس کے تھے مگر ان کے سینہ کے اندر دل جوانوں کی طرح اچھلتا تھا۔ مرتے دم تک آواز میں پستی اور ارادوں میں شکستگی نہیں آنے پائی۔ ان پر جوانی آئی تو پھر واپس نہیں گئی۔ مرے تو جوان ہی مرے۔ قدرت نے ان کو امتیازی شان عطا فرمائی تھی۔ جب طالب علم تھے تو ممتاز تھے۔ علی گڈھ کے علمی ادارہ میں بحیثیت طبیب آئے تو سر بلند رہے۔ جب دلی بلائے گئے تو طبیہ کالج میں نہ صرف برگزیدہ رہے بلکہ "ہمہ اوست" کی حیثیت انھیں حاصل تھی۔ حکیم الیاس

خان کی خدمت کی مدت بھی بڑی طویل ہے۔ ۸۲ برس میں سے بیس بائیس سال نکال دیجئے تو ساٹھ سال ان کی خدمت کی مدّت ہے۔ اور اس مدت میں ان کی خدمت کی مقدار اتنی بڑی ہے کہ اگر اسے شرح وتفصیل سے لکھا جائے تو ایک بڑا دفتر بن جائے۔"

حکیم عبدالحمید صاحب نے مرحوم کے بارے میں اپنے دلی تاثرات کا اظہار ان الفاظ میں فرمایا ہے :۔

"وہ میرے شفیق رہنما اور خیر خواہ تھے، طبّی مسائل کو حل کرنے میں ان کی شخصیت جو کام کر جاتی تھی وہ ہماری بہت سی تدبیریں بھی نہیں کرتی تھیں۔ وہ غیر معمولی صلاحیت کے مالک تھے۔ گلی قاسم جان کے ایک کونے میں بیٹھ کر ملک کی تمام طبّی سیاست پر نظر رکھتے تھے اور اپنے پچھلے تعلیمی تجربہ اور قابلیت کی بنا پر جامعہ طبیہ کو جس حسن خوبی سے چلا رہے تھے وہ انھیں کا حصّہ تھا۔ مجھے کبھی یہ سوچنا ہی نہیں پڑتا تھا کہ وہاں کا کام کس طرح ہو رہا ہے۔"

اولاد

حکیم محمد الیاس خان مرحوم کی اولاد میں تین صاحبزادے اور دو صاحبزادیاں تھیں۔ بڑے فرزند حکیم محمد ایاسین خان کا آپ کی زندگی میں ہی انتقال ہوگیا تھا۔ آپ کے منجھلے صاحبزادے ڈاکٹر محمد اخلاص خان پاکستان ہجرت کر گئے جو الحمدللہ تاہنوز بقید حیات ہیں اور ان کے چھوٹے صاحبزادے محمد عباس خاں منسٹری آف ایجوکیشن کے پیرا کرٹ بال بھون میں اسسٹنٹ ڈائریکٹر کی حیثیت سے ریٹائر ہو گئے ہیں۔ آج کل گھر پر

اپنی کھیتی باڑی میں مصروف ہیں۔

حکیم صاحب کے چھوٹے داماد پروفیسر سید نقی حسین جعفری صاحب ہیں جو کہ جامعہ ملیہ اسلامیہ میں شعبہ انگلش میں ریڈر کے عہدہ پر مامور ہیں۔

مولوی محمد یوسف فقیر

مفسر قرآن مولانا مولوی محمد یوسف فقیر دہلوی کی ولادت ۱۹۰۳ء میں دہلی میں ہوئی۔ آپ ایک معزز اور جدید تعلیم یافتہ گھرانے کے چشم و چراغ تھے۔ آپ کے والد ماجد علی محمد مرحوم بمبئی کے کسی فیکٹری میں انجینئر تھے۔

تعلیم و تربیت

مولوی محمد یوسف فقیر دہلوی کی ابتدائی تعلیم کا آغاز قرآن مجید سے ہوا، مکتبی تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد اینگلو عربک اسکول میں داخل ہوئے اور اینگلو عربک اسکول سے میٹرک کا امتحان پاس کرنے کے بعد پنجاب یونیورسٹی سے بی۔ اے۔ کا امتحان دیا۔ امتحان دینے کے بعد عروس البلاد بمبئی چلے گئے۔ آپ کے والد آپ کو اعلیٰ تعلیم کی تحصیل کے لئے یورپ بھیجنا چاہتے تھے۔ لیکن بمبئی میں آپ کا جی نہیں لگا اور دلّی واپس آگئے۔ آپ کی والدہ مرحومہ بڑی نیک اور فرشتہ صفت خاتون تھیں۔ آپ کو دینی تعلیم سے آراستہ و پیراستہ کرانا چاہتی تھیں۔ والدہ محترمہ کے اشارہ پر آپ ۱۹۲۲ء میں مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور میں داخل ہوئے اور ۱۹۲۴ء تک وہاں رہ کر علم دین حاصل کیا۔ اس کے بعد برصغیر کی عظیم

دینی درسگاہ دارالعلوم دیوبند میں داخل ہوئے اور ۱۹۲۹ء میں دارالعلوم دیوبند سے فراغت حاصل کی۔

علم و فضل

مفسر قرآن مولانا محمد یوسف فقیر دہلوی کا شمار دارالعلوم دیوبند کے جلیل القدر علماء و فضلاء میں تھا۔ آپ کو شیخ الادب مولانا اعزاز علی امروہویؒ، علامہ محمد ابراہیمؒ بلیاوی، اور مولانا حسین احمد مدنیؒ سے شرف تلمذ حاصل تھا۔ آپ اپنی خداداد ذہانت و فطانت کی وجہ سے تمام علوم و فنون پر گہری نظر رکھتے تھے۔ آپ دلی کے ممتاز مفسر قرآن، بالغ نظر مفتی اور شگفتہ بیان واعظ تھے۔

مدرسہ کریمیہ

مولانا محمد یوسف فقیر دہلوی، دہلی کے مشہور ادارہ مدرسہ کریمیہ کے صدر مدرس رہے۔ اور آپ کے دور صدارت میں مدرسہ نے ایسی نیک نامی اور شہرت حاصل کی کہ دلی کے مسلم رؤسا اور شرفاء اپنے بچوں کو یہاں داخل کرانا فخر سمجھنے لگے تھے۔

مولانا محمد یوسف صاحب بچوں کی تعلیم و تربیت پر خصوصی توجہ دیتے تھے۔ یہاں کے پڑھے ہوئے بچے بڑے شائستہ اور مہذب ہوتے تھے مولانا محمد یوسف فقیر دہلوی صاحب نے انتظامی مصروفیات کے باوجود مدرسہ میں درس و تدریس کا سلسلہ بھی باقی رکھا تھا۔ آپ ایک نبض شناس اور طالب علموں کی نفسیات سے واقفیت رکھنے والے مدرس تھے۔

تفسیری ذوق

مولانا محمد یوسف فقیر دہلوی صاحب مشہور مفسر قرآن تھے، موصوف نے

پوری زندگی حوض والی مسجد چوڑیوالان میں ترجمہ قرآن مجید بیان فرمایا۔ آپ کا ترجمہ قرآن دلی میں بڑا ہی مقبول تھا۔ مولانا محمد یوسف فقیر صاحب خاندان ولی اللٰہی کے تراجم خاص طور پر امام المفسرین شاہ عبدالقادر کے ترجمۂ قرآن مجید سے بے حد متاثر تھے۔ جب آپ ترجمہ قرآن بیان فرماتے تو شاہ عبدالقادر کا ترجمہ ضرور سامنے رکھتے۔ محترم فیروز دہلوی صاحب لکھتے ہیں۔

> "مولوی صاحب، شاہ عبدالقادر صاحب کے اردو ترجمہ کو قرآن کا مستند ترجمہ سمجھتے تھے۔ اور تفسیر بیان کرنے سے پہلے عربی متن کے بعد شاہ صاحب کا ترجمہ پڑھ کر سناتے تھے۔"

فتاویٰ نویسی

مولانا مولوی محمد یوسف فقیر دہلوی دلّی کے ایک بلند پایہ فقیہہ اور مفتی تھے۔ آپ کو فقہی جزئیات پر بڑی گہری نگاہ تھی آپ کو فتاویٰ نویسی میں بھی بڑا درک و کمال حاصل تھا۔ آپ کی زبان و قلم سے سیکڑوں فتاوے نکل چکے ہیں۔ اگر آپ کے تمام فتاوے کی نقلیں رکھی جاتیں تو کئی فتاوے کی ضخیم جلدیں مرتب ہو جاتیں۔

تصنیف و تالیف

مولانا محمد یوسف فقیر دہلوی کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے لکھنے پڑھنے کا بڑا عمدہ مذاق ملا تھا۔ آپ کی زبان و قلم میں بلا کی شگفتگی و دلآویزی تھی آپ اگر تصنیف و تالیف کی طرف متوجہ ہوتے تو آپ کا شمار ہندوستان کے عظیم مصنفین میں ہوتا۔ مولانا محمد یوسف صاحب فقیر نے مشہور عالم دین اور محدث کبیر امام عبدالوہاب شعرانیؒ کی تصنیف "الیواقیت والجواہر" کا ترجمہ کرنا شروع کیا تھا۔

خدا کو معلوم کہ وہ ترجمہ مکمل ہوا یا تشنۂ تکمیل ہی رہا۔ اگر یہ مکمل ہو جاتا تو یہ ترجمہ ہی آپ کی بہترین یادگار ہوتا۔ اور آپ کو علمی حلقوں میں زندہ و تابندہ رکھنے کیلئے کافی ہوتا۔

دعوت وارشاد

مولانا محمد یوسف فقیرؔ دہلوی صاحب مشہور مبلغ اور واعظ تھے۔ آپ نے اپنی پوری زندگی دعوت وارشاد اور وعظ و نصیحت میں گزار دی، دلی میں آپ کا وعظ مردوں اور عورتوں میں یکساں طور پر مقبول تھا۔ آپ دلی کے ہر دلعزیز واعظ اور مقرر تھے۔ آپ ساری زندگی اصلاح معاشرہ کے آرزومند رہے اور اپنی استطاعت بھر کوشش کرتے رہے۔

مولانا تھانویؒ سے عقیدت

مفسر قرآن مولانا مولوی محمد یوسف فقیرؔ دہلوی دلی کے مشہور روشن ضمیر اور قلندر مزاج بزرگ تھے۔ آپ حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے شیدائی اور مرید خاص تھے۔ مولانا فقیرؔ، مولانا تھانویؒ کا ذکر بڑے والہانہ انداز میں کرتے تھے۔ آپ کو مولانا تھانویؒ سے بڑی عقیدت و محبت تھی۔ دراصل مولانا تھانویؒ سے آپ کا یہ تعلق روحانی تھا، جو ساری زندگی قائم رہا۔

اصول پسندی

مولانا مولوی محمد یوسف دہلوی کی اصول پسندی کو بعض حضرات اجلال اور غصہ سے تعبیر کرتے ہیں اور بعض لوگ اس سے ناراض بھی ہوتے اور اعتراض بھی کرتے مگر آپ پر یہ اعتراض کوئی نیا نہیں تھا۔ خود حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ پر بھی

اس قسم کا اعتراض ہوا کرتا تھا حالانکہ یہ دونوں بزرگ اصول پسند تھے نہ کہ متشدد اور سخت مزاج۔

شعروشاعری

مولانا محمد یوسف فقیر دہلوی اردو زبان کے بہترین شاعر تھے آپ کے اشعار بڑے اچھے ہوتے تھے۔ میرے کرم فرما اور دلی کے مشہور ادیب فیروز دہلوی صاحب تحریر فرماتے ہیں:

"مولوی صاحب نرے مولوی نہیں تھے وہ ادب کا بڑا پاکیزہ ذوق رکھتے تھے۔ کبھی کبھی شعر بھی کہتے تھے۔ اور ان کا تخلص فقیر تھا مولوی صاحب کی شعری تخلیقات حمد و نعت اور غزلوں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا ذوق شعری کس قدر بلند تھا۔ جگر مرادآبادی اور مولوی صاحب نے ایک مرتبہ ساتھ ساتھ حج کیا، مکہ میں دوران قیام مولوی صاحب نے ایک غزل جگر صاحب کی خدمت میں بغرض اصلاح پیش کی۔ جگر صاحب نے پہلے تو غزل دیکھنے سے انکار کیا جب مولوی صاحب کا اصرار بڑھا تو انھوں نے غزل پڑھی اور پھر مودبانہ انداز میں کھڑے ہو گئے۔ مولوی صاحب میں اور آپ کی غزل پر اصلاح مجھ سے یہ ہرگز نہیں ہوگا۔ آپ تو تلمیذ الرحمن ہیں۔ آپ کو اصلاح کی ضرورت نہیں۔"

قومی آواز مورخہ ۲۱ جنوری سنہ ۱۹۸۶ء

مولانا محمد یوسف فقیر مرحوم اردو کے ایک ممتاز نعت گو شاعر تھے۔ موصوف نعت گوئی میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے، بڑے والہانہ انداز میں کہتے تھے۔ مولانا فقیر کے نعتیہ اشعار ملاحظہ فرمائیں ؎

بگڑی ہوئی تقدیر کو کس طرح بنالوں
روٹھے ہوئے محبوب کو کس طرح منالوں
اے فخرِ رسل، راحتِ جاں، روحِ دوعالم
دل چاہتا ہے کہ آپ کو مہمان بنالوں
جبرئیل نہیں، خلد نہیں، عرش نہیں یاں
ہاں اگر آپ آئیں تو آنکھوں میں بٹھالوں
ایک لمحہ ٹھہر جاؤ، چلے جانا میری جان
میں دردِ محبت کا فسانہ تو سنالوں
رکھ دیجئے ذرا پائے منور مرے سر پر
پاپوش مبارک کو آنکھوں سے لگالوں
کیا لطف ہو گر حشر میں سردار دوعالم
فرمائیں فقیرؔ تجھے دامن میں چھپالوں

انتقال

مولانا محمد یوسف فقیرؔ دہلوی نے ۱۶ر جنوری ۱۹۸۶ء کو داعی اجل کو لبیک کہا آپ کی خواہش کے مطابق حضرت شاہ ولی اللہ، شاہ عبدالقادر اور دیگر خاندان ولی اللہی کے بزرگوں کے قدموں میں دفن کئے گئے۔ آپ کی لوح تربت پر آپ کا ہی یہ شعر درج ہے۔

؎ نہ یہ گلشن رہے گا اور نہ اس کا رنگ و بو باقی
فنا ہے ذرّے ذرّے کو رہے گا تو ہی تو باقی

مولانا حفیظ الرحمان واصفؔ

ولادت

مولانا مفتی حفیظ الرحمان واصفؔ دہلوی کی پیدائش ۱۳۳۲ھ — ۱۹۱۰ء میں دہلی کے چہل امیران (کوچہ چیلان) میں ہوئی۔ یہ کوچہ زمانہ قدیم سے وزراء، امراء اور علم و ہنر کا مولد و مسکن رہا ہے۔ مثلاً حکیم مومن خاں مومنؔ دہلوی، خواجہ میر دردؔ، منشی ذکاء اللہ دہلوی، سرسیّد احمد خان مرحوم، مصور غم مولانا راشد الخیری، بیرسٹر آصف علی، ملا واحدی، مفتی اعظم مولانا کفایت اللہؒ اور سحبان الہند مولانا احمد سعید دہلوی جیسی ممتاز ہستیاں اسی کوچہ میں رونق افروز رہ کر پوری دنیا کو اپنے علم و فن سے منور کرتی رہیں۔ ....
اور حضرت مولانا مفتی حفیظ الرحمان واصفؔ دہلویؒ بھی اسی کوچہ کے مایۂ ناز فرزند تھے۔ مولانا اس زنجیرِ علم و فن کی آخری کڑی ہی تھے۔ مولانا واصفؔ صاحب دہلوی دنیائے اسلام کی عظیم شخصیت مفتی اعظم مولانا کفایت اللہؒ کے فرزند ارجمند تھے۔

شجرۂ نسب

آپ کا سلسلۂ نسب شیخ عنایت اللہ بن شیخ فیض الدین بن شیخ خیر اللہ بن شیخ عباد اللہ کے واسطوں سے شیخ جمال یمنی سے جا کر مل جاتا ہے جن کا وطن جزیرۃ العرب کا جنوبی خطہ یمن ہے۔

یہ لوگ بحرین سے موتی خرید کر ہندوستان اور لنکا وغیرہ میں لا کر فروخت کرتے تھے۔ بعد میں آپ کے خاندان نے ہندوستان کے مختلف گوشوں مثلاً بھوپال، دہلی، اتر پردیش اور پنجاب وغیرہ میں سکونت اختیار کر لی۔ اور انھیں مقامات کو اپنا وطن بنا لیا۔ جن میں آپ کے جد امجد شیخ عنایت اللہ نے شاہجہاں پور یوپی کو اپنا مسکن بنایا اور یہیں اپنی زندگی کے آخری لمحات گزار کر اپنے مولیٰ سے جا ملے اور آپ کے والد ماجد حضرت مفتی کفایت اللہ نے دہلی کو ہی اپنا میدان عمل بنایا اور ساری زندگی دہلی میں رونق افروز رہے۔

مولانا حفیظ الرحمان واصفؔ صاحب دہلی میں اپنے والد محترم کے ساتھ رہے اور یہیں نشو ونما پائی۔

تعلیم وتکمیل

حضرت مفتی حفیظ الرحمان واصفؔ دہلوی نے علوم قرآن، حدیث اور فقہ کی تعلیم اپنے فخر روزگار والد مفتی اعظم حضرت مولانا محمد کفایت اللہ دہلوی کے زیر سایہ مدرسہ امینیہ میں ہی حاصل کی۔ حضرت مفتی صاحب نے ایک فرض شناس والد کی شایان شان بلکہ اپنی بساط سے کہیں زیادہ اپنے فرزند ارجمند کی تعلیم وتربیت کا انتظام واہتمام فرمایا اور اس لائق فرزند

نے بھی حضرت مفتی اعظم کی محنت کو رائیگاں نہیں جانے دیا اور حضرت مفتی اعظم اس جوہر آبدار کو جتنا نکھارنے کی سعی فرماتے وہ "جوہر" اپنی آب وتاب میں اس سے سوا اضافہ کرتا اور آخر کار یہ "جوہر آبدار" ماہتاب تابناک بن کر دنیا کو روشن کرنے لگا۔

درس وتدریس

مفتی واصف صاحب رسمی تعلیم سے فراغت کے بعد فوراً ہی درس وتدریس میں مصروف ہو گئے۔ لہٰذا ۱۹۳۳ء میں محکمہ تعلیم دلی نے آپ کو اپنے محکمہ میں استاذ عربی مقرر کیا۔ جہاں آپ نے اپنی غیر معمولی علمی لیاقت وصلاحیت کی بنا پر انتہائی پر وقار طریق پر تشنگان علوم کے سینوں کو نور علم سے منور فرمایا مگر ۱۹۳۷ء میں خانگی مصروفیات کی وجہ سے آپ کو یہ سلسلہ منقطع کرنا پڑا اور آپ محکمہ تعلیم سے مستعفی ہو گئے۔ اس کے بعد حضرت مفتی اعظم مولانا محمد کفایت اللہ دہلوی کی ایما پر کتب خانہ رحیمیہ کا انتظام سنبھالا اور آپ نے کتب خانہ کو بڑی ترقی دی۔ حالانکہ آپ کا مزاج علمی ہونے کی بنا پر کاروباری الجھنوں کا متحمل نہ تھا۔ مگر اپنی غیر معمولی صلاحیتوں اور انتھک جد وجہد کی بنا پر کتب خانہ کو اتنا بام عروج پر پہونچایا کہ تھوڑے سے ہی عرصہ میں کتبخانہ رحیمیہ کا شمار دہلی کے صف اول کے کتبخانوں میں ہونے لگا۔

مدرسہ امینیہ کا اہتمام

۱۹۵۲ء میں حضرت مفتی اعظم کی وفات کے بعد مدرسہ امینیہ کے پہلے نائب مہتمم اور پھر مہتمم بنائے گئے۔ آپ نے مدرسہ امینیہ کے نظم ونسق کو

بڑی دانشمندی اور دوراندیشی کے ساتھ چلایا۔ اور آپ کے زمانۂ اہتمام میں مدرسہ نے کافی ترقی بھی کی مگر بعض ذمہ داران کے طرزِ عمل سے آپ بددل ہوگئے اور ۱۳۹۹ھ ۔ ۱۹۷۹ء میں آپ نے استعفیٰ دیکر مدرسہ سے علیحدگی اختیار کرلی اور گوشہ نشین ہوگئے۔

تصنیف و تالیف

مولانا حفیظ الرحمان واصف صاحب دہلوی مایۂ ناز ادیب اور بلند پایہ محقق تھے۔ آپ کو دلی کی زبان اور محاورات پر بڑی قدرت حاصل تھی۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو لکھنے پڑھنے کا بڑا صاف ستھرا ذوق و مذاق عطا فرمایا تھا۔ آپ کا شمار کثیر التصانیف مصنفین میں ہوتا ہے۔ آپ کی شاہکار تصانیف حسب ذیل ہیں۔

اردو مصدر نامہ، ادبی بھول بھلیاں، زرگل، تذکرۂ سائل، سہ لسانی مصدر نامہ، قرآنی پند نامہ اور کفایت المفتی۔

آخر الذکر کتاب اصلاً آپ کے والد ماجد حضرت مفتی اعظم محمد کفایت اللہ صاحب کے فتاویٰ کا مجموعہ ہے۔ نہ صرف یہ کہ آپ نے بڑی عرق ریزی و جانفشانی کے ساتھ والد محترم کے فتاویٰ کو مرتب فرماکر ۹ جلدوں میں شائع کیا بلکہ آپ نے بعض اہم فتاویٰ پر نہایت ہی قیمتی حواشی بھی تحریر فرمائے ہیں جن سے آپ کی فقہی بصیرت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

شعر و سخن

مولانا مفتی حفیظ الرحمان واصف دہلوی مرحوم اردو کے مایۂ ناز شاعر تھے آپ کو ابوالمعظم نواب سراج الدین احمد خان سائل دہلوی سے شرف

تلمذ حاصل تھا۔ حضرت سائل مرحوم سے شاگردی کی نسبت اور تعلق کی بنا پر واصف مرحوم ادبی و علمی حلقوں میں بڑی قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ اور واصف مرحوم کو بھی اپنے استاذ حضرت سائل مرحوم پر فخر و ناز تھا۔ واصف فرماتے ہیں ؎

دعویٰ نہیں واصف کسی فن میں مجھ کو
حاصل نہیں شہرت بھی وطن میں مجھ کو
قدر اس لئے کرتے ہیں سخنور میری
سائل سے تلمذ ہے سخن میں مجھ کو

گوشہ گمنامی یا کسر نفسی

حضرت واصف مرحوم دلی میں گمنام نہیں تھے۔ یہ آپکی کسر نفسی تھی ورنہ آپ غالب اور میر کے شہر دلی میں سند کی حیثیت رکھتے تھے اور ارباب زبان و ادب آپ کی روزمرہ کی گفتگو میں داغ اور سائل کی زبان کی لذت و شیرینی محسوس کرتے تھے۔ اور آپ کو داغ و سائل کی یادگار تصور کرتے تھے۔ اور یہ بھی اپنی جگہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ دوسرے باکمال ادیبوں و شاعروں اور فنکاروں کی طرح آپ بھی اپنوں اور غیروں کی قدر ناشناسی کا شکار ہونے سے نہ بچ سکے جس کا مفتی واصف صاحب کو شدید احساس تھا اور اس کا اظہار واصف مرحوم ان الفاظ میں فرماتے ہیں۔

گمنام و کم آمیز ہوں معدوم نہیں ہوں
حیرت ہے کہ اپنوں کو بھی معلوم نہیں ہوں
ہے ذرۂ ناچیز بھی اک پارۂ خورشید
دیکھو تو سہی! نقطۂ موہوم نہیں ہوں

کیونکہ میرا گھر تم کو ملے، کون بتائے
القاب و خطابات سے موسوم نہیں ہوں
واصف دہلوی

مفتی واصف صاحب مرحوم کے اشعار بڑے شستہ اور فصیح و بلیغ ہوتے تھے۔ آپ اکثر دلی کی سادہ زبان اور حضرت سائل و نوح کی زمینوں میں اشعار کہتے تھے۔ بقول خواجہ احمد فاروقی صاحب

"واصف صاحب بڑے بامزہ اور بے عیب شعر کہتے تھے"

غزل کے چند اشعار ملاحظہ ہو۔

مجھے جام مے جو عطا ہوا یہ تری نوازش عام ہے
مجھے اک نظر سے نواز دے کہ جنوں مرا ابھی خام ہے
تجھے ابتدا کی خبر نہیں تجھے انتہا میں کلام ہے
تو سمجھ رہا ہے کہ زندگی یہی صبح ہے یہی شام ہے
کسی رہنما کا نہ کر گلہ ترا عزم ہی خام ہے
جو سنبھل سنبھل کے بڑھا چلے وہی رہنما ہے امام ہے
تری جستجو میں چلا تھا میں مجھے ہست و نیست کی کیا خبر
یہ مقام کونسا آ گیا نہ سفر ہے اب نہ قیام ہے
یہ ہمارے عشق کا ارتقا کہ نکھر نکھر کے نظر بنے
نہ سوال ہے نہ جواب ہے نہ کلیم ہے نہ کلام ہے
سر راہ رات کو محتسب جو ملا تو یہ کھلا
پیو چھپ کے مے تو حلال ہے کوئی دیکھ لے تو حرام ہے
کہے کیا یہ واصف بینوا کہ ہے زندگی کا نظام کیا
وہی داغ ہجر کی تابشیں وہی اختر سر شام ہے

عادات وخصائل

حضرت مفتی حفیظ الرحمان صاحب واصف مرحوم بڑے با اخلاق، وضعدار کم آمیز، کم گو اور منکسر المزاج انسان تھے نہ صرف یہ کہ آپ دلی کی تہذیب وثقافت کا نکھرا ہوا نمونہ تھے۔ بلکہ آپ کو دہلی کی تہذیب وروایت سے والہانہ تعلق تھا۔ آپ کو دہلی اور دہلی کے مرحوم مشاہیر سے بھی بڑی محبت تھی۔ آپ بڑی حسرت کے ساتھ کہتے ہیں۔

اب کہاں واصف ملیں گی وہ گذشتہ صحبتیں
اب وہ باتیں سربسر خواب پریشاں ہو گئیں

مفتی صاحب کی زیارت

مولانا حفیظ الرحمان صاحب واصف مرحوم بلاشبہ فقیہہ باپ کے فقیہہ بیٹے تھے لیکن راقم الحروف کا خیال ہے کہ آپ بلند پایہ ادیب بلکہ آپ کا ادبی ذوق تمام دوسرے مزاقوں پر غالب تھا۔ آپ میدان زبان وادب کے شہسوار تھے۔ راقم الحروف نے جب کبھی آپ کی زیارت کی تو آپ کو لغات ومحاورات کی تحقیق وتدقیق اور الفاظ کے حسب ونسب کی تلاش وجستجو میں ہی محو اور سرگرداں پایا۔

حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو جس ادبی ذوق ومہارت سے نوازا تھا اس کے مثیل اس دور میں نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہیں۔ جیساکہ پروفیسر خواجہ احمد فاروقی تحریر فرماتے ہیں کہ:

"وہ بلاشبہ عربی، فارسی اور اردو تینوں علوم میں خاک دہلی کے آخری فرزند تھے۔ ان کے بعد ان علوم کے جوہر شناس اور جامع

شاید ہی اٹھیں۔"

فن خطاطی

مفتی صاحب اپنے عہد کے عمدہ خطاط اور خوشنویس بھی تھے۔ آپ کو خوشنویسی میں سلطنت مغلیہ کے آخری تاجدار بہادر شاہ ظفر سے فخر انتساب حاصل تھا۔

آپ نے خط نسخ میں استاذ عبد الغنی دہلوی سے اصلاح لی ہے جو اپنے والد اور استاذ منشی ممتاز علی کے واسطہ سے اعلیٰ حضرت کے شاگرد تھے۔ مفتی صاحب کے ہاتھ کے بنائے ہوئے بیش قیمت طغرے آج بھی دیوار ودر پہ آویزاں ہیں۔ ان طغروں سے واصف صاحب کے فنی کمال کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

مشہور صحافی جمیل مہدی مرحوم تحریر فرماتے ہیں کہ:

"جگر مراد آبادی کے بعد مولانا واصف ہی اردو کے ایسے شاعر تھے جو خوشنویسی میں بھی ید طولیٰ رکھتے تھے۔ اور جن کے بارہ میں کہا جاسکتا تھا کہ اگر وہ شاعر نہ ہوتے تو بہت بڑے خطاط اور خوشنویس ہوتے۔ انھوں نے خوشنویسی نہ صرف اپنے والد سے ورثہ میں پائی تھی بلکہ مشق ومحنت کے ذریعہ اس میں استادانہ مہارت بھی حاصل تھی۔"

نکاح واولاد

مولانا حفیظ الرحمان صاحب دہلوی کا پہلا عقد ۱۹۳۳ء میں دلی کے مشہور عالم اور مجاہد آزادی مولوی سمیع اللہ قاسمی صاحب کی بہن سے ہوا تھا۔

یہ نہایت ہی نیک اور صوم وصلوۃ کے پابند خاتون تھیں۔ ان کے بطن سے ایک صاحبزادی اور چار صاحبزادے تھے یہ سبھی بقید حیات ہیں۔ مولوی سمیع اللہ قاسمی صاحب کی بہن کے انتقال کے بعد ۱۹۴۷ء میں مولانا امین الدین صاحب بانی مدرسہ امینیہ کی نواسی اور سید جلال الدین مرحوم کی صاحبزادی سے آپ کا عقد ثانی ہوا جن کے بطن سے ۴ صاحبزادیاں اور تین صاحبزادے ہیں۔ الحمد للہ سبھی صاحبزادیاں اور صاحبزادے بقید حیات ہیں۔

انتقال پُر ملال

مولانا حفیظ الرحمان واصف دہلوی صوفی اور مرد حق آگاہ بزرگ تھے آپ کے کلام میں تصوف کا رنگ غالب تھا واصف صاحب کا آخری کلام وہ دعائیہ مناجات ہے۔ اس کے مقطع میں وہ کس خوبی سے دنیائے فانی سے بیزاری اور مولی حقیقی کے وصال کی آرزو کرتے ہیں۔ ؎

یہ وسیع صحن گلشن ہے قفس سے بڑھکے واصف
وہ سواد کوئے جاناں وہ فضا کہاں سے لاؤں

واصف صاحب کی یہ آرزو وصال پوری ہوئی اور آپ یہ کہتے ہوئے ۱۳ مارچ ۱۹۸۷ء کو واصل بحق ہوئے۔ ؎

کیوں یکایک اہل محفل پہ اداسی چھا گئی
ہمدمو! دل تھام لو واصف کی باری آگئی

آپ کو مفتی عتیق الرحمن عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کی قبر سے قریب ہی قبرستان مہندیان میں سپرد خاک کر دیا گیا۔

مولانا امداد صابری

سن پیدائش

مولانا امداد صابری ۱۶ر اکتوبر ۱۹۱۴ء میں جمعہ کے دن دہلی کے ایک مشہور علمی اور مذہبی گھرانے میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد ماجد کا اسم گرامی مولانا شرف الحق تھا۔ مولانا شرف الحق مرحوم، شیخ العرب والعجم حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی کے خلیفہ اور اپنے عہد کے مشہور و معروف مناظر تھے۔

مولانا شرف الحق صاحب عیسائیوں اور آریہ سماجیوں سے زور دار انداز میں مناظرے کرتے اور ان پر اسلام کی حقانیت ثابت کرتے تھے۔ مولانا شرف الحق صاحب مرحوم مطالعہ کے بہت ہی شائق اور علم نواز انسان تھے اور شوق مطالعہ نے آپ کو ہر علم و فن کی کتب جمع کرنے پر مجبور کیا اور آپ نے اتنی کتابیں جمع فرمائیں کہ آپ کی ذاتی کتب کا ذخیرہ ایک مختصر سی لائبریری کا درجہ رکھتا ہے۔ آپ تمام عمر کتابوں سے اکتساب فیض کرتے رہے اور اس دنیا سے رخصت ہونے کے وقت یہ بیش بہا خزانہ اپنے ہونہار اور علم نواز فرزند مولانا امداد صابری مرحوم کے لئے چھوڑ گئے اور مولانا مرحوم

نے بھی اس کی قدر دانی کا حق ادا کر دیا۔ اور نہ صرف یہ کہ اس خزانہ بیش بہا کی حفاظت فرمائی بلکہ اس ترکہ پدری سے ساری زندگی بھر پورا استفادہ کرتے رہے اور اس میں جدید جواہر پاروں کا اضافہ بھی فرمایا۔

اب تو مولانا امداد صابری مرحوم کے عزیزوں اور صاحبزادوں پر یہ فریضہ عائد ہوتا ہے کہ وہ اپنے آبا و اجداد کی علمی امانت کی نگہبانی کریں اور اس آبائی ترکہ سے استفادہ کریں اور اس کی حفاظت سے قاصر ہوں تو کسی عمدہ لائبریری کے حوالہ کر دیں تاکہ خلق خدا اس سے فیضیاب ہو اور آپ کے والد مرحوم اور دادا جان کے لئے صدقۂ جاریہ بن جائے ورنہ مجھے اندیشہ ہے کہ خدانخواستہ کہیں ڈپٹی نذیر احمد مرحوم کی لائبریری کی طرح مولانا شرف الحق صاحب کا یہ علمی ذخیرہ بھی ضائع نہ ہو جائے۔

تعلیم و تربیت

مولانا امداد صابری نے دستور زمانہ کے مطابق ابتدائی تعلیم گھر پر رہتے ہوئے حاصل کی اس کے بعد علوم دینیہ قرآن و حدیث کی اعلیٰ تعلیم کے لئے مظاہر العلوم تشریف لے گئے جہاں اس وقت ظاہری و باطنی علوم کے ماہرین کا اجتماع تھا لہٰذا ان کے فیوض و برکات سے خوب خوب مستفیض ہوئے۔ اور اکثر کتابیں اپنے والد صاحب سے پڑھیں اور ادیب فاضل اور منشی کامل وغیرہ کے امتحانات میں شرکت کر کے اعلیٰ نمبرات سے کامیابی حاصل کی۔

مولانا شرف الحق صاحب مرحوم نے اپنے ہونہار صاحبزادے کی تعلیم و تربیت کا بہت عمدہ نظم فرمایا اور آپ کی ایسی تربیت کی جو دہلی کی قدیم تہذیب و ثقافت کی نمائندگی کرتی تھی، لہٰذا بلاشبہ مولانا امداد صابری مرحوم دہلی کی روایتی

تہذیب وثقافت کا نکھرا ہوا نمونہ ثابت ہوئے اور جن لوگوں نے مولانا کو قریب سے دیکھا ہے وہ اس اعتراف پر مجبور رہیں۔

عادات وخصائل

مولانا امداد صابری انتہائی خلیق، ملنسار اور دوست و دشمن سب کے ہمدرد وغمگسار تھے مگر مولانا کبھی بھی مصلحت پسندی کا شکار نہیں ہوتے تھے بلکہ آپ کی سب سے بڑی خوبی یا کمزوری یہی تھی کہ آپ ناجائز و ناحق بات پر ہرگز ہرگز مصالحت نہیں کر سکتے تھے۔ اسی بنا پر بعض ناواقف لوگ آپ کو متشدد اور سخت مزاج تصور کرتے تھے۔ حالانکہ موصوف اپنی ذات کی حد تک بڑے ہی متواضع، منکسر المزاج اور نرم طبیعت انسان تھے۔ البتہ باطل کے مقابلہ میں یقیناً انتہائی متشدد تھے۔

تصنیف وتالیف

مولانا امداد صابری بیسویں صدی کے نامور محقق، بہترین ادیب اور ایماندار صحافی تھے اور اس کے ساتھ ساتھ کثیر التصانیف عالم بھی تھے۔ آپ نے تقریباً ہر موضوع پر قلم اٹھایا اور بہت سی معرکۃ الآراء کتابیں تصنیف فرمائیں جن میں چند اہم اور ناقابلِ فراموش کتابیں یہ ہیں۔

"تاریخ اردو صحافت" (۶ حصے) "فرنگیوں کا جال"، "تاریخ جرم وسزا" (۳ جلدیں)، "نیتاجی سبھاش چندر بوس"، "آزاد ہند فوج کا مقدمہ"، "امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد"، اور "دلی کی یادگار شخصیتیں" وغیرہ وغیرہ۔

تاریخ اردو صحافت

مولانا امداد صابری مرحوم کے بے شمار علمی و تحقیقی اور سیاسی ایسے کارنامے ہیں جن پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور بہت کچھ لکھا جائے گا۔ لیکن راقم الحروف کے خیال میں آپ کی ۸۰ سالہ علمی و ادبی زندگی کا سب سے بڑا روشن و تابناک کارنامہ "تاریخ اردو صحافت" کی ترتیب و تدوین ہے جس کے کئی حصے ہیں۔ غالباً ان میں سے ابھی تک صرف تین ہی حصے منصۂ شہود پر آسکیں ہیں جن میں ۱۹۰۰ء تک کے اخبارات و جرائد کا حال درج ہے۔ اس کتاب کی تدوین مولانا کو کن کاوشوں کا سامنا کرنا پڑا اس کو ہندوستان کے نامور صحافی اور اس صدی کے انتہائی کثیر الاشاعت روزنامہ قومی آواز کے ایڈیٹر عشرت علی صدیقی کے الفاظ میں ملاحظہ فرمایئے۔

"یہ کتابیں معلومات کا بیش بہا خزانہ ہیں اور اردو زبان کا اتنا بڑا خزانہ کہیں اور دستیاب نہیں۔ مولانا نے یہ خزانہ تن تنہا اکٹھا کیا اسکے لئے در در کی خاک چھانی اور دور دور کا سفر کیا۔ کباڑیوں کی دکانیں دیکھیں، لائبریریوں میں گئے۔ جہاں کہیں کسی اخبار یا رسالے کے فائل یا پرانے پرچے ملنے کی امید ہوئی وہاں پہونچ گئے۔ ان کی فہرست مرتب کرنے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ ان کا تنقیدی جائزہ لیا۔ اس طرح ان کی "تاریخ اردو صحافت" زبان و ادب کی تاریخ اور سماجی و معاشی و سیاسی حالات کی معلومات افزا دیدہ دین گئی۔"

قومی آواز ۲۴ اکتوبر ۱۹۸۸ء

شعروشاعری

مولانا امداد صابری کو شعروشاعری سے بھی دلچسپی رہی ہے۔ ابتدا میں انھوں نے چند غزلیں بھی تخلیق کیں لیکن مولانا صابری کا شعری مجموعہ یا تو مرتب نہ ہوسکا اور اگر مرتب ہوا تھا تو تلف ہوگیا۔ بہرحال اب موجود نہیں ہے۔

مولانا امداد صابری صاحب کو مولانا حسرت موہانی اور رسائل دہلوی سے شرف تلمذ حاصل تھا۔ مولانا امداد صابری کا شروع میں چمن تخلص تھا۔ بالکل شروع کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں۔ ؎

لاکھ جلوے کئے پیدا تیری یکتائی نے
زینت ہر دو جہان کی تیری زیبائی نے

آنکھ سے آنکھ ملی اور نہ ہوئی بات کوئی
صبح کر دی ہے شب وصل کی انگڑائی نے

بل سے بل کھاتی ہے اندھیر مچا رکھا ہے
زلف کو چھیڑ دیا ہے کسی سودائی نے

آج ہر شہر میں ہے حسن کا چرچا تیرے
ایک عالم کو لبھایا تیری رعنائی نے

اے چمن دیکھ تو فرعون کا کیا حشر ہوا
قعر دریا میں ڈبو دیا ہے من مائی نے

غزل کے چند اشعار اور ملاحظہ فرمائیں۔

چمن میں باد صبا مدتوں میں آئی ہے
بہار روٹھ گئی تھی منا کے لائی ہے

ہمیں نے دار ورسن کے طلسم توڑے ہیں
ہمیں نے ظلم وستم کی جبیں جھکائی ہے
نہ ہونے دیں گے چراغ وفا کی لَو مدھم
قسم لہو کی شہیدوں کے ہم نے کھائی ہے
وہ راہرو جنھیں منزل سے اپنی پیار نہ تھا
نئی حیات انھیں رستے میں چھوڑ آئی ہے
لہو سے دل کے بنائے ہیں اس کے نقش و نگار
عروس عہد وفا ہم نے جب سجائی ہے

سیاسیات

مولانا امداد صابری کامیاب سیاست دان تھے، آپ کی سیاسی زندگی بڑے طوفانی ادوار سے گزری۔ موصوف کانگریس سے لے کر سوشلسٹ پارٹی، جنتا پارٹی اور بھارتیہ جنتا پارٹی تک بہت ساری جماعتوں سے وابستہ رہے۔ مولانا مرحوم نے آخر میں بھارتیہ جنتا پارٹی سے استعفیٰ دیدیا تھا اور مسلم لیگ سے وابستہ ہوگئے تھے۔

مولانا امداد صابری ۱۹۶۷ء میں سب سے پہلی بار دہلی میٹرو پولیٹن کونسل کے ممبر منتخب ہوئے۔ اس کے بعد ۷۷ء میں جنتا پارٹی سے حلقہ مٹیا محل سے کارپوریشن کے ممبر چنے گئے اور ڈپٹی میئر کے عہدہ پر فائز رہے۔ ۱۹۸۳ء میں بھارتیہ جنتا پارٹی کے ٹکٹ پر دوبارہ میونسپل کارپوریشن کے ممبر منتخب ہوئے۔

نیتاجی سبھاش چندر بوس کی رفاقت

مولانا امداد صابری اصلاً نیتاجی سبھاش چندر بوس کے نظریات کے پر جوش حامی تھے۔ موصوف نے نیتاجی کو بہت قریب سے دیکھا تھا۔ سبھاش چندر بوس بھی مولانا امداد صابری مرحوم کے مکان (چوڑیوالان) آیا کرتے تھے اور گھنٹوں سیاسی معاملات پر تبادلۂ خیال کرتے تھے۔ مولانا صابری کو نیتاجی سے کس قدر تعلق تھا کہ جب ۱۹۳۹ء میں نیتاجی نے کانگریس سے استعفیٰ دیا تو مولانا صابری مرحوم بھی کانگریس سے مستعفی ہو گئے۔ مولانا امداد صابری ایک مرتبہ علی محمد شیر میوات صاحب سے ملنے جھندیاں تشریف لائے۔ اتفاق سے راقم الحروف بھی موجود تھا۔ موقعہ کو غنیمت تصور کر کے مولانا مرحوم سے وہی گھسا پٹا سوال کر دیا، جو عام طور پر سبھاش چندر بوس کے متعلق کیا جاتا ہے کہ سبھاش چندر بوس زندہ ہیں یا مر گئے۔ مولانا امداد صابری مرحوم نے کہا میاں اب نیتاجی اس دنیا میں کہاں رہے ؟

اردو اخبارات کے بارے میں مولانا کی بیباک رائے

اردو صحافت کے بارے میں مولانا کا ٹھوس اور بے لاگ فیصلہ یہ ہے کہ اردو صحافت پر یہ الزام دینا کہ وہ فرقہ پرست ہے۔ سراسر افتراء و بہتان ہے۔ لہٰذا اس سلسلہ میں سہیل وحید صاحب نے مولانا امداد صابری مرحوم سے دریافت کیا کہ واقعی اردو صحافت فرقہ پرست ہے؟ تو مولانا صابری نے بلا کسی پس و پیش کے جواب دیا کہ :

"اردو اخبارات کا رویہ ہے وہ فرقہ پرست نہیں ہے بلکہ مدافعت کا ہے۔ میں نے پوچھا وہ کیسے کہنے لگے اردو پریس جس طبقے

کی نمائندگی کرتا ہے وہ مظلوم ہے، دس بار، بیس بار، پچاس بار سو بار آخر کب تک حملے برداشت کئے جائیں گے۔ آخر میں مدافعت کے قدم اٹھانا ہی پڑیں گے۔

حقیقت تو یہ ہے کہ ہندی پریس فرقہ پرست ہے۔ کشمیر میں فساد ہوں تو ہندی پریس کا رویہ دیکھئے کیا ہوتا ہے۔ فساد آخر فساد ہے چاہے جہاں ہو۔

مولانا صابری نے مزید کہا کہ:

کیا کوئی ایسی مثال مل سکتی ہے کہ اردو پریس نے کسی مذہب کی توہین کی ہو یا کسی مذہب کی مخالفت کی ہو۔"

قومی آواز ۱۶ر نومبر ۶۸۸

صفات و کمالات

مولانا گوناگوں صفات و خصوصیات کے مالک تھے، مولانا ایک عالم دین بھی تھے اور ایک ماہر سیاست دان بھی۔ مولانا عمدہ مصنف بھی تھے اور انشاء پرداز صحافی بھی۔ مولانا مورخ بھی اور سراپا تاریخ بھی، مولانا اہل حق کے لئے شیر و شکر تھے تو اہل باطل کے لئے تلوار بے نیام بہرحال مولانا ان صفات کے ساتھ زندگی گزار کر آخر کار ۱۴ر اکتوبر ۸ ۶۸ کو اپنے مولائے حقیقی سے جا ملے۔ اور قبرستان مہندیان میں شاہ ولی اللہؒ کے مزار اقدس کے قریب صرف ۷۔۸ میٹر کے فاصلے پر بجانب مغرب آسودہ خواب ہو گئے۔ و رحمۃ اللہ رحمۃ واسعۃ

مولانا محمد مسلم

مولانا محمد مسلم صاحب کا تعلق غازی سالار مسعودؒ کے سرفروش خاندان سے تھا۔ غازی سالار مسعود کا خاندان ۱۸۵۷ء میں تحریک حریت وطن میں پرجوش حصہ لیا جس کی پاداش میں خاندان کے ۱۹ آدمیوں کو پھانسی دی گئی تھی۔ اس پورے خاندان میں اس وقت ایک کمسن بچے زندہ سلامت رہ گئے تھے۔ جو نہ جانے کس طرح چھپتے چھپاتے ریواڑی سے بھوپال پہونچ گئے۔ یہ مولانا محمد مسلم صاحب کے دادا قمرالدین صاحب مرحوم تھے۔

قمرالدین صاحب مرحوم کے ایک صاحبزادے محمد مستقیم تھے جو نہایت جری اور ایماندار انسان تھے۔ محمد مستقیم کے دو صاحبزادے ——— غیور حسن اور محمد مسلم تھے۔

تاریخ پیدائش

مولانا محمد مسلم کی پیدائش ۲۰ ستمبر ۱۹۲۷ء میں بھوپال میں ہوئی آپ نے

عربی، فارسی اور انگریزی کی تعلیم گھر پر حاصل کی۔ گھریلو حالات نے آپ کی باقاعدہ تعلیم کو میٹرک سے آگے نہیں پڑھنے دیا۔ آپ اپنی دلی خواہش کے باوجود اعلیٰ تعلیم سے محروم رہے۔

خاکسار تحریک

مولانا محمد مسلم صاحب ابتداء ہی سے سماجی اور تحریکی انسان تھے۔ آپ عنفوان شباب ہی میں علامہ عنایت اللہ المشرقیؒ کی خاکسار تحریک سے وابستہ ہو گئے تھے۔ جب علامہ مشرقی نے خاکسار تحریک توڑ دینے کا اعلان کیا تو محمد مسلم صاحب بھی قدرتی طور پر اس جماعت سے علیحدہ ہو گئے۔ مگر بعد میں جماعت اسلامی کے قیام کے اولین دور میں ہی اس سے وابستہ ہو گئے اور زندگی کی آخری سانس تک اس سے وابستہ رہے۔

میدان صحافت

محمد مسلم صاحب اردو کے صف اول کے صحافیوں اور جرنلسٹوں میں تھے۔ آپ نے اپنی صحافتی زندگی کا آغاز روزنامہ "ندیم" بھوپال کی ادارت سے کیا تھا۔ ۱۹۵۶ء میں بھوپال سے دہلی آئے اور سہ روزہ دعوت کے ایڈیٹر مقرر ہو گئے اور سہ روزہ دعوت ۱۹۵۹ء میں روزنامہ ہو گیا تو آپ اس روزنامہ کے بھی ایڈیٹر رہے۔

محمد مسلم صاحب ایک دینی جماعت کے نمائندہ ہونے کے باوجود پوری ملت کے مسائل پر ایماندارانہ اور مخلصانہ طور پر لکھتے تھے۔ مولانا سید نظام الدین ناظم امارت شرعیہ پھلواری شریف پٹنہ لکھتے ہیں کہ:

"مسلم صاحب بڑے سلجھے ہوئے اور متوازن ذہن کے صحافی تھے۔

اور ملی مسائل کے بارے میں ان کا نقطۂ نظر ہمیشہ تعمیری ہوتا تھا۔ جذباتی مسائل پر لکھتے وقت بھی جذبات سے مغلوب نہیں ہوتے تھے۔ مزاج میں بے حد سادگی اور انکساری تھی۔
صحافت کو صرف پیشہ نہیں بلکہ ایک مقدس مشن سمجھتے تھے۔ اور لکھتے وقت برابر ان کو یہ احساس رہتا تھا کہ قلم سے کوئی ایسی بات نہ نکل جائے جو آخرت کی رسوائی کا باعث ہو۔"

مسلم مجلس مشاورت

مولانا محمد مسلم صاحب آل انڈیا مسلم مجلس مشاورت اور آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے فعال و متحرک رکن تھے۔ آپ نے ڈاکٹر عبد الجلیل فریدیؒ، ڈاکٹر سید محمودؒ اور مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی صاحبؒ کے ساتھ مشاورت کے پلیٹ فارم سے بڑا تعمیری کام کیا تھا۔ مولانا مجاہد الاسلام صاحب قاسمی قاضی امارت شرعیہ پٹنہ پھلواری شریف تحریر فرماتے ہیں کہ

"وہ (محمد مسلم) صحافتی مشغولیات کے ساتھ ملی سرگرمیوں سے بھی جڑے رہتے تھے۔ آل انڈیا مسلم مجلس مشاورت اور آل انڈیا پرسنل لا بورڈ کے رکن کی حیثیت سے اہم امور میں ان کے تعمیری مشوروں سے بڑا فائدہ ہوتا تھا۔"

عادات و اطوار

مولانا محمد مسلم صاحب بڑے متواضع، منکسر المزاج، قناعت پسند، خوش مزاج درویش صفت، غمگسار اور جذبہ خدمت گذاری سے سرشار انسان تھے۔ استاذ محترم ڈاکٹر اعجاز الدین خاں مرحوم سابق استاذ دار العلوم دیوبند بھی مسلم صاحب

کی قناعت پسندی، قلندر مزاجی اور جذبہ خدمت گذاری کے بہت زیادہ معترف اور مداح تھے۔ اسی طرح مولانا امداد صابری مرحوم مسلم صاحب کے جذبہ خدمت سے بے حد متاثر تھے۔ لہذا خود اپنا ایک واقعہ ان الفاظ میں تحریر فرماتے ہیں کہ:

راقم الحروف امداد صابری انبالہ جیل میں مسلم صاحب کے ساتھ تھا۔ انبالہ جیل میں جب میں بیمار پڑا اور کافی روزانہ دست آنے شروع ہو گئے تو مسلم صاحب اس حالت میں مجھے بیت الخلاء لے جاتے تھے۔ بعض مرتبہ جاتے جاتے اجابت ہو جاتی اور پاجامہ سن جاتا تو تہبند باندھ لیتا تھا اور وہ سنا ہوا پائجامہ مسلم صاحب دھوتے اور میری ٹانگوں کو دھلاتے بعض مرتبہ بیت الخلاء میں گھنٹوں بیٹھنا پڑتا تو مسلم صاحب دروازہ پر گھنٹوں کھڑے رہتے تھے۔ جب میں نکلتا تھا تو اپنے سہارے مجھ کو لے کر آتے تھے۔ رات کو کمرہ سے باہر برانڈے میں سوتا تھا رات کو کمرہ سے نکل کر نہ معلوم کتنی پھیرے لگاتے تھے۔ دستوں کی وجہ سے رات کو مشکل سے سونا ملتا تھا تو اس صورت میں مسلم صاحب کیسے سوتے ہوں گے رات کو بھی مجھ کو بیت الخلاء لے جاتے اور لاتے تھے جب انبالہ اسپتال چلا گیا تو روزانہ کسی نہ کسی صورت سے پرچہ بھیجوا کر مولانا یوسف صدیقی کی اور میری خیریت معلوم کراتے تھے اور مشورہ بھی دیتے تھے یہ خدمت گذاری کا جذبہ صرف میرے ہی ساتھ نہ تھا بلکہ جیل کے ساتھیوں کے ساتھ بھی یہی سلوک تھا۔ بہت سے ساتھیوں کے کپڑے تک دھوتے تھے۔ ہمارے ساتھیوں میں ہندو زیادہ تھے ان کے دماغ میں خدمت کرنے کے معاملہ میں ہندو مسلمان

کی کوئی تمیز نہ تھی"۔

وفات

مولانا محمد مسلم صاحب ایمرجنسی کے تاریک دور میں ۱۹ ماہ تک جیل کی تکالیف اور صعوبتیں برداشت کیں۔ اسی وقت سے آپ کی صحت دن بدن گرنے لگی تھی۔ باوجود معقول علاج معالجہ کے بھی آپ صحتیاب نہ ہوسکے آخر کار ۴؍ جولائی ۱۹۸۶ء کو داعی اجل کو لبیک کہہ گئے! آپ کی قبر مہندیان میں مدرسہ کے مہمان خانہ کی دیوار سے ملی ہوئی ہے۔ اور آپ کی قبر سے تقریباً ۱۰؍۹ میٹر مغرب میں مشہور ادیب علامہ واحدی ؒ کی اہلیہ کی قبر ہے۔ ملا واحدی پاکستان میں مدفون ہیں اور ان کی اہلیہ ہندوستان میں۔

اسے کہتے ہیں گردش ایام!

محمد رشید خان

مختصر تعارف

محمد رشید خان کی پیدائش ۱۸۹۵ء میں بستی حضرت نظام الدین دہلی میں ہوئی آپ کے والد نظر خان ضلع بریلی کے رہنے والے تھے۔ موصوف مغل فوج میں بڑی قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ نظر خاں مرحوم سلطنت مغلیہ کے آخری شہنشاہ ابوالمظفر بہادر شاہ ظفر کے ایک سپہ سالار کے ساتھ بریلی سے دہلی آئے اور حضرت نظام الدین میں سکونت پذیر ہو گئے۔

محمد رشید خان صاحب کی تعلیم دستکاری اسکول تیرا بہرام خاں دلی میں ہوئی آپ نے اسی دستکاری اسکول میں پرائمری تک کی تعلیم حاصل کی۔ آپ ابھی زیر تعلیم ہی تھے کہ جنگ آزادی میں کود پڑے۔

جدوجہد آزادی

خان رشید خان کا شمار دلی کے جلیل القدر مجاہدین آزادی میں ہوتا ہے۔ موصوف نے جنگ آزادی میں ایک بہادر باپ کے بہادر بیٹے کی طرح شرکت

کی۔ اور نہایت ہی جوانمردی، بے باکی اور جانفروشی کے ساتھ استعماری طاقت کا مقابلہ کیا اور اپنے مجاہد باپ کی روح کو خوش کر دیا۔
موصوف نے برطانوی دورِ حکومت میں متعدد بار قید و بند کی صعوبتوں اور تکلیفوں کو نہ صرف یہ کہ برداشت کیا بلکہ اس راہ کی مشکل ترین گھاٹیوں کا انتخاب اپنے لئے کیا۔ چنانچہ جگت گوپال سودیشی لکھتے ہیں کہ:۔
"۱۹۴۲ء میں ہماری قومی تاریخ اور جنگ آزادی کا وہ فیصلہ کن مورچہ لگا جو انگریزوں کی "ہندوستان چھوڑو" کی تحریک کے نام سے مشہور ہے جس میں عوام کو تشدد اور توڑ پھوڑ کی بھی ترغیب دی گئی تھی۔ اس تحریک کو کامیاب بنانے میں خان صاحب نے بڑا جان جوکھوں کا کام اپنے ذمے لے رکھا تھا۔

خان صاحب رشید خان کی سیاسی زندگی ص۲

آزاد ہندوستان

رشید خان صاحب مرحوم آزادی وطن کے بعد ایک مخلص محب وطن سپوت کی حیثیت سے آزاد ہندوستان کی تعمیر و ترقی میں مصروف ہو گئے۔ موصوف کا شمار ان گنے چنے کانگریسی رہنماؤں میں ہوتا ہے جو منصبوں اور عہدوں کی لالچ سے بلند ہو کر قومی و ملکی خدمات انجام دیا کرتے ہیں۔ اسی لئے آپ کا کانگریسی حلقہ میں بڑا وزن تھا۔ اور ۱۹۶۰ء تک آپ کانگریس کی قائدانہ رہنمائی کرتے رہے جیسا کہ بھگت گوپال سودیشی لکھتے ہیں کہ:
"وطن عزیز کو غلامی کی زنجیروں سے نجات دلانے کے بعد بھی خان صاحب خاموش نہ بیٹھے اور ملک و قوم کی خدمت کرنے میں پیش پیش رہے۔ آپ ۱۹۲۴ء سے ۱۹۲۹ء تک دلی پردیش کانگریس کمیٹی کی ایگزیکٹو

کونسل کے ممبر رہے۔ ۱۹۴۸ء سے ۱۹۶۰ء تک آپ دلی پردیش کمیٹی کے ممبر منتخب ہوتے رہے اور ہمیشہ ملک وقوم کی خدمت کرنے میں پیش پیش رہے لیکن اس دوران میں پارٹی کے اندر بدعنوانیوں اور کرپشن اور پارٹی کی بے ضابطگیوں اور مفاد پرستوں کے غلبے نے ایماندار اور بے لوث ورکروں کا پارٹی کے اندر رہنا دشوار بنا دیا۔ کیونکہ خانصاحب کی زندگی کا ایک امتیازی پہلو یہ ہے کہ آپ نے کبھی بھی پارٹی سے کوئی ذاتی فائدہ نہ حاصل کیا اور ہمیشہ بلا حرص ولالچ کام کیا اور پارٹی سے اختلافات کی بنا پر باہر آگئے۔

کانگریس سے علیحدگی کی عجیب وغریب وجہ

رشید خان مرحوم کا کانگریس پارٹی ہی سے نہیں بلکہ نہرو فیملی سے بھی گہرا تعلق تھا۔ جواہر لال اور بیرسٹر آصف علی سے تازندگی بڑے گہرے مخلصانہ تعلقات ومراسم قائم رہے اور اسی لئے اندراجی سے بھی آپ کا گہرا تعلق تھا۔ لیکن سقوط بنگلہ دیش کے موقعہ پر جب اندراجی نے یہ کہا کہ ہمیں ایک ہزار سال بعد حکومت ملی ہے تو رشید خان مرحوم اس زہریلے جملہ کی تاب نہ لا سکے اور آپکی آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے۔ اور نہرو خاندان سے بددل اور مایوس ہوکر کانگریس سے علیحدہ ہوگئے۔

اگرچہ آپ جب کانگریس سے علیحدہ ہوتے تھے اسی وقت آپ نے سیاست سے بالکلیہ کنارہ کشی طے کرلی تھی مگر کانگریس کے ٹھیکیداروں کو یہ بتا بھی ضروری تھا کہ رشید خان کی عزت کانگریس سے نہیں بلکہ کانگریس کی عزت رشید خان سے تھی۔

لہذا اس کے بعد آپ نے آزاد امیدوار کی حیثیت سے کارپوریشن کا الیکشن

لڑا اور بھاری اکثریت سے کامیابی حاصل کر کے دنیا سے اپنا لوہا منوالیا۔ اس کے بعد آپ نے سیاسی ہنگاموں سے بالکلیہ کنارہ کش ہو کر مساجد و مقابر کی تعمیر و حفاظت کو اپنا مقصد زندگی بنالیا۔ اور آپ اپنا زیادہ تر وقت بھی مہرولی کی اولیاء مسجد میں بسر کرنے لگے اور علاقہ مہرولی کی مساجد و مقابر کی مرمت اور صفائی میں مشغول و منہمک ہو گئے اور اللہ کے گھروں کو دیکھ بھال کرتے ہوئے ہی اللہ سے جا ملے۔ آپ کی آخری آرام گاہ مہندیان میں ہے۔

ڈاکٹر عبدالجبار

ڈاکٹر عبدالجبار سالار خاکسار کا شمار فن جراحی کے ماہرین میں ہوتا تھا۔ وہ اعلیٰ درجہ کے معالج اور طبیب تھے۔ لیکن سیاسی ہنگاموں کی وجہ سے وہ اس فنی کمال کو قائم نہیں رکھ سکے۔ اور جسمانی مریضوں کے بجائے سیاسی ذہنی مریضوں کے مسیحا بن گئے۔

تاریخ پیدائش

ڈاکٹر عبدالجبار خاکسار ۱۹۲۲ء میں دہلی میں پیدا ہوئے آپ کے والد کا نام عبداللہ تھا۔ ڈاکٹر موصوف کے ابتدائی حالات زندگی پردۂ راز میں ہیں۔ وہ ہندوستان کے حریت پسند، نڈر اور بے باک سپوت تھے۔

خاکسار تحریک

ڈاکٹر عبدالجبار ـــــ علامہ عنایت اللہ المشرقیؒ کی انقلابی تحریک خاکسار کے ممتاز لیڈر اور قائد تھے اور ۱۹۴۰ء میں خاکسار تحریک میں شامل ہوئے

اور دہلی ہی سے اپنی سیاسی سرگرمی کا آغاز کیا۔

خاکسار تحریک کے نظام کے مطابق تین ماہ تک بطور خاکسار سپاہی تربیت حاصل کی اس کے بعد ایک محلہ کے سالار مقرر ہوئے۔ یہاں تک کہ درجہ بدرجہ اپنی بہتر کارکردگی کی بنا پر سالار اعلیٰ اور سالار شہر ہوئے۔ خاکسار تحریک نے برطانوی سامراج کے خلاف حصول آزادی کا جو محاذ قائم کیا تھا اس میں وہ برابر شریک رہے اور قائدانہ رول ادا کیا۔

تقسیم ہند

ڈاکٹر صاحب تقسیم ملک کے شدید ترین مخالفوں میں تھے۔ انھوں نے تقسیم ملک کی ایسے وقت میں بھی شدت سے مخالفت کی جبکہ بڑے بڑے سیکولر مزاج قائدین بھی تقسیم ملک کے حامی ہو گئے تھے۔ لیکن مرحوم کسی قیمت پر تقسیم کے لئے تیار نہیں تھے۔ وہ تقسیم ملک کے بھیانک خطرات سے باخبر تھے اور مسلمانوں کے لئے نقصان دہ تصور کرتے تھے۔ جیسا کہ خاکسار رئیس فاطمی صاحب لکھتے ہیں کہ :

"آزادی کے دور کا آخری محاذ دہلی کا وہ محاذ تھا جس میں آل انڈیا مسلم لیگ اور انڈین نیشنل کانگریس کی مجلس عاملہ کی وہ میٹنگ تھی جس میں تقسیم ملک کا فیصلہ ہونا تھا۔ چونکہ یہ محاذ مقامی طور پر دہلی کا محاذ تھا لہذا مرحوم پر علامہ مرحوم کے حکم کی تعمیل کی اہم ذمہ داری تھی۔ وہ اپنے مرحوم امیر اور قائد کے حکم پر ہزاروں خاکساروں کے ساتھ ورکنگ کمیٹی کے اجلاس میں گھس

گئے اور تقسیم ملک کے خلاف احتجاجی مظاہرہ کیا۔ اس موقع پر زبردست ہنگامہ آرائی رہی اور ہزاروں کی تعداد میں خاکسار گرفتار ہوئے جن میں ڈاکٹر صاحب بھی شامل تھے۔ چند روز کے بعد سب کے ساتھ آپ کی بھی رہائی ہوئی۔

المشرق دہلی، ۱۵ر مئی ۱۹۸۳ء

ڈاکٹر عبدالجبار خاکسار تقسیم ملک کے سخت مخالف تھے اور اس سلسلے میں وہ بڑے مخلص اور جری تھے۔ لہٰذا تقسیم ملک کے مدہوش حامیوں کا آخر وقت تک مقابلہ کرتے رہے۔

صحافتی شعور

ڈاکٹر عبدالجبار دلی کے عظیم صحافی اور انشاء پرداز بھی تھے۔ انھوں نے میدان صحافت میں نہایت ہی جرأت مندی، بے باکی اور حق گوئی کا مظاہرہ کیا تھا۔ آپ کا صحافتی شعور بڑا بلند تھا۔

ڈاکٹر صاحب "ہمارا اردو" اور "المشرق" کے موسس اور ایڈیٹر تھے۔ مرحوم نے اسلام اور مسلمانوں کے مفاد کی حفاظت کے لئے اپنے پختہ شعور اور احساس قلم کو ہمیشہ بیدار اور سرگرم عمل رکھا۔

سادگی اور شائستگی

ڈاکٹر عبدالجبار مرحوم شریف النفس اور شائستہ ہونے کے ساتھ ساتھ بڑے سادہ مزاج اور بے ریا انسان تھے۔ وہ صحیح معنوں میں سچے خاکسار تھے انھوں نے بڑی درویشانہ زندگی بسر کی۔ وہ بڑے ہمدرد، غم خوار، مخلص رہنما اور صداقت پسند تھے۔ جناب اندرجیت گاندھی نے تین رباعیات کہی ہیں۔ ان

رباعیوں سے ڈاکٹر عبد الجبار مرحوم کے اخلاق و کردار اور ان کے کام و نام اور ان کی تاریخ وفات پر بھرپور روشنی پڑتی ہے۔

(۱)

کیوں یاد نہ آئیں ہمیں عبد الجبار
ہمدرد تھے، غمخوار تھے، سب کے تھے یار
جب وہ تھے تو پت جھڑ بھی تھا گل کا موسم
اب وہ نہیں پت جھڑ نظر آتی ہے بہار

(۲)

تھے وہ تو ہمارا اردو کے ایڈیٹر
لائق تھے صحافت میں، بہت بڑھ چڑھ کر
آئینہ تھا کون ملے گا ہم کو
آتا ہی نہیں کوئی ہمیں اب تو نظر

(۳)

پوچھو نہ کہ بیتاب ہیں کیوں اہلِ قرار
کس دوست کی برسی کو مناتے ہیں یار
کہتے کو تھا گاندھی کہ کہا ہاتف نے
اے آہ! یہ ہے اب غم عبد الجبار

۱۹۸۳ء ....

وفات

ڈاکٹر عبد الجبار خاکسار کا انتقال پر ملال ۱۰ مئی ۱۹۸۲ء بوقت شام اردن ہسپتال میں ہوا۔ ۱۱ مئی کی صبح قریب دس بجے قبرستان تھندان میں ان کو سپرد خاک کر دیا گیا۔

مولانا محمد زبیر قریشی

پروفیسر محمد زبیر قریشی کی ولادت ۱۰ ذی الحجہ ۱۳۲۱ھ بروز پیر بمطابق ۲۹ فروری ۱۹۰۴ء میں دہلی میں ہوئی، آپ کے والد بزرگوار کا نام مولانا محمد اسحاق دہلویؒ تھا۔ جو اپنے عہد کے مشہور واعظ، ادیب اور شاعر تھے۔

مولانا محمد زبیر قریشیؒ نے ابتدائی تعلیم اپنے گھر کے مشاہیر علماء کے زیر سایہ حاصل کی۔ نحو، صرف اور فقہ کی ابتدائی کتابیں اپنے والد مرحوم مولانا حافظ محمد اسحاق دہلویؒ اور تایا مولانا عبدالرحمٰن راسخ دہلویؒ سے اپنے خاندانی مدرسہ حسینیہ حنفیہ کٹرہ گوکل شاہ میں پڑھیں، پروفیسر قریشی کا خاندانی ماحول مذہبی تھا۔ خاندان کے اکابر آپکو مذہبی تعلیم دلانا چاہتے تھے۔ اور آپ طبعاً عصری علوم کی طرف راغب تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ آپنے دینی تعلیم چھوڑ دی اور اینگلو عربک اسکول میں داخل ہوگئے اور وہاں سے ۲۸-۱۹۲۷ء میں میٹرک پاس کیا۔

میٹرک پاس کرنے کے بعد سینٹ اسٹیفن کالج دلّی میں داخل ہوئے اور وہاں سے ۱۹۳۰ء میں بی اے آنرز فلسفے میں کیا۔ اور اس فن میں اتنی مہارت حاصل کی کہ اکثر معاصرین پر سبقت لے گئے۔

آل انڈیا ریڈیو

پروفیسر قریشی کا شمار ماہر لسانیات میں ہوتا تھا۔ آپ کو اردو، فارسی

عربی، انگریزی، جرمن زبانوں پر بڑا عبور حاصل تھا۔ موصوف فراغت تعلیم
کے بعد ہی آل انڈیا ریڈیو میں اناؤنسر اور مترجم کی حیثیت سے ملازم ہوگئے
اور اس اجنبی میدان میں بھی ایک کامیاب انسان ثابت ہوئے

اینگلو عربک کالج

—— نشریاتی دنیا سے کنارہ کشی کے بعد ....
مولانا قریشی ۱۹۴۷ء میں اینگلو عربک اسکول میں انگریزی کے استاذ مقرر
ہوگئے۔ آپ کو افہام وتفہیم کا بڑا عمدہ سلیقہ تھا۔ طلبہ آپ کی درسی تقریر
کو بڑی دلچسپی سے سنتے تھے۔ آپ اسکول میں بہت ہی مقبول اور ہر دلعزیز تھے

دعوت و وعظ

مولانا محمد زبیر قریشی مرحوم دلّی کے ایک بہترین واعظ اور خطیب تھے
آپ نے اپنے والد ماجد کے انتقال کے بعد اپنے خاندانی مرکز مدرسہ حسینیہ
میں وعظ کا سلسلہ شروع فرمایا اور چونکہ آپ دلّی کی ٹکسالی زبان میں وعظ
فرماتے تھے اس لئے دلّی والے آپ کی تقریروں کو بڑی دلچسپی سے سنتے تھے
آپ کا وعظ عام واعظین سے الگ صرف قرآن وحدیث کی روشنی میں ہوتا تھا

مسلم پرسنل لا، بورڈ

مولانا محمد زبیر قریشی مسلم پرسنل لا، بورڈ کے اساسی رکن تھے
آپ مسلم پرسنل لا، بورڈ کی میٹنگوں میں بڑی پابندی سے شریک ہوتے تھے
اور آپکے گرانقدر مشوروں سے نوازتے تھے۔ موصوف بڑے ظریف اور

خوش طبع انسان تھے۔ موصوف اپنے ادبی چٹکلوں اور لطیفوں سے مجلس کو کشت زعفران بنائے رکھتے تھے

مسلم پرسنل لاء بورڈ کے ایک معزز رکن نے بتایا کہ مدراس میں مسلم پرسنل لاء بورڈ کا اجلاس ہوا، مولانا قریشی مرحوم بھی شریک ہوئے تھے موصوف نے اپنی تقریر کے دوران فرمایا

آج مسلم پرسنل لاء بورڈ کی اہمیت اور مقبولیت جو ملک میں ہے وہ محتاج بیان نہیں۔ ورنہ ابتدائی دور میں دلّی والے کہا کرتے تھے۔ قریشی صاحب !
ماشاءاللہ اور انشاءاللہ کی طرح۔ مسلم پرسنل لاء کیا چیز ہے؟

سیاست

مولانا محمد زبیر قریشی مرنجان مرنج اور بڑے باغ و بہار شخصیت کے مالک تھے۔ آپ کا خاندان مذہبی اور علمی تھا۔ سیاسی توڑ جوڑ سے بڑی حد تک ناآشنا تھا لیکن بعض ناعاقبت اندیش دوستوں نے پروفیسر قریشی کو اکسا کر الیکشن باز بنا دیا تھا۔ اور اس الیکشن بازی میں کامیاب بھی ہو جاتے تھے۔ اور یہی مولانا قریشی کا فن تھا۔

اولاد

پروفیسر محمد زبیر قریشی مرحوم نہایت ہی کثیرالاولاد بزرگ تھے۔ مشہور مزاحیہ ادیب اور شاعر فرقت کاکوروی کا بیان ہے کہ :۔

کل شام میں اپنے گھر سے مچھلی والان تک جانے کے

لئے نکلا تو جامع مسجد تک ۱۲ بارہ لڑکوں نے سلام کیا میں نے ان کو جاننے کے سب کی ولدیت معلوم کی تو بارہ میں سے سات نے اپنی ولدیت زبیر قریشی بتائی میں جامع مسجد سے واپس لوٹ آیا۔

دلی والے

وفات

پروفیسر محمد زبیر قریشی ۲۴ ربیع الثانی ۱۳۹۸ھ بروز پیر ۳۰ اپریل ۱۹۷۸ء کو اپنے مولائے حقیقی سے جا ملے۔ آپ کی آخری آرام گاہ مہندیوں میں ہے۔ آپ کی قبر حکیم مومن خاں مومن کی پائینتی میں ہے وہیں پر مشہور مجاہد آزادی مولانا امداد صابری مرحوم بھی آرام فرما ہیں..... رحمہم اللہ علیہم

حافظ محمد عرفان

ولادت اور تعلیم

حافظ محمد عرفان دہلوی کی پیدائش ۲۵ر جنوری ۱۹۲۵ء میں دہلی میں ہوئی. آپ کے والد ماجد کا اسم گرامی مولانا حافظ محمد اسحاق دہلوی تھا. مولانا محمد اسحاق دہلوی کا شمار ہندوستان کے عظیم و ممتاز مصنفوں، مولفوں اور واعظوں میں ہوتا ہے.

حافظ محمد عرفان صاحب کی پرورش ایک دینی اور علمی ماحول میں ہوئی تھی. آپ نے ابتدائی تعلیم کا آغاز ـــــ مولانا حافظ محمد اسحاق دہلوی جیسے باکمال والد اور مولانا مفتی محمد ابراہیم دہلویؒ. مولانا عبدالرحمٰن راسخ دہلویؒ اور مولانا حبیب الرحمٰن دہلویؒ جیسے مخر روزگار چچاؤں کے زیر سایہ کیا . . . . . .

افسوس! آپ کی ابھی تعلیم تشنۂ تکمیل ہی تھی کہ آپ کے والد اور چچاؤں کا سایہ شفقت سر سے اٹھ گیا. اور آپ وقت کی کڑی دھوپ اور چھاؤں میں تن تنہا کھڑے ہو گئے! اور خدا خدا کر کے کسی طرح حفظ قرآن کی تکمیل کی ـــ

صبر و توکّل

حافظ محمد عرفان صاحب کی تمام زندگی آبلہ پائی کا سفر ہے۔ وہ ہمیشہ معاشی تنگ دستیوں اور بدحالیوں میں مبتلا رہے لیکن انہوں نے کبھی بھی صبر و توکل کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ حالانکہ وہ شاہانہ زندگی سے فقیرانہ زندگی کی طرف آئے تھے اور وہ بھی دلّی جیسے بے رحم شہر میں جہاں جینا تو جینا ـــــ مرنا بھی بڑا مسئلہ ہوتا ہے۔

عادات و خصائل

حافظ صاحب بڑے اخلاق مند، ملنسار، وضعدار اور شریف النفس انسان تھے۔ موصوف بلا امتیاز امیر و غریب ہر شخص کے ساتھ خندہ پیشانی سے پیش آتے تھے، آپ کے اندر کسی کی دل آزاری کی مطلق صلاحیت ہی نہیں تھی۔ حقیقت تو یہ ہے کہ وہ شرفائے دلّی کی تہذیب و روایت کی یادگار تھے۔

وعظ و نصیحت

حافظ محمد عرفان مرحوم ـــــ بھی اپنے خاندان کے بزرگوں کی طرح بہترین واعظ اور مقرر تھے۔ دلّی میں آپ کی تقریروں کی بڑی اہمیت دی جاتی تھی۔ دلّی میں کوئی دینی مجلس ایسی نہ ہوتی جسمیں موصوف موجود نہ ہوں دلّی کی پیاری پیاری زبان میں وعظ فرماتے۔ آپ کی تقریروں کی زبان کوثر و تسنیم میں دھولی ہوئی ہوتی تھی۔

خوش الحانی

حافظ محمد عرفان قریشی صاحب دلّی کے مشہور خوش الحان قاری تھے۔ وہ اپنے مخصوص انداز تلاوت اور منفرد لب ولہجہ کی بنا پر دلّی میں بہت ہی مقبول اور دینی محفل کی رونق تھے۔ حافظ محمد عرفان صاحب مرحوم نے اپنی پوری زندگی درس وتدریس، دعوت وارشاد اور اصلاح معاشرہ میں صرف کی لیکن آپ کا اصل کارنامہ اپنے والد ماجد مولانا محمد اسحاق دہلویؒ کی تصنیفات وتالیفات کی اشاعت وترویج ہے۔ پیام عبرت، بستان اولیا، معجزات مسیحؑ، درود مقدس، نیکی بدی، قصہ اصحاب کہف۔ داستان یوسفؑ، معراج رسولﷺ، ملت ابراہیمؑ، جلوۂ طور، تاج سلیمانی قصہ یونسؑ، ماہ صیام، شہادت حسین، موت کا منظر، طوفان نوحؑ، صبر ایوب علیہ السلام اور قصہ جرجیسؑ وغیرہ دعوتی اور اصلاحی کتابوں کے سرورق پر ناشر اور طابع کی حیثیت سے آپ کا اور آپ کے بھائی مولانا زبیر صاحب قریشی ہی کا نام ہے......

اولاد

حافظ محمد عرفان قریشی کی چار ۴ صاحبزادیاں اور چار صاحبزادے ہیں۔ الحمد للہ مرحوم کے سارے صاحبزادے اور صاحبزادیاں بڑی شائستہ اور مہذب ہیں۔

مرحوم کے چھوٹے صاحبزادے محمد عثمان خالد قریشی صاحب اور محمد رضوان عابد قریشی صاحب ہیں۔ یہ دونوں راقم الحروف کے مخلص دوست اور علمی کاموں کے ہم سفر ہیں۔

وفات

حافظ محمد عرفان قریشی ۳۰ جون ۱۹۸۱ء میں اپنے مولائے حقیقی سے جا ملے۔ قبرستان مہندیوں میں دفن ہوئے۔ حافظ صاحب مرحوم کی قبر جامعہ رحیمیہ کی دیوار سے متصل ہے۔ آپ کی قبر سے قریب ہی ڈاکٹر عبدالجبار خاکسار کی قبر ہے۔

عزیزالرحمن جامعی

اجمالی تعارف

مولانا عزیزالرحمن جامعی لدھیانوی پنجاب کے ایک ایسے خانوادہ علم وعرفان کے چشم و چراغ تھے، جن کے علم و دانش کی کرنیں آنکھوں کو سرور اور دل و دماغ میں وطن کی محبت کا اجالا کرتی ہیں۔

وہ ۱۹۱۹ء میں دنیائے آب و گل میں آئے۔ آپ کے والد ماجد کا نام رئیس الاحرار مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانویؒ تھا۔

مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی آزادی وطن کے جلیل القدر مجاہد تھے۔ مولانا عزیزالرحمن جامعی نے علوم نقلیہ وعقلیہ، قرآن وحدیث اور فقہ وتفسیر کی تعلیم دارالعلوم دیوبند اور مدرسہ صولتیہ مکہ مکرمہ میں حاصل کی۔ ۱۹۲۸ء میں وہ مکہ مکرمہ سے ہندوستان آئے اور علوم عصریہ کی تحصیل کے لئے جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی میں داخل ہوگئے اور وہ ۱۹۳۵ء تک جامعہ ملیہ اسلامیہ میں مقیم رہے۔ اسی وجہ سے اپنے آپ کو "جامعی" لکھتے تھے

جنگ آزادی

مولانا عزیز الرحمٰن جامعی لدھیانوی آزادی وطن کے سرفروش مجاہد اور مخلص رہنما تھے۔ انھوں نے آزادی وطن کی جدوجہد میں متعدد بار قید و بند کی صعوبتیں اور مصیبتیں اٹھائیں۔

موصوف پر ۱۹۳۵ء میں بغاوت کا الزام عائد ہوا جس کے نتیجہ میں دو سال تک نظر بند رہے۔ ؎

یہاں افسوس گنجائش نہیں فریاد و ماتم کی

مولانا لدھیانوی نے انگریزوں سے برابر جنگ جاری رکھی یہاں تک کہ لیلائے آزادی سے ہم آغوش ہو گئے۔ آزادی وطن کے بعد ملک کی تعمیر و استحکام میں مصروف ہو گئے۔ موصوف ایک سچے نیشنلسٹ مسلمان تھے۔ نہرو خاندان اور دوسرے مجاہدین آزادی سے آپ کا گہرا تعلق تھا۔

مولانا محمد عثمان فارقلیط لکھتے ہیں کہ:

"چونکہ مرحوم والد صاحب کے ہمراہ مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم اور پنڈت جواہر لال نہرو سے ملتے رہے ہیں اس لئے ان کی باتیں مزے لے لے کر سناتے ہیں"

زورِ خطابت

مولانا عزیز الرحمٰن جامعی لدھیانوی اپنے والد مرحوم کی طرح ایک شعلہ بار مقرر اور جادو بیان خطیب تھے۔ جب بولتے تھے تو مولانا مرحوم اور آپ میں کوئی نمایاں فرق محسوس نہیں ہوتا تھا۔

مولانا فارقلیط لکھتے ہیں کہ:

"عرض جس کو آپ کے والد مرحوم مولانا حبیب الرحمٰن صاحب سے ملاقات کرنی ہو وہ آپ سے ملاقات کرلے۔ ایسا محسوس ہوگا کہ مرحوم آج بھی بقید حیات ہیں اور اپنی قادر الکلامی کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔"

ضمیمہ رئیس الاحرار در حدیث دیگراں ص۲۷۵

تصنیف و تالیف

مولانا عزیز الرحمٰن جامعی لدھیانوی ایک صاحب نظر صحافی اور بلند پایہ ادیب تھے۔ آپ کی انشاء پردازی کا خاص جوہر شگفتگی اور سلاست ہے۔ موصوف بڑے برجستہ اور برمحل اشعار استعمال کیا کرتے تھے۔ آپ کا صحافت سے بھی گہرا تعلق تھا۔ آپ کے مضامین و مقالات ملک کے موقر جرائد و مجلات میں شائع ہوتے رہتے تھے۔ آپ خود بھی ایک دو اخبار کے مدیر رہے ہیں۔ مولانا عزیز الرحمٰن جامعی کا تصنیفی ذوق بھی بڑا پختہ تھا۔ آپ کی اہم تصانیف یہ ہیں۔ رئیس الاحرار در حدیث دیگراں، مسائل امروز یکساں سول کوڈ، جنگ آزادی کے مسلم مجاہدین (۴ جلدیں) اور دلی کی کہانی میر، غالب اور داغ کی زبانی۔

وفات

مولانا عزیز الرحمٰن صاحب جامعی ۲۸ مئی ۱۹۷۶ء میں جاں بحق ہوگئے۔ آپ کی قبر ڈاکٹر سید محمود صاحبؒ کی پائینتی میں واقع ہے۔ آپ کے لوح مزار پر علامہ اقبال کا یہ مصرعہ لکھا ہوا ہے۔ ؎

آسماں تری لحد پر شبنم افشانی کرے!

عتیق الرحمن قدوائی

عتیق الرحمٰن قدوائی اتر پردیش کے ایک زمیندار گھرانے کے چشم وچراغ تھے۔ وہ ۱۹ر نومبر ۱۹۲۲ء میں مشہور مردم خیز ضلع بارہ بنکی میں بڑا گاؤں میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد ماجد کا نام حسن الرحمٰن قدوائی تھا۔ حسن الرحمٰن قدوائیؒ کا شمار مشاہیر فضلائے دارالعلوم دیوبند میں ہوتا تھا۔

عتیق الرحمٰن قدوائی صاحب نے اپنے والد ماجد سے قرآن مجید حفظ کیا۔ ان کے والد مرحوم خود بھی ایک بہترین حافظ قرآن تھے۔ عصری علوم کی تحصیل اپنے برادر اکبر شفیق الرحمٰن قدوائی سابق وزیر تعلیم ہند کی رفاقت میں دہلی میں کی۔

حسن اخلاق

عتیق الرحمٰن قدوائی خاندانی آدمی تھے۔ آپ کے اندر خاندانی شرافت وشائستگی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ وہ اپنی اخلاق مندی، ملنساری، خاکساری وضعداری، ہمدردی، غمگساری میں عدیم المثال تھے۔

سیاسیات

عتیق الرحمن قدوائی صاحب تحریک آزادی کے مشہور مجاہد اور کانگریسی لیڈر تھے۔ لیکن آپ اپنے "قدوائی خاندان" کی روایت کے خلاف سوشلسٹ پارٹی میں داخل ہوگئے

ابرار قدوائی صاحب لکھتے ہیں :

"جب جے پرکاش نارائن، اچاریہ کرپلانی، رفیع احمد قدوائی جیسے بڑے سیاسی بزرگوں نے کانگریس سے علیحدگی اختیار کی تب ہی عتیق صاحب بھی کانگریس چھوڑ کر ان لوگوں کی بنائی ہوئی سوشلسٹ پارٹی میں عملی طور پر شریک ہوگئے۔"

عتیق الرحمن قدوائی صاحب سیاسی داؤں پیچ اور سیاسی کرپشن کے بیحد مخالف تھے۔ ان کی اپنی شخصیت میں حق گوئی اور ایمانداری رچی اور بسی ہوئی تھی۔ وہ صاف ستھری سیاست کے آرزومند تھے۔ موصوف اپنے سیاسی رفیقوں کے اندر بھی حق گوئی اور ایمانداری کی صفت پیدا کرنا چاہتے تھے۔ لیکن ان کو اس مہم میں شکست ہوتی تھی۔ بالآخر انھوں نے اپنے سیاسی رفیقوں سے مایوس ہوکر سوشلسٹ پارٹی بھی چھوڑ دی اور جن سنگھ میں شامل ہوگئے۔ اور جن سنگھ میں اعتدال و توازن پیدا کرنے کی جدوجہد کی۔ اس میں بھی آخر کار ناکام رہے مگر جن سنگھ میں اپنی شمولیت کی توضیح کرتے رہے۔

ابرار قدوائی صاحب لکھتے ہیں :

" ان (قدوائی صاحب) پر اعتراضات ہوئے کہ یہ جن سنگھ آپ کو کیوں بھائی ؟ یہ تو آر ایس ایس کا ہی روپ ہے جو اسلام اور مسلمانوں کو ہندوستان سے ہی نکالنا چاہتی ہے۔ عتیق صاحب ناقدین

کو یہ کہہ کر چپ کر دیتے تھے کہ اگر انکی جماعت میں ایک مسلمان بھی موجود ہے تو کم از کم اس کے سامنے تو کوئی بات مسلمانوں کے خلاف نہ ہو گی یہی کیا کم ہے۔ مسلمانوں کے مفاد کا تحفظ اس طرح بھی ہو جائے۔

صحافت

عتیق الرحمن قدوائی اردو کے ایک بے باک اور جری صحافی تھے، روزنامہ "اردو بازار" روزنامہ "نئی دنیا" اور روزنامہ "سویرا" روزنامہ "ہم لوگ" کی ادارت عرصۂ دراز تک کرتے رہے۔ آخر زمانہ میں روزنامہ "فیصل جدید" کی ادارت میں شامل ہو گئے تھے۔

لیکن اپنی افتاد طبع کی وجہ سے اس میدان میں بھی کامیابی حاصل نہ کر سکے دراصل آپ جیسے ایماندار صحافی اس کاروباری صحافت میں کیونکر کامیاب ہو سکتا تھا۔

ادبی ذوق

عتیق الرحمن قدوائی صاحب کا ادبی ذوق بھی بلند تھا۔ وہ مشاعروں اور ادبی نشستوں میں بڑے خشوع و خضوع کے ساتھ شریک ہوتے تھے۔ ادیبوں اور شاعروں کی مشہور ادبی مجلس میں جو مولوی سمیع اللہ قاسمی کی دکان پر ہوتی تھی۔ عتیق صاحب بھی بڑی پابندی سے اس میں شریک ہوتے تھے۔

ابرار قدوائی صاحب لکھتے ہیں:

"سلام مچھلی شہری سے تعلقات گہرے اور بے تکلفی کے تھے ایک شام اردو ہال اردو بازار میں گلزار دہلوی کے منعقدہ مشاعرہ میں سلام مچھلی شہری نے عتیق صاحب کو دیکھتے ہی جیب سے سگریٹ

کی ڈبیہ نکال کر اس میں سے ایک حصہ پھاڑ لیا اور اس پر لکھا عتیق!
تم مجھے دس روپے دیدو، شدید ضرورت ہے۔ عتیق صاحب نے
ان کی ضرورت اور وہ بھی شام کے وقت کی شدید ضرورت سمجھ لی،
بطور ایک دوست کے انھوں نے وہیں دس روپے دیدیئے۔ اور
اس کے بعد اکثر وہ دس روپے کا تقاضہ پورا کرتے رہے۔"

وفات

عتیق الرحمن قدوائی صاحب کی جیسی باغ و بہار شخصیت ۲۶ رفروری ۱۹۸۹ء
کو قبرستان جھندیون میں قیامت کی نیند سوگئی۔۔۔ آپ کی قبر نواب مولوی احسان الرحمن
اور خان بہادر علامہ محمد حسن خان کی قبروں سے قریب ہی نچلے حصہ میں واقع ہے۔

حکیم محمد شریف خان

ولادت

حکیم محمد شریف خان دہلی کے مشہور شریفی خاندان کے چشم و چراغ تھے وہ ۱۹۱۵ء میں دلی میں پیدا ہوئے۔ آپ نے مکتبی تعلیم دلی میں حاصل کی۔ اور باقاعدہ تعلیم کا آغاز حیدرآباد میں ہوا۔ آپ حیدرآباد سیٹی اسکول میں داخل ہوئے اور سیٹی اسکول سے میڈل کا امتحان پاس کرنے کے بعد طبیہ کالج دلی میں داخل ہوئے اور یہیں سے فن طب کی تکمیل کی۔ آپ کے اساتذہ میں آپ کے والد محترم حکیم محمد ظفر خان پرنسپل طبیہ کالج اور تایا حکیم محمد احمد خان جیسے مسیحائے وقت اطباء شامل تھے۔

نسخہ نویسی

حکیم محمد شریف خان کو امراض کی تشخیص اور ادویہ کی تجویز میں بڑا ملکہ حاصل تھا۔ اور اللہ تعالیٰ نے آپ کو دست شفا سے بھی نوازا تھا۔ آپ ابھی ۱۲ سال ہی کے تھے کہ مریضوں کو دیکھنے لگے تھے۔ آپ کے مربی اور مخلص استاذ حکیم محمد احمد خان کو آپ کی تجویز کردہ دواؤں اور تشخیصوں پر بڑا اعتماد تھا۔

عادات و اطوار

حکیم شریف خان کے اندر ایک بہترین حکیم کی جملہ شرطیں بدرجۂ اتم پائی جاتی تھیں وہ بڑے نیک، منکسرالمزاج، خوش طبع، ملنسار، سادہ مزاج اور شریف النفس انسان تھے۔ اور بیماروں پر بڑے مشفق و مہربان تھے۔ آپ بڑوں میں بڑا، چھوٹوں میں چھوٹا ہوجایا کرتے تھے۔ دراصل یہ آپ کی بلند ظرفی تھی۔

کارپوریشن کی ممبری

حکیم محمد شریف خان صاحب دلی کے مشہور عوامی لیڈر تھے۔ آپ کا سیاسی شعور بلند تھا۔ موصوف نے ۱۹۶۲ء میں کانگریس کے ٹکٹ پر کارپوریشن کا الیکشن لڑا اور اپنے سیاسی حریف کو شکست دے کر کامیاب ہوئے۔
اور اسی طرح دو دفعہ اور کانگریس ہی کے ٹکٹ پر کارپوریشن کا الیکشن لڑے اور اپنے سیاسی حریف کو شکست دے کر کامیاب ہوئے۔ چوتھی مرتبہ کانگریس نے آپ کو ٹکٹ نہیں دیا جس کی وجہ سے آپ بد دل ہوکر سیاسی زندگی سے کنارہ کش ہوگئے۔
حکیم محمد شریف خان صاحب کا انتقال ۱۹۷۹ء میں ہوا۔ آپ کی قبر مولانا مملوک علی نانوتوی کے مزار اقدس کے پورب میں تقریباً ۲۰ میٹر کے فاصلے پر لب سڑک مکی مسجد احاطۂ مہندیان میں واقع ہے۔
شیخ عبدالعزیز شکربارؒ اور مولوی سمیع اللہ خان کے پہلو میں آپ آسودہ راحت ہیں۔

رفیق احمد رحمانیؒ

مختصر تعارف

مولانا رفیق احمد رحمانی ضلع سہارنپور میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد کا نام ولی احمد تھا جو ایک شریف اور محنتی انسان تھے۔

مولانا رفیق احمد رحمانی صاحب اپنی نوخیز عمری میں تحصیل علم کے لئے دہلی آ گئے تھے اور دہلی کے دینی مدارس میں مروجہ علوم وفنون کی تحصیل شروع کر دی تھی۔ اور ان علوم ومضامین سے فراغت کے بعد آپ مشہور دینی درسگاہ مدرسہ مولوی عبدالرب کشمیری گیٹ میں مدرس ہو گئے، لیکن افسوس! یہ تدریسی سلسلہ کوئی زیادہ عرصہ قائم نہیں رہ سکا۔ آپ مدرسہ عبدالرب سے مستعفی ہو گئے۔

مولانا رحمانی مرحوم نے اکابر کی جمیعۃ العلماء اور کانگریس کے سرگرم کارکن ہونے کی حیثیت سے ہر محاذ پر تحریک آزادی میں پرجوش حصہ لیا اور جمیعۃ العلماء اور کانگریس کے ساتھ شانہ بشانہ کام کیا۔

آزادی وطن کے بعد ۱۹۴۷ء میں دلی کے ہولناک حالات میں اپنے علاقہ کشمیری گیٹ کے مسلمانوں کی دلجوئی اور ہمت افزائی کی اور پوری قوت سے

فرقہ وارانہ جنون کا مقابلہ کیا۔

آج علاقہ کشمیری گیٹ میں جو چند گنے چنے مسلمان اور چند تاریخی مساجد ومدارس نظر آرہے ہیں وہ مولانا مرحوم کی مخلصانہ کوششوں اور محنتوں کا ثمرہ ہے۔

وفات

مولانا رفیق احمد رحمانی مرحوم ۳؍ دسمبر ۱۹۸۵ء میں خدا کو پیارے ہو گئے آپ کی قبر باب الولی کے بائیں جانب مختلف قبروں کی قطار میں ہے۔

لوحِ مزار پر یہ عبارت درج ہے۔

ان المتقین فی جنت ونعیم

روضۃ الخلد

آخری آرام گاہ ہمدرد خلائق، خدمتگزار ملک و ملت مولانا الحافظ رفیق احمدؒ رحمانی۔

عبدالرحمن شاکر

ولادت

مولانا عبدالرحمن شاکر مرحوم دلی کے مشہور عالموں، شاعروں اور ادیبوں میں تھے۔ وہ ۱۹۲۵ء میں دلی میں پیدا ہوئے، آپ کے والد ماجد کا اسم گرامی مولانا عبدالسبحان تھا۔ موصوف اپنے عہد کے مشہور و ممتاز عالم دین تھے۔

مولانا شاکر نے حفظ قرآن دلی کے مشہور قاری محمد سلیمان صاحب کے مدرسہ تجوید القرآن میں کیا۔ فارسی اور صرف و نحو کی تعلیم مدرسہ سبحانیہ دہلی میں اپنے والد ماجد اور بڑے بھائی مولانا عبدالمنان صاحب سے حاصل کی۔ حدیث و تفسیر کی کتابیں مدرسہ امینیہ میں مفتی اعظم مولانا محمد کفایت اللہ دہلوی اور محدث کبیر مولانا ضیاء الحق دیوبندی سے پڑھیں۔

فضل و کمال

مولانا عبدالرحمن شاکر علوم قرآن و حدیث کے ممتاز عالم دین تھے۔ اگر وہ

درسی میدان میں قدم رکھتے تو ایک صاحب طرز اور باکمال مدرس ہوتے، لیکن شاکر صاحب نے درس و تدریس سے اپنے آپ کو علیحدہ رکھا۔ جس کی وجہ سے آپ کا علمی فیض عام نہ ہو سکا۔

خوش الحانی

مولانا عبدالرحمن شاکر دلی کے بڑے خوش الحان قاری تھے۔ آپ کی قرأت کا انداز بڑا منجھا ہوا، رس بھرا، اور البیلا تھا۔ آپ بڑے سوز و ساز اور درد و کسک کے ساتھ پڑھتے تھے۔ آپ خود بھی جھومتے اور سامعین کو بھی جھوماتے تھے۔

قلندرانہ مزاج

مولانا عبدالرحمٰن شاکر بڑے باغ و بہار، خوش اخلاق وضعدار، ملنسار اور قلندر مزاج انسان تھے۔ انھوں نے بڑی درویشانہ زندگی گزاری ہے۔ شاکر صاحب صحیح معنوں میں قلندر اور صوفی منش انسان تھے۔ موصوف نے اپنے ایک شعر میں اپنی قلندرانہ زندگی کا بڑا خوبصورت نقشہ کھینچا تھا۔ شعر ملاحظہ فرمائیں۔

ایک دل، ایک نظر، اِک تبسم
کس قدر مختصر ہے فسانہ

شعر و شاعری

شاکر صاحب اردو کے قادر الکلام شاعر تھے۔ انھوں نے اردو شاعری کی روایات کو برقرار رکھا، وہ اصلاً غزل کے شاعر تھے۔ اگرچہ ان کی تخلیقات میں حمد، منقبت، غزل، رباعی اور سہرا سبھی کچھ موجود ہے۔

شاکر صاحب کہتے ہیں ؎

یوں مسکرائے جان سی کلیوں میں پڑ گئی

یوں لب کشا ہوئے کہ گلستاں بنا دیا

نمونۂ کلام

ناز سے چلنے والے ساقی اک قدم مستانہ بھی — آج صراحی جھوم رہی ہے وجد میں ہے پیمانہ بھی

الفت کا آغاز فنا سے، الفت کا انجام بقا — اس محفل میں لو دیتی ہے، خاک پہ پروانہ بھی

آج نہ جانے کالی گھٹا کے ساتھ ہی کیوں آنسو آئے — ورنہ کہیں ایسے میں کوئی روتا ہے دیوانہ بھی

اپنا اسی کو کہتے ہیں جو وقت پہ کام آجاتا ہے — یوں تو رسماً پرسش غم کر لیتا ہے بیگانہ بھی

دیوانہ، دیوانہ ٹھہرا دیوانے کا ذکر ہی کیا — تیری چال کے صدقے ساقی بہک گیا فرزانہ بھی

فرق حق و باطل کرنا، آپ کا فرضِ اول ہے — میں نے حقیقت بھی رکھی، اور پیش کیا افسانہ بھی

تیری محفل میں دیوانے مجبوراً آجاتے ہیں — یعنی ان بیچاروں پر ہے تنگ رہِ ویرانہ بھی

شکوۂ دوراں کرنیوالے، کیا تجھکو معلوم نہیں — گردش دوراں توڑ چکی ہے شاہوں کا پیمانہ بھی

حسن نیت، حسن کے واسطے، شرطِ اول ہے

ورنہ شاکر کعبۂ دل سے دور نہیں بتخانہ بھی

وفات

شاکر صاحب ۴ دسمبر ۱۹۸۲ء کو اپنے مولیٰ سے جا ملے۔ آپ کی آخری آرام گاہ مہندیوں میں بالکل سر راہ مفتی عتیق الرحمن عثمانی کے سرہانے ہے۔ آپ کی قبر کتبہ و تماشہ سے بالکل بے نیاز ہے۔

مرزا شریف اللہ بیگ

ولادت

مرزا شریف اللہ بیگ شہرت دہلوی کی پیدائش ۱۹۰۲ء میں کوچہ پنڈت دہلی میں ایک متوسط خاندان میں ہوئی۔ آپ کے والد کا نام مرزا عزیز اللہ بیگ دہلوی تھا۔

مرزا شہرت کی مکتبی تعلیم گھر پر ہوئی۔ مالی تنگی و عسرت کی بنا پر اعلیٰ تعلیم کی تحصیل سے محروم رہے۔ موصوف کے اندر نوعمری ہی سے شعر و شاعری کا شوق پیدا ہو گیا تھا۔ ابوالمعظم نواب مرزا سراج الدین احمد خان سائل دہلوی کا چہیتا شاگرد تھے۔ حضرت سائل دہلوی کے انتقال کے بعد مشہور شاعر فرخ دہلوی مرحوم سے اصلاح لی

اردو کے بزرگ شاعر عزیز وارثی صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ:

"مرزا شہرت دلی والے تھے۔ انھوں نے اپنی زندگی دلی کے مشہور علاقے پنڈت کے کوچے میں گزاری انھیں شعر و شاعری سے بے حد دلچسپی تھی اور یہی دلچسپی اس وقت کے استاد ابوالمعظم

نواب سراج الدین احمد سائل دہلوی کی صحبت میں انھیں لے گئی۔ اور وہ ان کے عزیز ترین شاگردوں میں شامل ہو گئے۔ مرزا شہرت کو سائل سے برسوں نیاز حاصل رہا۔

ان کے استاد بھائیوں میں نہال سیوہاروی، رتن موہن خار زرتشتی دہلوی سرفہرست ہیں۔

شعری مقام

مرزا شہرت ایک گمنام لیکن سائل اسکول کے ممتاز و بلند پایہ شاعر تھے۔ آپ کی طبیعت ایسی ہمہ گیر تھی کہ جملہ اصناف سخن پر استادانہ کمال و عبور کے ساتھ طبع آزمائی فرماتے تھے۔ موصوف کے کلام میں غزلیات، رباعیات، مخمس حمد، نعت، منقبت غرض سبھی کچھ موجود ہے۔ مرزا شہرت مرحوم کے کلام میں شعرار قدیم کا رنگ جھلکتا ہے۔ شعرار دہلی کی طرح آپ کے کلام میں بھی سادگی، برجستگی، معنویت، درد اور تاثیر کی چاشنی بدرجہ اتم موجود ہے۔

عزیز وارثی صاحب لکھتے ہیں۔

"مرزا شہرت نے اردو شاعری کی روایات کو برقرار رکھا۔ ان کے کلام میں طرز فکر، انداز نظر بالکل دہلوی ہیں۔ ان کی تخلیقات میں حمد، نعت، منقبت، غزل اور رباعی سبھی کچھ موجود ہے۔

صوفیانہ رنگ

مرزا شہرت علمار اور صوفیار کی صحبت میں زیادہ رہتے تھے۔ اس لئے ان کے کلام میں صوفیانہ رنگ بھی بہت زیادہ پایا جاتا ہے۔ مرزا شہرت حضرت شاہ سلطان عالم صاحبؒ سے سلسلہ چشتیہ میں بیعت بھی تھے۔

مرزا مرحوم کو بزرگان دین سے گہرا تعلق تھا۔ آپ دلی کے دینی جلسوں میں بھی شامل ہوتے تھے اور اپنی پرکشش آواز اور موثر کلام سے سامعین کے دلوں کو موہ لیتے تھے۔

میرے پلے میں عصیاں کے سوا حسنِ عمل کیا ہے
بروز حشر رکھ لیجو الٰہی تو بھرم میرا

اسی طرح نعت شریف بھی بڑے والہانہ انداز میں کہتے ہیں۔

یادِ نبیؐ مٹے نہ میرے دل سے عمر بھر
دولت یہی ہے میرے دلِ ناصبور کی

مرزا شہرت اصلاً غزل کے شاعر تھے۔ آپ کی غزلوں میں عشقیہ مضامین زیادہ ہوتے ہیں۔ مثلاً آپ فرماتے ہیں۔

ہوش و خرد سے گم ہے دیوانہ زندگی کا
بس مختصر یہی ہے افسانہ زندگی کا

پینے کو پی رہا ہوں جام شراب الفت
خالی پڑا ہے لیکن پیمانہ زندگی کا

کیوں چاک ہو نہ جائے کیونکر نہ موت آئے
دستِ اجل میں ہے جب پروانہ زندگی کا

یہ اس کو چھوڑ دے گی وہ اس کو چھوڑ دیگی
نبھتا نہیں اجل سے یارانہ زندگی کا

چلمن تو وہ اٹھائیں صورت ذرا دکھائیں
کر دوں گا پیش فوراً نذرانہ زندگی کا

وعدہ کی رات آ کر صورت مجھے دکھا کر
دستِ اجل نے چھینا پروانہ زندگی کا

اب ہوگیا ہے شہرتؔ، سائلؔ کا نام لیوا
ہوگا نہ دور کیونکر شاہانہ زندگی کا

جرأت مندی

مرزا شریف اللہ بیگ شہرتؔ دہلوی ایک شریف، زندہ دل، جری بے باک اور حق گو انسان تھے۔ مگر آپ ہمیشہ مفلوک الحال رہے۔ اور آپ کی مفلوک الحالی ہی آپ کی شہرتؔ کے لئے سد راہ بنی رہی اور تذکرہ نگاروں کے تذکروں کی زینت نہ بن سکے۔

لہذا تذکرہ نگاروں سے مجھے اس شکایت کا حق ہے کہ وہ صرف ان شاعروں اور ادیبوں پر خامہ فرسائی فرماتے ہیں۔ جو دنیاوی وجاہت اور ظاہری ٹیپ ٹاپ کے مالک ہوں مگر مرزا شہرتؔ جیسے باکمال لیکن گمنام شاعروں اور ادیبوں پر چند سطور لکھنا بھی گوارا نہیں فرماتے۔ اور یہ باکمال شخصیتیں اپنے فن و کمال کے ساتھ گمنامیوں کے پردوں میں چھپ جاتی ہیں جو ان شخصیتوں کا نہیں بلکہ فن و کمال کا عظیم نقصان ہے۔

وفات

مرزا شریف اللہ بیگ شہرتؔ دہلوی نے ۲۳ مارچ ۱۹۸۰ء کو داعی اجل کو لبیک کہا اور قبرستان مہندیان میں سپرد خاک کر دیئے گئے۔

فرید احمد دہلوی

ولادت اور تعلیم

قاری فرید احمد دہلوی دلی کے قلندر مزاج اور درویش صفت انسان تھے وہ ۱۹۲۸ء میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد کا نام محمد عمر خان تھا۔

قاری فرید احمد صاحب نے ابتدائی تعلیم دلی کے مشہور و معروف مدرس حافظ فیروز صاحب مرحوم سے حاصل کی۔ اور مولانا زید ابوالحسن فاروقی صاحب سے بھی قرأت کی مشق کی۔

نعت خوانی

قاری فرید احمد صاحب دلی کے معروف صاحب دل نعت خواں اور نعت گو تھے۔ آپکی آواز میں بڑی دلکشی اور دلآویزی تھی۔ آپ بڑے سوزِ دل اور درد و کسک کیساتھ پڑھتے تھے۔ آپ خود بھی جھومتے تھے اور سامعین کو بھی جھوماتے تھے۔

مظہر گوالیاری لکھتے ہیں کہ:

"قاری فرید احمد دہلوی صاحب کو نعت پڑھتے دیکھ کر وجد کی جو کیفیت طاری ہوتی ہے اس کا بیان ممکن نہیں۔
نعت گوئی اور نعت خوانی بہت عظیم فن ہیں۔ نعت اگر دل کی گہرائی سے پڑھی جائے تو اس کی عظمت نہ صرف پڑھنے والے بلکہ سننے والے سے بھی ظاہر ہوتی ہے۔ قاری فرید ان نعت خوانوں میں سے ایک ہیں جنھیں یہ شرف حاصل ہے کہ وہ نعتِ مصطفےٰ کو دل کی گہرائی اور خلوص نیت سے پیش کرتے ہیں یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام کو سن کر جی چاہتا ہے کہ

مصروف ہیں لب مدحتِ شاہ دوسرا میں
اے کاش! یہیں وقت کی رفتار ٹھہر جائے

آل انڈیا ریڈیو سے وابستگی

قاری صاحب ایک بہترین خوش الحان قاری تھے۔ وہ ۲۷ سال تک آل انڈیا ریڈیو سے وابستہ رہے اور اپنی دلکش آواز سے لوگوں کو متاثر کرتے رہے۔
قاری صاحب نے غیر معمولی اسفار بھی کئے ہیں۔ عالمی محفل قرآت ملائیشیا میں آپ نے ہندوستان کی نمائندگی کی۔ اور انعامات حاصل کئے اور اسی طرح عالمی نعت کانفرنس پاکستان میں بھی شرکت کی اور اعزاز واکرام سے نوازے گئے۔

عادات و اطوار

قاری صاحب بڑے مرنجان مرنج، باغ و بہار قسم کے آدمی تھے۔ آپ

کا تعلق ہر مکتبۂ فکر کے لوگوں سے تھا۔ سحبان الہند مولانا احمد سعید دہلوی، مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمن سہواردی اور مولانا اخلاق حسین قاسمی صاحب اپنی دینی محفلوں میں بلاکر آپ کی حوصلہ افزائی کرتے رہتے تھے۔

وفات

قاری فرید احمد صاحب مداح رسول ۱۴۰۵ھ میں راہی ملک عدم ہو گئے۔ محترم مولانا غیاث الحسن صاحب مظاہری مدیر "دینی مدارس" نے آپ کی تاریخ وفات نکالی ہے۔

قاری بے مثال، و خوش الحان
کہ در آفاق مقبول زمان گشت
صدا افسوس و ملال و حسرت و غم
کہ از دار فنا سوئے جنان رفت
غیاث بے نوا تاریخ می گفت
قاری فرید احمد از جہاں رفت
۱۴۰۵ھ

اجمالی تذکرے

قبرستان مہندیان میں بہت سے ایسے مدفون حضرات ہیں جن کے تفصیلی حالات نہ معلوم ہونے کی وجہ سے صرف نام اور مختصر تذکرہ ہی پر اکتفار کیا گیا اور ان میں حسب ذیل حضرات شامل ہیں۔

شیخ عبدالغنی بیابانیؒ

شیخ عبدالغنی بیابانی رحمۃ اللہ علیہ، شیخ عبدالعزیز شکر بار کے اجلہ خلفاء میں تھے مکی مسجد میں مشغول عبادت رہتے تھے۔ ۹ رجمادی الآخر ۱۰۱۷ھ کو وصال ہوا۔ مہندیوں میں دفن ہوئے آپ کی قبر شیخ عبدالعزیز شکر بارؒ کی قبر سے قریب ہی تھی۔ جواب بے نشان ہو گئی ہے۔

شاہ رکن الدینؒ

شاہ رکن الدین رحمۃ اللہ، شیخ عبدالعزیز شکر بارؒ کے پوتوں میں سے تھے اور عالم باعمل ومحدث بے بدل تھے، اسی مکی مسجد اور خانقاہ میں درس حدیث وقرآن دیتے تھے۔ ۲۱ رمضان المبارک ۱۱۱۶ھ میں اللہ کو پیارے ہوئے۔

سید حسین علیؒ

سید حسین علی رحمۃ اللہ علیہ عالم باعمل اور سید محمد عظیم چشتی مرید وخلیفہ تھے جو مولانا فخرالدین دہلویؒ کے خلیفہ تھے

۱۹ ر ذی قعدہ ۱۲۴۳ھ کو اکبر شاہ ثانی کے عہد میں انتقال ہوا، خاندان ولی اللہی کے شرق وجنوب میں دفن ہوئے، ان کی قبر مٹ چکی ہے۔

اخوند برہانؒ

اخوند برہان رحمۃ اللہ علیہ، غلام قادر روہیلہ کے ہمراہ شاہ عالم ثانی کے عہد میں لوٹ مار، قتل غارت گیری کے لئے دہلی آئے تھے مگر امام المفسرین حضرت شاہ عبد القادر کی باطنی توجہ سے ان کی نیت بدل گئی اور خاندان نقشبندیہ مجددیہ میں آپ سے بیعت ہوگئے اور بڑے صاحب کرامت ہوئے، مہندیوں میں خاندان ولی اللہی کے قریب ہی دفن ہوئے۔ آپ کی قبر مٹ گئی ہے۔ سال وفات معلوم نہیں ہوا۔

مزارات اولیاء دہلی ص ۲۳

فخر النساء مرحومہ

فخر النساء مرحومہ، حضرت شاہ عبد الرحیم صاحب کی اہلیہ، شاہ ولی اللہ کی والدہ اور شیخ محمد پھلتیؒ کی صاحبزادی تھیں، تفسیر وحدیث اور فقہ میں مہارت تامہ رکھتی تھیں۔ شاہ عبد الرحیم صاحب کے بغل میں دفن ہیں۔

بی بی ارادت مرحومہ

بی بی ارادت مرحومہ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی اہلیہ اور شاہ عبد العزیز محدث دہلوی شاہ رفیع الدین، شاہ عبد القادر اور شاہ عبد الغنی کی والدہ محترمہ تھیں، بڑی نیک خاتون تھیں، آپ کی قبر فخر النساء مرحومہ کی قبر سے متصل ہے۔

شاہ مخصوص اللہؒ

حضرت شاہ مخصوص اللہ رحمۃ اللہ علیہ، مفسر کبیر حضرت شاہ رفیع الدین دہلویؒ کے فرزند ارجمند اور بڑے متبحر عبقری عالم دین تھے۔ انھوں نے پوری زندگی مدرسہ شاہ عبد العزیز کلاں محل میں علوم قرآن وحدیث کا درس دیا۔ ۱۸۵۶ء میں بعہد بہادر شاہ ثانی انتقال ہوا۔ چبوترہ ولی اللہی پر مع اہلیہ محترمہ محو استراحت ہیں۔ سر سید احمد خان مرحوم نے

"آثار الصنادید" میں ان کا جامع تعارف کرایا ہے۔

شاہ محمد موسیٰ رح شاہ محمد موسیٰ، حضرت شاہ رفیع الدین محدث دہلوی کے صاحبزادے اور بڑے صاحب علم و فضل انسان تھے۔ آپ بھی مدرسہ شاہ عبدالعزیز میں مدرس تھے، موصوف بھی ولی اللہی چبوترہ پر محو راحت ہیں۔ آپ کے حالات زندگی پردہ راز میں ہیں۔ سال وفات اور سال پیدائش معلوم نہیں ہوئے۔ آپ کے کتبہ پر بھی کوئی تاریخ درج نہیں ہے۔

شاہ محمد عمر رح شاہ محمد عمر مشہور مجاہد عالم دین مولانا محمد اسماعیل شہید کے صاحبزادے تھے۔ بڑے متواضع، منکسر المزاج اور قناعت پسند انسان تھے۔ علم و فضل کے اعتبار سے اپنے اسلاف کی یادگار تھے۔ آپ نے بھی مدرسہ عبدالعزیز میں قرآن و حدیث کا درس دیا تھا اور بعد میں مدرسہ شاہ عبدالعزیز کا انتظام سنبھال لیا تھا۔

شاہ محمد عمر چبوترہ ولی اللہی پر آسودۂ راحت ہیں۔ آپ کے بھی حالات زندگی پردۂ راز میں ہیں۔

مرزا مغل بیگ مرزا مغل بیگ اردو کے مشہور شاعر غالبؔ کی بہن کے دیور اور بڑے فاضل انسان تھے۔ آپ کی قبر مہندیوں میں تھی۔ مالک رام صاحب نے آپ کی قبر پر کتبہ دیکھا تھا۔ ۱۹۴۷ء میں اس قبر کو نقصان پہنچا دیا گیا اور اب مرزا کی قبر مٹ گئی ہے۔

عنایت الرحمن خان عنایت اللہ خان مرحوم برطانیہ دور حکومت میں ڈپٹی کمشنر تھے، ۲۲ ربیع الآخر ۱۳۱۷ھ میں فوت ہو گئے، واقعات دارالحکومت میں آپ کا تذکرہ موجود ہے۔ آپکی قبر مٹ چکی

حافظ سید محمدؒ امام جامع مسجد

حافظ سید محمدؒ امام جامع مسجد دہلی کی ولادت دہلی میں ہوئی، آپ صحیح النسب سید تھے۔ آپکے والد کا اسم گرامی میر احمد علی مرحوم تھا۔

حافظ صاحب زہد و ورع، عبادت و ریاضت، اخلاص و للہیت اور طہارت و نظافت میں فقید المثال تھے۔ ۲ ربیع الثانی ۱۳۱۷ھ میں بعمر ۷۳ سال اللہ کو پیارے ہو گئے۔ آپ کی قبر باب الولی کے قریب ہی داہنے ہاتھ کو دیوار سے متصل ہے۔

نواب مولوی احسان الرحمن خانؒ

نواب صاحب دلی کے مشہور شرفاء اور روساء میں تھے ۲۶ رجب ۱۳۱۳ھ کو انتقال ہوا۔ آپ مٹیا محل میں رہتے تھے۔ آپکی خوبصورت پختہ قبر مولانا محمد اکبر خانؒ کے قریب درخت کے نیچے ہے۔

نواب غلام محمد حسن خان

نواب صاحب بڑے وجیہہ اور ذی رائے آدمی تھے۔ آپ کے علم و فضل اور اعلیٰ قابلیت کی بناء پر انگریزوں نے خان بہادر کا خطاب دیا تھا۔ آپ کی قبر مہندیوں میں ایک درخت کے نیچے ہے۔ ۷ جمادی الثانی ۱۳۲۳ھ میں انتقال ہوا۔

مولانا حبیب الرحمن قریشیؒ

مولانا حبیب الرحمن دہلوی کا شمار دہلی کے مشاہیر علماء میں ہوتا ہے۔ آپ کے والد ماجد کا نام مولانا محمد حسین فقیرؔ دہلوی تھا۔ مولانا حبیب الرحمن قریشی کی قبر راقم الحروف کے کمرے کے قریب ہی نیچے ہے۔

احمد مرزا فوٹو گرافر

احمد مرزا فوٹو گرافر بڑے بہادر، جری مجاہد آزادی تھے۔ موصوف تحریک شیخ الہند کے فعال و متحرک کارکن تھے۔ ریشمی رومال تحریک کے سلسلے میں خفیہ کاغذات کی فوٹو کاپیاں

آپ ہی کی دوکان میں ہوتی تھیں۔ آپ کی دوکان لال قلعہ کے اندر تھی۔
احمد مرزا حضرت شیخ الہند اور حضرت مفتی اعظم محمد کفایت اللہ صاحبؒ کے بڑے معتقد و جان نثار تھے۔ احمد مرزا ۱۲ اپریل ۱۹۴۶ء میں جاں بحق ہو گئے۔ مرزا مرحوم کا مفصل ذکر مولانا مدنیؒ نے "نقش حیات" میں کیا ہے۔ ۱۹۴۷ء میں آپ کا خاندان پاکستان چلا گیا۔

علیم اللہ خان
علیم اللہ خان، نواب عزیز اللہ خان مرحوم کے صاحبزادے اور مولوی سمیع اللہ خان کے بھائی تھے۔ علیم اللہ خان مرحوم بڑے تعلیم یافتہ آدمی تھے۔ آپ کی قبر مہندیان میں تھی جو مٹ چکی ہے۔

نبیہ خاتون مرحومہ
مرحوم مفتی اعظم مولانا محمد کفایت اللہ دہلوی کی اہلیہ تھیں۔ نہایت ہی نیک سیرت اور قناعت پسند خاتون تھیں۔ ۱۹۷۵ء میں انتقال ہوا۔ آپ کی قبر مکی مسجد میں ہے۔ قبر پر کتبہ موجود ہے۔

حاجی احسان الٰہی
حاجی احسان الٰہی مرحوم کے والد کا نام حاجی کریم الٰہی تھا۔ احسان الٰہی صاحب دلی کے سربرآوردہ لوگوں میں تھے۔ آپ جمعیۃ علماء کے خزانچی بھی رہے ہیں۔ مولانا حسین احمد مدنیؒ، مولانا احمد سعید دہلویؒ، مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰن اور مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم سے آپ کا بڑا گہرا تعلق تھا۔ آپ باب الولی کے دائیں جانب مدفون ہیں۔ آپ کی قبر کے ارد گرد بہت ساری قبریں ہیں۔

سعیدہ امداد علی
سعیدہ امداد علی، سر محمد سعد اللہ مرحوم سابق وزیر اعلیٰ آسام کی صاحبزادی تھیں۔ دہلی میں فوت ہو گئیں۔ مہندیوں میں دفن ہوئیں۔ آپ کی قبر مولانا امداد صابری مرحوم کے قریب ہی ہے۔

حاجی نور محمد ننوا تیلی حاجی نور محمد مشہور بہ ننوا تیلی بڑے مخیر اور علماء نواز بزرگ تھے۔ حضرت مفتی محمد کفایت اللہ صاحب مولانا حفظ الرحمٰن صاحب اور سحبان الہند مولانا احمد سعید دہلوی سے آپ کا گہرا تعلق تھا۔ آپ کی قبر مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کے بغل میں ہے بڑی اچھی جگہ ملی ہے۔

بیگم فرخندہ بانو مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰن کی رفیقہ حیات تھیں۔ مجاہد ملت کے قومی اور ملی خدمات کی ہم سفر تھیں۔ مجاہد ملت نے پوری زندگی سفر یا جیلوں میں گزاری یا مسلمانوں کی خدمات کے لئے جمیعۃ علماء ہند کے دفتر میں دن رات گزارتے تھے۔ ہمہ وقت ملت اسلامیہ کے کاموں میں مصروف رہتے تھے۔ اس وقت وہ تن تنہا اپنے عظیم شوہر مجاہد ملت کے گھر کی رکھوالی کرتی تھیں۔ اور خاندان کے اعزا و اقارب اور مہمانوں کی تواضع کی واحد ذمہ دار تھیں۔ گھریلو زندگی کے ہر کام سے مجاہد ملت کو بے پرواہ کر رکھا تھا۔

محمد ادریس بیگ محمد ادریس بیگ دلی کے مشہور واعظ اور مقرر تھے۔ آپ نے کچھ دنوں مدرسہ حسینیہ گوکل شاہ مٹیا محل میں بھی وعظ فرمایا۔ موصوف ۱۹۸۶ء میں اپنے مالک حقیقی سے جا ملے۔ آپ کی قبر نواب احسان الرحمٰن خان کے قریب ہے۔ قبر پر کتبہ موجود ہے۔

آپ کے صاحبزادے مرزا مسعود بیگ متوفی ۱۹۸۶ء بھی مہندیان میں مدفون ہیں۔ مرزا مسعود بیگ مرحوم شیر میوات صاحب کے بڑے شیدائی اور فدائی تھے، اسی وجہ سے شیر میوات صاحب نے مرزا [illegible] حوم کو اپنے سرہانے کے قریب ہی دفن کیا تاکہ مرنے کے بعد بھی رفاقت قائم [illegible] ہے۔

محمد اسماعیل غوری محمد اسماعیل [illegible] ی دہلی میں پیدا ہوئے، آپ کے والد کا نام عبدالرحمٰن مرحوم تھا۔ غوری صاحب سحبان الہند مولانا احمد سعید کے دوستوں میں تھے۔ بڑے باغ و بہار اور مجلسی آدمی تھے۔ انھوں نے

۱۹۴۷ء کے حوادث میں بڑا کام کیا۔ غوری صاحب ہی جیسے جان نثار اور بہادر مجاہدین آزادی مولانا احمد سعید کے یال دپر تھے۔ موصوف ۳ ۱۹۷ء میں جان بحق ہو گئے۔ مہندیون میں مدفون ہیں۔

ڈاکٹر احمد حسن عثمانی

ڈاکٹر احمد حسن عثمانی یکم اپریل ۱۹۰۸ء میں پیدا ہوئے۔ آپکے والد ماجد کا نام مخدوم مبارک علی الہی حسن عثمانیؒ تھا۔ ڈاکٹر صاحب پانی پت کے رہنے والے تھے اور فراشخانہ دہلی میں اپنا مطب کرتے تھے۔

ڈاکٹر صاحب دلی کے مشہور ملی کارکن تھے۔ انھوں نے ۱۹۴۷ء کے خوفناک حالات میں مسلمانوں کی بڑی مدد کی۔ مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰنؒ کے ساتھ شب و روز بھاگ دوڑ کرنے والوں میں تھے۔ ۳۰ را اپریل ۱۹۷۱ء انتقال فرما گئے۔

مولانا منشی محمد یعقوب صاحب خطاط

مولانا یعقوب صاحب سہارنپوری، ہندوستان کے مشہور خطاط اور مظاہر علوم کے فارغ التحصیل عالم بھی تھے، بڑے نیک طبع انسان تھے۔ آپ کے تلامذہ میں مشہور خطاط عاصم امروہی ہیں موصوف بھی صاحب فراش ہو گئے ہیں۔ منشی محمد یعقوب صاحب مکی مسجد میں مدفون ہیں، آپ کی قبر پر کتبہ نہیں ہے۔

بنّے میاں پیر جی

پیر جی مشہور صوفی اور صاحب حال بزرگ تھے۔ آج بھی دلی اور رام پور میں آپ کے مریدین و خلفاء کی اچھی خاصی تعداد موجود ہے۔ آپ مہندیان میں مدفون ہیں۔

حافظ محمد امیر گوہر دہلوی

حافظ محمد امیر گوہر محلہ چوڑیوالان میں پیدا ہوئے آپ کے والد کا نام محمد زکریا صاحب قریشی ہے جو دلی کے مشہور آدمی ہیں۔ اور الحمدللہ بقید حیات ہیں۔ امیر گوہر دہلویؒ ایک بہترین حافظ قرآن تھے، موصوف شاعرانہ مزاج رکھتے تھے۔

ذوق رکھتے تھے۔ فنون لطیفہ سے بھی آپ کا گہرا تعلق تھا۔ ایک مؤقر جریدہ کے مدیر بھی تھے۔ موصوف ۱۹۸۰ء میں نہایت ہی کم عمری میں انتقال فرما گئے۔ مولانا محمد یوسف فقیر دہلوی صاحب نے تاریخ وفات کہی ہے ؎

فقیر دہلوی تاریخ گفت نادر گفت
امیر گوہر زما بخلد رسید

عبدالمجید تیل والے

عبدالمجید تیل والے مجاہد آزادی اور مولانا احمد سعید دہلوی کے نورتن میں تھے۔ بڑے زندہ دل اور ہنس مکھ انسان تھے۔ سحبان الہند مولانا احمد سعید دہلوی کی وفات کے بعد محترم مولانا اخلاق حسین قاسمی صاحب کی مجلس میں بیٹھتے تھے۔ اور مجلس میں بیٹھنے والوں کی خاطر تواضع کرتے تھے۔

خدا مغفرت فرمائے عجیب ملنسار بزرگ تھے۔ مہندیوں میں مدفون ہیں۔

حاجی محمد یونس راغب دہلوی

راغب دہلوی صاحب کے والد مولانا عبدالعزیز دعاجو جلیل القدر عالم دین اور واعظ بے بدل تھے۔ راغب صاحب دلی کی تہذیب و ثقافت کی حسین تصویر اور نمائندہ تھے۔ آپ کی دوکان کوچہ استاذ داغ چاندنی چوک پر ہمہ وقت علما، شعرا، اور فنکاروں کا مجمع لگا رہتا تھا۔ راغب صاحب ۲۶ رنومبر ۱۹۸۷ء کو انتقال فرما گئے۔ مہندیان میں دفن ہوئے۔ آپ کے لوح تربت پر یہ شعر ہے ؎

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے
سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

عبدالمجید اظہر

اظہر صاحب ۱۹۰۹ء میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد کا نام عبدالکریم تھا۔ اظہر مرحوم دلی کے گمنام شاعر اور

غریب قسم کے انسان تھے۔ بڑے اچھے اشعار کہتے تھے۔ لیکن ان کی غربت ہی ان کی گمنامی کا باعث ہوئی۔ نمونہ کلام

پوشیدہ فنا میں نظر آتی ہے بقا دیکھ
اے ذوق نمو خاک میں ہستی کو ملا دیکھ
دنیا تیرے قدموں میں نظر آئے گی اظہر
اس گلشنِ عالم سے ذرا ہاتھ اٹھا دیکھ

مولانا محمد ازہر لدھیانوی

مولانا محمد ازہر لدھیانوی ۱۹۲۶ء میں دلی میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد کا نام حبیب الرحمن لدھیانوی تھا۔ مولانا محمد ازہر ۱۹۷۹ء میں دلی میں وفات پا گئے اور آپ مکی مسجد میں آرام فرما ہیں۔

حاجی نبی احمد

حاجی نبی احمد مرحوم ۱۲ر اکتوبر ۱۹۲۰ء میں پیدا ہوئے آپ کا شمار دہلی کے بڑے تاجروں میں ہوتا تھا۔ بہت ہی صاحب خیر تھے۔ دینی مدارس کے معاون تھے۔ مدرسہ امینیہ اور جامعہ رحیمیہ کی مجلس شوریٰ کے رکن تھے۔ ۱۱ر دسمبر ۱۹۸۶ء کو انتقال فرما گئے۔

افتخار احمد صاحب ایم۔ اے۔

افتخار احمد صاحب ایم۔ اے۔ سنہ میں چوڑیوالان میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد کا نام اشفاق احمد مرحوم تھا۔ بڑے ذی علم آدمی تھے۔ نہایت ہی کم عمری میں ۳۰ر جون ۱۹۸۱ء میں وفات پا گئے۔ تاریخ وفات سے

تربت پہ افتخار کی ہاتف نے دی صدا
تا روزِ حشر قبر رہے مغفرت رسا

۱۹۸۱ء

عقیل ناروی عقیل صاحب ناروی دلی کے مشہور نوجوان سماجی رکن تھے۔ ادبی مجلسوں اور مشاعروں سے بڑی دلچسپی رکھتے تھے۔ موصوف بڑے خلیق، ملنسار اور شگفتہ مزاج انسان تھے۔

کنیز فاطمہ مرحوم حضرت مفتی عتیق الرحمن عثمانی کی اہلیہ محترمہ تھیں۔ ۲۷ر مارچ ۱۹۸۵ء میں انتقال ہوا۔ مہندیون میں مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمن کی اہلیہ محترمہ کے بغل میں مدفون ہیں۔

شاہ سید علی اختر مرحوم رسول نمائی شاہ سید علی اختر مرحوم ۱۰ر فروری ۱۹۲۹ء میں پیدا ہوئے۔ شاہ صاحب درگاہ حضرت سید حسن رسول نمائی کے سجادہ نشین اور متولی تھے۔ تصوف کے آدمی تھے۔ ۵ر ستمبر ۱۹۸۷ء کو انتقال ہوا، مہندیوں میں مدفون ہیں۔ آپ کے لوحِ مزار پر یہ شعر درج ہے۔ ؎

ہمارے بعد اندھیرا رہے گا محفل میں
بہت چراغ جلاؤ گے روشنی کے لئے

(مخمور دہلوی)

پیر جی محمد احمد صدیقی پیر جی محمد احمد صدیقی، دہلی میونسپل کارپوریشن کے ممبر اکرم قادری کے والد ماجد تھے۔ بڑے خلیق اور متواضع ملنسار آدمی تھے۔ مہندیوں میں آرام فرما ہیں۔

ڈاکٹر عباس ملک ڈاکٹر عباس ملک دلی کے مشہور سیاسی اور مسلم لیڈر اور میونسپل کمیٹی کے کونسلر تھے۔ بڑے جری اور بہادر انسان تھے، دلی کے مسلمانوں کے مسائل سے خصوصی دلچسپی لیتے تھے۔ شیر میوات صاحب کے مکان کے سامنے دفن ہیں۔

خورشیدہ سلطان

دلی مشہور قاری محمد ادریس صاحب امام جامع مسجد نئی دہلی کی رفیقہ حیات تھیں، بڑی غریب پرور خاتون تھیں ۱۹۶۰ء میں وفات پاگئیں، احاطہ شاہ ولی اللہؒ میں دفن ہیں۔

حاجی عبدالسلام مرحوم

آپ علاقہ چوڑیوالان میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد کا نام حاجی علی جان تھا۔

حاجی عبدالسلام مرحوم دلی جامع مسجد کے مشہور سماجی کارکن تھے موصوف یکم جولائی ۱۹۸۲ء کو مختصر علالت کے بعد داعی اجل کو لبیک کہا۔ مہندیوں کی مسجد کے صحن سے متصل مدفون ہیں۔

محمد ادریس صاحب

محمد ادریس صاحب مخلص آدمی اور شیر میوات صاحب کے بہنوئی اور کچہری میں سینئر ریڈر تھے، ایک لائق اور قابل آدمی تھے۔ مہندیان میں مدفون ہیں۔

مولی بخش مرحوم

مولی بخش مرحوم، علاقہ جامع مسجد کے مشہور قومی و ملی کارکن، حاجی محمد رفیع صاحب کے والد تھے وہ ۱۹۶۰ء میں اپنے مولی حقیقی سے جا ملے۔ مہندیوں میں آپ مع اہلیہ محترمہ محو راحت ہیں۔

حافظ محمد عثمان

حافظ محمد عثمان محلہ چوڑیوالان کے رہنے والے تھے۔ حافظ صاحب مشہور تاجر ــــــ اور مدرسہ تعلیم القرآن چوڑیوالان کے بانی تھے۔ اس مدرسہ سے مشہور مجاہد آزادی مولانا لقاء اللہ عثمانی پانی پتی کا گہرا تعلق تھا۔ مولانا عثمانی دہلی آتے تو یہیں قیام فرماتے تھے۔ حافظ صاحب ملی کاموں میں بہت دلچسپی لیتے تھے۔ مہندیوں میں آرام فرما ہیں۔

مولانا افضل حسین رح

مولانا افضل حسین صاحب جماعت اسلامی ہند کے قیّم اور آل انڈیا مسلم مجلس مشاورت کے ممبر تھے۔ قیم صاحب اپنے عہد کے مشہور ماہر تعلیم تھے۔ آپ نے مسلم بچوں و بچیوں کے لئے بڑی مفید کتابیں لکھی ہیں۔
قیم صاحب ایک مخلص اور ہمدرد انسان تھے۔ آپ کا انتقال یکم جنوری ۱۹۹۰ء کو جے پرکاش نرائن ہسپتال میں ہوا۔ اور قبرستانِ مہندیوں میں مدفون ہوئے۔ آپ کی قبر جامعہ رحیمیہ کے مہمان خانہ کی دیوار سے متصل ہے۔

مولانا سید محمد رحیم شاہ رح

مولانا سید محمد رحیم شاہ صاحب مرحوم مدرسہ دعائیہ صدر بازار دہلی کے بانی اور شیخ الحدیث تھے۔ بڑے متوکل اور قناعت پسند بزرگ تھے۔ تقویٰ وطہارت میں بھی بے نظیر تھے۔ آپ شیخ طریقت اور روحانی پیشوا بھی تھے۔ آپ ۸ نومبر ۱۹۹۱ء کو بعمر ۱۱۶ سال اللہ کو پیارے ہو گئے اور شاہ عبدالرحیم محدث دہلویؒ کے جوار میں مدفون ہوئے۔
اللہ تعالیٰ آپ کی یادگار مدرسہ دعائیہ کو عروج و ترقی سے سرفراز فرمائے۔

حکیم مصباح الدین جامعی رح

حکیم مصباح الدین جامعی مالک ربانی بکڈپو لال کنواں مردان صوبہ سرحد پاکستان کے رہنے والے تھے۔ دار العلوم دیوبند کے فارغ التحصیل اور ایک اچھے حافظ و قاری تھے۔ موصوف کو طب سے بھی اچھی خاصی مناسبت تھی۔ آپ نے کچھ دنوں تک مطب بھی کیا تھا، پھر بعد میں اپنا ایک اشاعتی ادارہ

قائم کر لیا تھا، جس سے بڑی علمی و تحقیقی کتابیں شائع کیں ہیں۔

آپ کا سب سے اہم کارنامہ حضرت مفتی محمد شفیع دیوبندی ثم پاکستانی کی تفسیر معارف القرآن کے آٹھ ضخیم حصّوں کا شائع کرنا ہے۔ ربانی بکڈپو حکیم صاحب مرحوم کی اصل یادگار ہے۔ اللہ تعالیٰ اس ادارہ کو ہمیشہ قائم رکھے! آپ کے صاحبزادگان بھی اپنے والد مرحوم کے چھوڑے ہوئے اشاعتی کاموں کو مکمل کرنے میں مصروف ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان صاحبزادگان کو حوصلہ و ہمّت عطا فرمائے۔

حکیم صاحب ۳ر اکتوبر ۱۹۹۱ء کو انتقال فرما گئے اور قبرستانِ مہندیون میں مدفون ہوئے۔

مولانا غیاث الحسن صاحب مظاہری نے قطعۂ تاریخ کہا ہے۔

مولوی قاری حکیم مصباح الدین	آخرش ہم سب سے رخصت ہو گئے
ہو گئے کتنے ہی دل اندوہ گیں	کتنی ہی آنکھیں ہوئی ہیں اشکبار
ہو گئے فردوس میں گوشہ نشیں	وہ جو دنیا میں تھے "اہل انجمن"
۱۲ ۱۴ ۱۲ھ ۱۲۳۲	۱۸۰

حکیم شرف الدین بقائی رح

حکیم شرف الدین بقائی صاحب مرحوم دلّی کے مشہور طبیب و حکیم اور کئی دینی تعلیم گاہوں کے ممبر تھے، آپ مولانا حفظ الرحمن سیوہاروی اور مفتی عتیق الرحمن عثمانی رح سے بہت قریب رہے۔ مولانا اخلاق حسین قاسمی صاحب سے بھی خصوصی تعلق تھا۔

الواحِ الصّنادیدؒ

حصّہ اوّل

حضرت امام شاہ ولی اللہ اور اُن کے جواہر میں فوں ممتاز ہستیوں کی

تابناک زندگی، تاریخ ساز کارنامے اور الواحِ تربت

عطاء الرحمٰن قاسمی
(استاذ فقہ و حدیث جامعہ رحیمیہ نئی دہلی)

مولانا آزاد اکیڈمی